(1) ~~Religion - Islam~~

(2) ~~Islamic literature~~

1. Islam.
2. Biography - Prophet Muhammad (S.A.W.

١٩٤٧
١٣٤٩
٨١

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کتابِ مستطاب

سیرۃ النبی ﷺ

یعنی

سوانح اقدس حضرت سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ششم

مشتمل تعلیمات اخلاق

اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی، اور اسلامی فلسفہ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل، اور اسلامی آداب کو تفصیل کیساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے،

تالیف

سید سلیمان ندوی

باہتمام مسعود علی ندوی

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

طبع سوم

۱۳۷۲ھ
۱۹۵۳ء

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ

نبی الرحمۃ وعلی آلہ واصحابہ اولی العزم والھمۃ

اے تو، بہ بہین صفت سزاوار — نام تو گرہ کشائے ہر کار

اے کردہ ز گنج خانہ راز — بر آدمیان در سخن باز

عالم ز تو شد بحکمت آباد — حکمت ز تو یافت آدمی زاد

در قربت حضرت مقدس — پیغمبر پاک رہبرم بس

گنجینۂ کیمیائے عالم — پیش از ہمہ پیشوائے عالم

نامش بسریر پادشاہی — توقیع سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے، یہ اُن اخلاقی تعلیمات

کی تفصیل اور تشریح ہین ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانون کو بتائی اور سکھائی گئین، یہ عجیب بات ہو کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت مین اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہو، عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہین، اسی لئے عوام کے اس وہم کو دور، اور قومون کی ترقی وتہذیب مین اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ان اوراق مین اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہو کہ ملت کی تعمیر کا اہم جز اخلاق کی صحیح تربیت ہو،

کتاب مین اس نکتہ کی طرف کہ اخلاقِ حسنہ اسماے حسنیٰ کا پرتو ہین، بار بار اشارہ کیا گیا ہو، لیکن یہ بات ذہن مین رہو کہ کوئی مخلوق خالقِ تعالیٰ کی کسی صفت مین برابر کی شریک نہین ہوسکتی ایسا سمجھنا سراسر شرک ہو، بات اتنی ہو کہ بندہ کے جس وصف کو خداے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے، اُس پر اُس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہین جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہین ہو جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہو، مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہدیتے ہین حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا مین ہے، بندہ مین نہین لیکن چونکہ خداے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ مین ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہو اسلئے بندہ کی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہدیتے ہین[1] ورنہ درحقیقت ان دونون مین کوئی نسبت ہی نہین یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسری صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہو، اسی لئے بہت سے اہلِ حق اور اہلِ تحقیق کے نزدیک ان دونون مین اوصاف کے اشتراک

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارفِ لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۲۷، مطبوعہ مدینہ بجنور،

اشتراک یا ادنیٰ مناسبت ہی اور بس! لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (شوریٰ - ۲)

کتاب مین چند موقعون پر مختلف مذہبون سے اسلام کا موازنہ کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السّلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے، اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہین، جو آج اُن کی طرف منسوب صحیفون مین پائی جاتی ہین، یا اُن کے موجودہ پیروان کی طرف منسوب کرتے ہین، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے اور نبوت کے جس دور مین جو ربانی تعلیم آئی وہ اُس کے لئے بالکل مناسب تھی یہانتک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اُس کی ہمیشہ کے لئے تکمیل فرمادی گئی،

کتاب مین کہین کہین فقہی مسئلے آگئے ہین، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے، اس لئے فقہی جزئیات اور تفصیلات مین الجھا نہین گیا ہے، ایسے موقع پر اگر شک و شبہہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابون مین دیکھ لیا جائے،

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے، جس مین اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی کچھ خصوصیتین گنائی گئی ہین، پھر حقوق، فضائل، رذائل، اور آداب کے مختلف عنوانون سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے،

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبد السّلام صاحب ندوی نے لکھے ہین جن کو مین نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے، موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گذار ہون، آیات و احادیث سے احکام کے استنباط، اور مصالح و حِکم کی تشریح مین اپنے ذوق و فکر

کی رہبری سے چارہ نہ تھا، سہو و خطا انسان کی فطرت ہی، پھر کیونکر دعوی کرون کہ اس سے میرا نکر و ذوق آزاد رہا ہے،

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب مین نہین دیکھا تھا، اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو مین نے اُن کو خواب مین دیکھا کہ اُن کے سامنے اس کے بعض اجزا پڑے ہین، اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہین، اور مسکرا رہے ہین، رحمہ اللہ تعالی،

دعا ہے کہ اللہ تعالی ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت مین اس آئینۂ محمدیؐ کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے، اور وہ سمجھین کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی مین اخلاق و عادات کی درستی ہے،

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

۴ ذیحجہ ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے اپنے ایک حقیر بندہ کی خدمت کو عام مسلمانون مین اور مخصوص اہلِ علم کی نگاہون مین مقبولیت کی نعمت عطا فرمائی، وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (ابراھیم - ۵) خدا کی نعمتون کا شمار کون کرسکتا ہی،

قدردانون کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی جلد جلد شائع ہو، مگر کتاب کی ضخامت اور کاغذ کی گرانی کے سبب سے اس مین رکاوٹون پر رکاوٹین پیش آتی رہین، او آخر کئی برسون کے بعد وہ دن آیا کہ پوری کتاب دوبارہ چھپ کر ختم ہوئی، اور اب وہ آپکے سامنے ہی،

اب ساتوین جلد (معاملات) کا معاملہ درپیش ہی، بقدر توفیق اُس کے کچھ صفحات لکھے بھی گئے ہین، مگر ابھی کام بہت باقی ہی احباب سے اس کے حسنِ انجام کی دعا کا خواستگار ہون،

والسلام

۲۹ شوال سنہ ۱۳۴۰ھ

ہیچمدان

سلیمان

۱۹ - نومبر سنہ ۱۹۲۱ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب ۳

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے، اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز و رشتہ دار، دوست و احباب، سب سے تعلقات ہیں، بلکہ

ہراُس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت، یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اُس کے تعلقات ہین، اور اُن تعلقات کے سبب سے اُس پر کچھ فرائض عائد ہین،

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی، اور امن وامان اسی اخلاق کی دولت سے ہی، اسی دولت کی کمی کو حکومت وجماعت اپنے طاقت وقوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتین اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دین، تو حکومتون کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لئے بہترین مذہب وہ ہی جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والون پر اتنا ہو کہ وہ اُن کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے، دنیا کے سارے مذہبون نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے، آئندہ ابواب مین اسلام کی ان ہی کوششون کا جائزہ لینا ہی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب مین جو کچھ کہا ہی اور کیا ہی اُس کو تفصیل سے بتانا ہی،

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس مین شک نہین کہ دنیا کے سارے مذہبون کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے، چنانچہ اس عرصۂ ہستی مین جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا برا ہے، انصاف بھلائی، اور ظلم برائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب مین بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آپ نے ارشاد فرمایا

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حسنَ الاخلاق	مین حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا
(موطا مالک حسن اخلاق)	گیا ہون،

یہ امام مالکؒ کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد بیہقی اور ابن سعدؒ وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہین، آپ نے فرمایا:-

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارم	مین تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ

لہ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ ص ۹۲ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ،

الاخلاق،   کی تکمیل کرون،

چنانچہ آپ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا، ابھی آپ مکہ ہی مین تھے، کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات و تعلیمات کی تحقیق کے لئے مکہ بھیجا، انھون نے واپس آکر اُس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ مین اطلاع دی، وہ یہ تھے،

رأیتہ یامُر بمکارم الاخلاق،[1]   مین نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگون کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے،

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ مین نجاشی نے جب مسلمانون کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی، اُس کے چند فقرے یہ ہین:-

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتون کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریان کرتے تھے، ہمسایون کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستون کو کھا جاتے تھے، اس اثنا مین ایک شخص ہم مین پیدا ہوا ....

.... اُس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھرون کو پوجنا چھوڑ دین، سچ بولین، خونریزی سے باز آئین، یتیمون کا مال نہ کھائین، ہمسایون کو آرام دین، عفیف عورتون پر بدنامی کا داغ نہ لگائین"[2]

---

[1] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۲۲۹ مصر و ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد ج ۲ ص ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعۂ ہجرت،

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ "وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں، اور قرابت کا حق ادا کریں"[1]،

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، (جمعہ - ۱)	یہ پیغمبر ان ان پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا، اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے،

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں، ایک پاک و صاف کرنا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت،

۱۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے، سورہ والشمس میں ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ	قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا، پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی

[1] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد ۱۳۰

مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (شمس)

الہام کردی، بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ نامراد ہوا

دوسری جگہ ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى، (اعلیٰ)

بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا، اور اپنے رب کا نام لیا، اور نماز پڑھی،

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے،

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔ (عبس)

پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا، اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا،

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآنِ پاک میں اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت ورسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں، اور ان کے اخلاق واعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں، چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دعوت

اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے،

۲۔ **حکمت**۔ اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ مین کی جا چکی ہے، مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک مین جہان اُس علم و عرفان کے معنی مین ہے، جو نورِ الٰہی کی صورت مین نبی کے سینہ مین ودیعت رکھا جاتا ہے، اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت مین ظاہر ہوتے ہین، وہین، اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے اُن علمی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن مین بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے، قرآن مین دو موقعون پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت مین کون کون باتین داخل ہین، سورۂ بنی اسرائیل مین توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابت دارون اور محتاجون کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کشی، بدکاری، کسی بے گناہ کی جان لینے، اور یتیمون کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے، اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے، اس کے بعد ارشاد ہے،

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط (ع ۴)	یہ حکمت کی اُن باتون مین ہو جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا،

سورۂ لقمان مین ہے کہ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ، (ع ۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتین سکھائین کہ خدا کا شکر ادا کر،

اس کے بعد حکمت کی ان باتون کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگون کو بھلی بات کرنے کو کہہ، اور بری بات سے باز رکھ مصیبتون مین استواری، اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز مین باتین کر، ان آیتون سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح مین ان فطری امور خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قومون اور مذہبون مین مسلّم ہے، اور جن کو دوسرے معنی مین اخلاق کہہ سکتے ہین "حکمت" کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مین اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو حکمت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحیِ محمدی کتاب اور حکمت دونون پر برابر مشتمل ہے، یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مین عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ مین نہین، خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا،

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ	اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ کرو،
اسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ	اپنے رب کو پوجو، اور نیکی کرو، تاکہ تم
افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الحج۔۱۰)	فلاح پاؤ،

گویا ایمان کی روح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہین، ایک عبادت، اور دوسرا اخلاق، ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا، اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

حقوقِ عباد کی اہمیت

ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمِ محمدیؐ نے اخلاق

کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے، اخلاق حقوق عباد یعنی باہم انسانون کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے، اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہین، اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہے، اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہین ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیئت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے، مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانون کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ مین نہین، بلکہ اُن بندون کے ہاتھون مین رکھی ہے، جن کے حق مین وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو، اور ظاہر ہے کہ اُن سے اس رحم و کرم کی توقع نہین ہو سکتی، جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو، تو اُس (ظالم بھائی) کو چاہئے کہ اسی دنیا مین وہ اُس (مظلوم بھائی) سے اُس کو معاف کرالے، ورنہ وہان تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہون گے، ظالم کی نیکیان مظلوم کو مل جائین گی، اور نیکیان نہ ہون گی، تو مظلوم کی بدیان، ظالم کے نامۂ اعمال مین لکھ جائین گی[1] ایک اور حدیث مین ہے کہ قیامت مین نامۂ اعمال کی تین فردین ہون گی ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا، دوسری وہ جس مین سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑیگا، اور تیسری وہ جس مین سے کچھ نہ معاف فرمائیگا جس فرد کے گناہ معاف نہ ہونگے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی، تو وہ ظلم ہے، جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے، اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے، جیسے اوس نے روزہ نہ رکھا ہو، یا نماز نہ پڑھی ہو، تو اللہ تعالیٰ

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷،

جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا، اور بخش دے گا، لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہین سکتا، وہ ظلم ہے، جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے (مسند احمد و حاکم عن عائشہؓ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی مین جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟ چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اُس وقت تک بندہ پر عائد نہین کی ہے، جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرے،[1] اور زکوٰۃ بندہ کے اُسی مال مین فرض کی ہے، جو اُس کے اور اُس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اُس وقت تک بندہ پر واجب نہین کیا، جب تک وہ بندون کے حقوق سے عہدہ برآنہ ہولیا،

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق

بعض اُن حدیثون کی بنا پر جن مین اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونون پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت مین اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہین دی گئی ہے، اور بے سمجھ واعظون کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی مین اور اضافہ ہوگیا ہے، حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع مین ہم یہ بتا چکے ہین، کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے، قرآنِ پاک مین یہ نکتہ ہر جگہ نمایان طور سے واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اُس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتون سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی

[1] یہ اصولِ فقہ کا مسئلہ ہی، دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳، مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم،

اور غمخواری کا سبق ہے، اور حج بھی مختلف طریقون سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ، اور اپنی اور دوسرون کی امداد کا وسیلہ ہی؛

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہی کہ اسلام کے ان چارون ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہون، مگر ان کے بنیادی مقاصد مین اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے، اگر ان عبادات سے یہ روحانی، اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل، اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہین، وہ درخت ہین جن مین پھل نہین، وہ پھول ہین جن مین خوشبو نہین، وہ قالب ہین جن مین روح نہین، قرآن پاک اور تعلیم نبوی کے جو اشارات اس باب مین ہین، حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات مین اُن کی پوری تشریح کر دی ہی،

امام غزالی احیاء العلوم مین لکھتے ہین:

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو، اور فرمایا کہ بھولنے والون مین نہ ہو، اور فرمایا کہ نشہ کی حالت مین اس وقت تک نماز نہ پڑھو، جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہین، جنھون نے گو شراب نہین پی، مگر جب وہ نماز پڑھتے ہین، تو نہین جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہین، آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے، جس مین کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے، تو خدا اُس کے گناہ کو معاف کر دے گا، پھر فرمایا کہ "نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی، اور شرمندگی کا نام ہے، اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ" جس نے یہ بات نہین پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے، اور اگلی کتابون مین ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین ہر ایک کی نماز قبول نہین کرتا، مین اس کی نماز قبول

کرتا ہون، جو میری بڑائی کے سامنے سرنگون ہے، میرے بندون پر اپنی بڑائی نہین جتاتا، اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز اسی لئے فرض کیگئی اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے، تاکہ خدا کی یاد کی جائے"، تو اگر دل مین یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے، تو اس یاد الٰہی کی قدر وقیمت کیا ہے؟ حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس کی نماز اس کو بُرائی اور بدی سے نہ روکے، تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے"

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثون نے اپنی کتابون مین بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) مین ان تمام روایتون کو یکجا کر دیا ہے، اس حدیث کی دوسری روایت مین الفاظ یہ ہین کہ جس کو اس کی نماز بُرائی، اور بدی سے باز نہ رکھے، اس کی نماز ہی نہین" اسی قسم کے الفاظ روزون کے متعلق آپ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے، تو خدا کو اس کی ضرورت نہین کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"، ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہی،

اخلاق حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہین، اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے، اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی

لہ جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ۲ے تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت آیت مذکورہ ۳ے صحیح بخاری و دجامع ترمذی وابوداؤد وابن ماجہ کتاب الصوم،

اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے، جن پر اُن کی کامیابی کا مدار ہے، فرمایا،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ	بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ	جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	ہیں، اور جو لغو بات پر دھیان نہیں
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ	کرتے، اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں، اور
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
حٰفِظُوْنَ	کرتے ہیں ......
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	...... اور جو اپنی امانتوں
عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں
عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۰	اور جو اپنی نمازوں کی پابندی
(مومنون-۱)	کرتے ہیں،

ان آیتوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاک دامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے،

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی

نیکیون کی محرک ہی، وحی محمدیؐ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہین جن کے یہ اوصاف ہین،

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ	نیکی یہی نہین ہے کہ تم نماز مین اپنا منھ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	پورب یا پچھم طرف کرو، بلکہ اصل نیکی
وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	اس کی ہے، جو خدا پر، قیامت پر، فرشتون
وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ	پر کتاب پر، اور پیغمبرون پر ایمان لایا
وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی	اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا
الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی	کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ دارون
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ	کو یتیمون کو، غریبون کو، مسافر کو،
السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی	مانگنے والون کو، اور غلامون کے
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	آزاد کرنے مین دیا، اور نماز ادا کرتا
وَاٰتَی الزَّکٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	رہا، اور زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ
بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا	کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہین،
وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ	اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی
الضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ	مین ثابت قدم رہتے ہین، یہی وہ
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا	ہین، جو راستباز ہین، اور وہی
وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ۲۲)	تقویٰ والے ہین،

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی، اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح اُن کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفاے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں،

اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے، جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں، اور وہی باتیں خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں، چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا
خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا
سَلٰمًا، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ
لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا
اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا،
اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ
مُقَامًا، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا

اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں
جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں، اور
جب ناسمجھ لوگ اُن سے بات کریں،
تو وہ سلام کہیں، اور جو اپنے پروردگار
کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ
میں رات گذارتے ہیں، اور جو کہتے
ہیں، کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے
جہنم کا عذاب دور کر کہ اس کا عذاب
بڑا تاوان ہے، اور جہنم برا ٹھکانا اور
مقام ہے، اور جو خرچ جب کرتے ہیں

لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا، وَالَّذِيْنَ
لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ
وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ج
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا

....

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا
وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا
قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ
اِمَامًا،

(فرقان - ٦)

تو نہ فضول خرچی کرین اور نہ تنگی کرین،
بلکہ ان دونون کے بیچ سے وہ سیدھے
گذرین، اور جو خدا کے ساتھ کسی اور
خدا کو نہین پکارتے، اور جو کسی جان
کا بےگناہ خون نہین کرتے جس کو خدا
نے منع کیا ہے، اور نہ بدکاری کرتے
ہین کہ جو ایسا کریگا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا...
اور جو جھوٹے کام مین شامل نہین ہوتے،
اور جب کسی لغو بات پر گذر رہے ہون
تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہین
اور جب خدا کی نشانیان اُن کو سنائی
جائین، تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑین
اور یہ دعا مانگتے ہین کہ اے ہمارے
پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچون سے
آنکھ کی ٹھنڈک بخش، اور ہم کو پرہیزگار(ون)
کا پیشوا بنا،

دیکھو کہ ایمان کی حقیقت مین عفو و درگذر، میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری

نہ کرنا، اور مکروزور میں شریک نہ ہونا، وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں،

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں،

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے
يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۤئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ	ہیں، اور جو بڑے بڑے گناہوں، اور
وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ وَ	بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے
الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ	ہیں، اور جو غصہ کی حالت میں معاف
وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ	کرتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی پکار
شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں
يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ	اور اُن کے کام باہم مشورہ سے ہوتے
الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ	ہیں، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے، اس
جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا	میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں
فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى	اور جب اُن پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ
اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ	لیتے ہیں، اور برائی کا بدلہ ویسی ہی
وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	برائی ہے، تو جو کوئی معاف کردے
فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ	اور نیکی کرے، تو اس کا ثواب اللہ
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ	کے ذمہ ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو پیار

النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ ۝ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ
ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

(شوریٰ - ۴)

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنفِقُونَ
فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝

(آل عمران - ۴)

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم
مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا
رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ وَإِذَا
سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ
وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

نہین کرتا، اور اگر کوئی مظلوم ہوکر بدلے
لے، تو اس پر کوئی ملامت نہین، ملامت
تو اُن پر ہے جو لوگون پر از خود ظلم کرتے
ہین، اور زمین مین ناحق فساد مچاتے ہین
اُن کے لیے بڑا دردناک عذاب ہو اور بیشبہ
جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کردے اور

جنت اُن پرہیزگارون کے لیے تیار
کی گئی ہی جو خوشی اور تکلیف دونون حالتون
مین خدا کی راہ مین کچھ خرچ کرتے ہین اور
جو غصہ کو دباتے ہین، اور لوگون کو معاف
کرتے ہین، اور خدا اچھے کام کرنے والون

یہ وہ ہین جن کو دُہرا ثواب ملیگا، اس لیے
کہ انھون نے صبر کیا، اور وہ برائی کو بھلائی
سے دور کرتے ہین، اور جو ہم نے دیا ہے
اس سے کچھ خدا کی راہ مین خرچ کرتے ہین
اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہین تو
اس سے کنارہ کرلیتے ہین اور کہدیتے ہین کہ

اَعْمَالُکُمْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ	ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمہارے لئے
لَا نَبْتَغِی الْجٰہِلِیْنَ،	تمہارا عمل ہے، تم سلامت رہو ہم ناسمجھو
(قصص - ۶)	کو نہیں چاہتے۔
وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ	اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے
مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًاo	مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے
(دھر - ۱)	ہیں،

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی، وہ احادیث میں محفوظ ہے، ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے بیان لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے؟

اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے، اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا،

وَاھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ	اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر
لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ	اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر
وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَاتِھَا لَا یَصْرِفُ	سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا،
عَنِّیْ سَیِّئَاتِھَا اِلَّا اَنْتَ،	اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے، بُرے
(مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)	اُن کو نہیں پھیر سکتا لیکن تو،

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے

بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے، وہ حسنِ اخلاق ہے،

ایمان سے بڑھ کر اسلام مین کوئی چیز نہین لیکن اُسکی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرمایا،

اکمل المومنین ایماناً احسنھم	مسلمانون مین کامل ایمان اس کا ہے
خلقاً ہ	جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے،

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابنِ حبان مین ہے اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ اسلام مین ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ

پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے،

اسلام مین نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے. وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی اونکی

قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہوجاتا ہے، ارشاد ہوا،

ان الرجل لیدرک بحسن	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا
خلقہ درجۃ قائم اللیل	ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر
وصائم النھار،	عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے،

یہ حدیث چند ہم معنی لفظون کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابنِ حبان

اور طبرانی مین ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازون مین رات بھر کی شب بیداری

اور نفل روزون مین دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہوسکتا ہے، وہی درجہ

حسنِ خلق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات

کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے،

اسلام مین اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانون مین درجہ اور رتبہ کا فرق نمایان ہوتا ہے، فرمایا

خیارکم احسنکم اخلاقاً	تم مین سب سے اچھا وہ ہے جس کے
(بخاری کتاب الادب)	اخلاق سب سے اچھے ہون،

ایک اور حدیث میں ہے

مامن شیئ یوضع فی المیزان	(قیامت کی) ترازو مین حسنِ خلق سے
اثقل من حسن الخلق فان صاحب	زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسنِ
حسن الخلق لیبلغ بہ درجۃ	اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ
صاحب الصوم والصلوٰۃ	کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل
	کرسکتا ہے.

یہ حدیث ترمذی میں ان ہی الفاظ کے ساتھ ہے، لیکن حدیث کی دوسری کتابون (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) مین مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ "حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو مین نہین"، اس حدیث نبوی نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان مین حسنِ اخلاق سے زیادہ گران کوئی چیز نہیں،

ایک اور حدیث مین ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس مین حسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے،

خیر ما اعطی النّاس خلق حسن،

لوگون کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزین عطا ہوئین، ان مین سب سے بہتر اچھے اخلاق ہین،

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حنبل، طبرانی، اور ابن ابی شیبہ مین ہے، اس بشارت نے اخلاق حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتون سے بالاتر بنا دیا، ایک اور حدیث مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، [1]

اَحَبُّ عباد اللہ الی اللہِ اَحْسَنُھم اخلاقًا (طبرانی)

اللہ کے بندون مین اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہون،

اس سے معلوم ہوا کہ حسنِ خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے، اور درحقیقت رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے، فرمایا،

ان احبّکم الیّ واقربکم منّی فی الآخرۃ محاسنکم اخلاقًا وان ابغضکم الیّ و ابعدکم منّی فی الآخرۃ مساوئکم اخلاقًا (ابن حنبل وطبرانی وحبان و…)

تم مین میرا سب سے پیارا اور آخرت مین مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہین جو تم مین خوش خلق ہین، اور مجھے ناپسند، اور قیامت مین مجھ سے دور وہ ہون گے جو تم مین بد اخلاق ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک مین دو صحابی بیویان تھین، ایک رات بھر

---

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہین،

نماز پڑھتین، دن کو روزہ رکھتین، اور صدقہ دیتین، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیون کا دم ناک مین کیے رکھتی تھین، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتین، اور غریبون کو چند کپڑے بانٹ دیتین، مگر کسی کو تکلیف نہ دیتین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونون کی نسبت پوچھا گیا، تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس مین کوئی نیکی نہین، وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی"، اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہوگی"[1]، ان دونون بیویون کی سیرتون کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہین، وہ اسلام مین اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایان کر دیتے ہین،

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہین کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لے جائے، فرمایا: "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا، اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا، اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک[2]"، غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہان تک بڑھا رہی ہے،

ایمان کے اوصاف ولوازم

ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثین ہین جن مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلان فلان اوصاف واخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہین جس قدر ان لوازم اور خصوصیات مین زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے نشا

[1] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یؤذی جارہ [2] مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ ص ۱۴ حیدر آباد دکن،

میں زیادتی و کمی ہو گی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں، ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے، جس کی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا، آپؐ نے فرمایا،

۱۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے،

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو، (تاکہ تمھارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا، جس کو خدا اور اس کا رسولؐ سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لیے پیار کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا، حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جزء ہیں، مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا، دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا، اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی اُس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے، جب تک اپنے بھائی

کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہو،

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں، اور جو مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان ومال اُس کی امانت میں دے دیں،

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا، اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (یعنی سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا، پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا، اور اخلاقی جوانمردی (کھانا سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے الفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں،

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے، نہ کسی کو بددعا دیتا ہے، اور نہ گالی دیتا ہے، اور نہ بدزبان ہوتا ہے،

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے، اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا، خدا اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کریگا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا،

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہو، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی اُس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اُس کا پڑوسی

اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو،

۱۴- جو صاحبِ ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے،

۱۵- بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت[1] کرے،

ان مذکورۂ بالا حدیثون مین سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہو،

اخلاقِ حسنہ صفاتِ الٰہی کا سایہ ہین

لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہین، اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہین، حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے، ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہین جو صفاتِ ربانی کا عکس ہین، اور انہی کو برا کہتے ہین جو خدا کی صفات کے منافی ہین، البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتین ایسی بھی ہین جو اسی کے ساتھ مخصوص ہین، اور جن کا تصور بھی دوسرے مین نہین کیا جا سکتا، جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پُرجلال صفتین بھی ہین، جو صرف خدا ہی کو زیبا ہین،

[1] یہ تمام حدیثین معتبر و مستند کتبِ حدیث کی کتاب الایمان مین موجود ہین ہم نے ان کو مجمع الفوائد، اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال مین ہر قسم کی حدیثین ہین، مگر ہم نے ان کے انتخاب مین مشہور و معتبر حدیثون کو ترجیح دی ہے،

جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ، اس قسم کی صفات کا بندہ مین کمال یہ ہے کہ اُن کی متقابل کی صفتین اس مین پیدا ہون، خدا کی کبریائی کے مقابلہ مین بندہ مین خاکساری اور تواضع ہو، اور خدا کی بلندی کے مقابلہ مین بندہ مین پستی اور فروتنی ہو، الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب وفیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب وفیض مین ترقی کرین گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا، اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے[1]. اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہین،

اخلاقی معلّمون مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا امتیاز

دنیا مین اخلاق کے بڑے بڑے معلّم پیدا ہوئے جن کے مکتب مین آکر بڑی بڑی قومون نے ادب کا زانو تہ کیا، اور آداب واخلاق کے وہ سبق اُن سے حاصل کئے جو سینکڑون اور ہزارون برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک اُن کو یاد ہین، اور سچ یہ ہے کہ آج جہان کہین بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے، وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے، مگر ایک تنقیدی نظریہ بتا دے گی کہ ان اخلاقی اُستادون مین باہمی نسبت کیا ہے ؟ اُن کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولون پر مبنی ہے، اور ان مین درس گاہ عالم کے سب سے آخری معلّم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہی،

[1] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث مین اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کردی ہے دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اوّل صفحات ۲۰۵، ۲۲۳،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتین ہین، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اخروی مذہب پر رکھی، جیسے عام انبیا علیہم السلام اور بعض مذہبون کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ وحکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی، ہم ان مین سے اوّل کو انبیا، اور مصلحین دین اور دوسری کو حکما کے نام سے تعبیر کرسکتے ہین، ان دونون جماعتون نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے، پیغمبرون اور مذہب کے بانیون نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکم خداوندی" کو قرار دیا، اور اس حکم و فرمانِ الٰہی کے سوا اُن کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہین، نہ اُن کی تعلیمات مین علت و معلول کا تسلسل ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتون کی گرہ کشائی ہے، اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتون کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات مین علت و معلول کی تحقیق نفسیاتی خواص کی بحث اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید، یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے، اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ع

یار ما این دارد و آن نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم مین حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ وری، امر ربانی اور حکم فطرت، کتاب اور حکمت دونون کی آمیزش ہے،

انبیاء اور حکما مین جو اصلی فرق و امتیاز ہے، وہ یہ ہے کہ انبیا کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اُن کی معصوم زندگی، اُن کے مقدس کارنامے، اور اُن کے پاک اثرات ہوتے ہین جن کا فیض اُن کے ہر بُنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے، اور پیاسون کو

سیراب کرتا ہے، لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محو حیرت ہے، اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اُس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی، وہ گو دوسرون کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہین آتا، وہ دوسرون کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے، مگر خود عمل کی ہر راہ مین بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم ومحبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر غریبون پر رحم کھانا اور دشمنون سے محبت کرنا وہ نہین جانتا، وہ سچائی اور راستبازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے، مگر وہ خود سچا اور راستباز نہین ہوتا،

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہین، اس لئے اس کے منھ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہین بناتی، بلکہ ہوا کے تموج مین مل کر بے نشان ہوجاتی ہے، اور انبیا علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہین وہ کرتے بھی ہین، جو اُن کی تعلیم ہے وہی اُن کا عمل ہے، جو اُن کے منھ پر ہے وہی دل مین ہے، اسی لئے اُن کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہمنشینون کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء (یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط افلاطون اور ارسطو) مین نمایان ہے، سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا، مگر یہان قومون کی قومین ہین، جو موسیٰ عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم وتلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر

پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے، وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے،

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السّلام یکساں نہیں ہیں، بلکہ اُن کے مختلف مدارج ہیں۔ اُن کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ اُن کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو، تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق اُن کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں، اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں، تاکہ بعد کے آنے والے بھی اُس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل، مکمل اور آخری معلم کے لئے حسبِ ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے،

۱- اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو،

۲- اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو،

۳- اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لئے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو،

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامعِ کمالات نہیں۔ دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے

سامنے موجود ہے، توراۃ کے پیغمبرون مین سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم مین ہین، اُن غیر اخلاقی قصّون کا ذکر فضول ہے، جن کو توراۃ کے راویون نے ان معصوم بزرگون کے حالات مین شامل کردیا ہے، اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے، حضرت نوح سے لے کر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک توراۃ کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ، ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطرین تمھارے سامنے ہین، اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی ؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس ۳۳ برس کی زندگی مین سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے، اور ان تین ۳ برسون کے حالات مین سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت مین کیا ہم یہ کہہ سکتے ہین کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ مین نہین ؟

یہ اسوۂ حسنہ کی کتاب سیرت ص ۱۰۰

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیون کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا مین کوئی سامان ہی موجود نہین، کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اسلام ہی کے ایک معلّم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا مین محفوظ اور سب کو معلوم ہے، اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ یہاں (سیرتِ محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جس مین محمدؐ کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور

عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ، محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت مین کرتے دیکھو اس کو جلوت مین برملا بیان کرو، جو حجرہ مین کہتے سنو، اس کو چھتون پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلغ الشاھد الغائب ،

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے، ان مقدس ہستیون کی تعلیم کی اچھائی اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ ونصائح کی عمدگی مین کوئی شبہ نہین لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگون کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پُر تاثیر واعظ حضرت عیسیٰؑ کی معصومانہ باتین، سچائی اور راستبازی کی نصیحتین، اور لفظی صنائع و بدائع کے دلکش تمثیلون سے بھری ہوئی تقریرین دنیا نے سنین، اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن مین ہے، مگر کیا اس کی آنکھون نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالین بھی دیکھین؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "سب کچھ جو تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ مین لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت مین داخل نہ ہوگے" کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ مین لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریرون کا مقابلہ نہ کرو" کیا اُس نے خود بھی شریرون کا مقابلہ نہین کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنون کو بھی پیار کرو" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و دل سے پیار کر" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی

---

[۱] انجیل ،

تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو، کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے،

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا، اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا، اُس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ	کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو
أَنْفُسَكُمْ (بقرہ ع-۵)	اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو،

اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ	تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی
مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا	بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ
لَا تَفْعَلُونَ (صف-۱)	جو نہ کرو،

ایک شخص نے اُمّ المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا، کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، کان خلقہ القرآن[1] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے، وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا، اگر

[1] ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل

غریبون اور مسکینون کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہ کر اور دوسرون کو کھلایا، اگر آپ اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنون اور قاتلون کو معاف کیا، کھانے مین زہر دینے والون سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہین لیا، جنھون نے آپ پر تیر برسائے، اور تلوارین چلائین، مسلّح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہین اٹھایا، کپڑون کی شدید ضرورت کے وقت مین بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا، خود اپنی چادر اُتار کر اس کے حوالہ کر دی، سیرت کی دوسری جلد مین یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہین، الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانون کو اپنے ہادیون اور رہنماؤن کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہین، اور اُن کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، اور مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے نہ صرف اقوال ونصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونون اور کارنامون کو بھی پیش کرتے، اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہین، دنیا کے کسی پیغمبر اور بانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیات کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہمعصرون کے سامنے پیش نہین کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیات کو خود اُس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا، فرمایا،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ	(اے منکرو!) مین تو تمھارے درمیان
قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ،	اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہون
(یونس - ۲)	کیا تم نہین سمجھتے.

پھر آپ کو خطاب کرکے خود آپ سے فرمایا گیا

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (اے محمد!) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے،

(ن - ۱)

کامل و مکمل اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے، کہ اس کی تعلیم مین یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسرون کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو، اور دوسرے ناقصون کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکون کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو، اخلاق کے سارے معلمون کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس مین تھی، ؟ کیا اس مین جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگ دلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس مین جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُتر سکے، یا اس مین تھی جس کی نسبت اُس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ - ۱) وہ ان کو خدا کی باتین سناتا اور انکو پاک و صاف بناتا، اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

اس تحدی اور اعلان مین یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس مین اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعوی نہین ہے کہ وہ لوگون کو کتاب و حکمت کی باتین سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو اپنے فیض ذات سے پاک و صاف و

مصفا بنا بھی دیتا ہے، وہ ناقصون کو کامل، گنہگارون کو نیک، اندھون کو بینا، اور تاریک دلون کو روشن دل بنا دیتا ہے، چنانچہ جس وقت اُس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم ازکم ایک لاکھ انسان اُس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے، اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا، تیئیس برس بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا،

تعلیم اخلاق کا تنوع اگر کسی معلم مین تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانون کی نہین، بلکہ سینکڑون مختلف قوتون کے انسانون کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہون پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہان صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایان نہین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب مین عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہین، بودھ کے وہار اور خانقاہ مین دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیرون کے سوا کوئی اور موجود نہین، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہِ اعظم مین آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس مین انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے، خود معلّم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہین، اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہین،

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خاندان

ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے، یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوے ادب تہ کرتے ہین، اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہین، مدینۃ النبیؐ کی اس درس گاہ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجورون کے پتون سے اور ستون کھجور کے تنون سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجد نبوی تھا، اس کے الگ الگ گوشون مین ان انسانی جماعتون کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہین، کہین ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہین، کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ وسعدؓ بن معاذ وسعدؓ بن جبیر، جیسے ارباب راے و تدبیر ہین، کہین خالدؓ، ابوعبیدہؓ سعدؓ بن ابی وقاص، اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار ہین کہین وہ ہین، جو بعد کو صوبون کے حکمران، عدالتون کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے کہین اُن زہاد و عباد کا مجمع ہے، جن کے دن، روزون مین اور راتین نمازون مین کٹتی تھین کہین ابوذرؓ و سلمانؓ و ابودرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہین، جو مسیحِ اسلام کہلاتے تھے، کہین وہ صفہ والے طالب العلم تھے، جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے، اور گذارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب مین مصروف رہتے تھے، کہین حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدثؓ تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلامون کی بھیڑ ہے، تو دوسری جگہ آقاؤن کی محفل ہے کہین غریبون کی نشست ہی، اور کہین دولتمندون کی مجلس ہے، مگر ان مین ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہین پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی

سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہین، سب پر توحید کا یکسان نشہ چھایا اور سینون مین حق پرستی کا ایک ہی دلولہ موجین لے رہا ہے، اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش مین لگے ہین ۱؎

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹون مین الجھنا ہوگا، اخلاق کا وجود تو یقیناً اُس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اوس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، اُن کے اسباب و علل کی تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق، اور اُن کی غرض و غایت کی تعیین، یونانیون کے عہد مین شروع ہوئی، اور موجودہ عہد مین علم نفسیات کے زیر سایہ پرانے نظریون پر نظر ثانی کی گئی، ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق مین شروع سے آج تک فلسفیون مین قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے، ہر سوال کے جواب مین متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اصول پیدا ہوتے رہے، اور ان مین سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہین، تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکون کی تشریح ہین جنھین یونانی اصطلاح مین "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہی، موجودہ اصطلاح مین پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ

۱؎ اس موقع پر ہر اس واسطے میرے خطبون پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے،

سے یوں کہئے، پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے، اور دوسرا "عقل" پر، پھر اس منشاے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے ارسطو اور اُس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے،

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں، علماے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہکر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے لیکن درحقیقت اُن کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں یعنی یہ کہ قوانینِ اخلاق کسی وحی و الہام سے ماخوذ ہیں، یا کسی بیرونی ماخذ سے جو لوگ وحی والہام پر ایمان نہ لاسکے، انھوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا، پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا، اور کسی نے اس سے باہر جنھوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انھوں نے باختلاف مذاق انسان کی اصل فطرت کو انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو، اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا جنھوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے قبیلہ کے سردار، اور بادشاہ کے حکم، اور سوسائٹی کے رسم ورواج کو اُن کا ماخذ قرار دیا، مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کے حکم، یا بادشاہ کے حکم، یا سوسائٹی کے رسم ورواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟

اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق

کے اقسامِ مسائل مین کبھی قبول نہین کیا جا سکتا،

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہین جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ مین بیان بھی کیا ہے، اور اپنے بندون کی فطرت مین ودیعت بھی رکھا ہے، تا کہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے، تو احکامِ الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے، فلسفیانہ کاوشون اور موشگافیون کو چھوڑ کر کلی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہین کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکین، ہو سکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائید ہی ماخذ اور محرکات ضمیر فطرت وجدان اور عقل سب ہون، اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات مین بھی توافق ممکن ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال مین لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے، یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے، یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس مین ملحوظ ہو، اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو، اسلام کے اخلاقی فلسفہ مین یہ سب جہتین ایک کام مین مجتمع ہو سکتی ہین،

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے، اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے، اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے، ساتھ ہی

اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں، اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے، اور عقل بھی یہی کہتی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے موقع بھی ہو سکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات، اور وجدان کا ایک حکم ہو، اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو، اسی لئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہماری قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہئے، وجدان کہئے، حاسۂ اخلاقی کہئے، ضمیر کہئے، اس فلسفیانہ تحقیق سے اس کو بحث نہیں، اور باوجود اس کے وہ اُن کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں، اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرةً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں، اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات، اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ مانتے ہیں، اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے، جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے، جس کے ذریعہ سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات

جیسے حسن وقبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے، جو ہم کو ہر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے، اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی،

تعلیم محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول ومبانی کی طرف کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں، مگر اُس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے، کہ اخلاق کی خوبی اُن کے علم وفلسفہ مین نہین، بلکہ اُن کے عمل مین ہے، اس نے "علم بلاعمل" کی کوئی قدر وقیمت اُس کی نگاہ مین نہین؛ لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلاعلم" کو بھی اُس نے پسندیدہ نہین سمجھا ہے، اسی بنا پر اُس نے ان اصولون کی طرف اشارے تو کیے ہین، مگر اخلاق کے باب مین اُن کی عالمانہ تحقیق وتلاش کو کوئی اہمیت نہین دی ہے،

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائین کہ یہ خدا کے احکام ہین، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہین، انہی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ، اور عقل مین سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے، ہونا چاہئے ان مین باہم جس حد تک باہمی مطابقت وموافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس حد تک ان مین کمی ہوگی، اسی حد تک اس کے کمال مین نقص ہوگا،

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے، کہ یہ خدا کا حکم ہے؛ پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اُس کا وجدان بھی یہی ہو، اُس کو وہ

اپنا فرض بھی جانے، اُس کے کرنے مین وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے، اور اسی کی پیروی مین نوعِ انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے، الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قوی مین اس بارہ مین باہم موافقت اور یکسانی ہوگی، اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا، اور جس قدر اس توافق مین کمی ہوگی، کہ خدا کا حکم سمجھکر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے، یا اُس سے اُس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال مین نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دین لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہین سمجھتا، اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے، تو اُس کے یہ صاف معنی ہین، کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہین ہوا، ہے جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے، اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصول مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے، مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس مین ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر مین ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہین،

بے غرضی چونکہ اسلام مین اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزون کی طرح عبادت ہے، اس لیے اوس کی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی، اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہین ہے تو ان کامون مین کوئی نیکی اور ثواب نہین، اور نہ اُن کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی، مذہبی کامون کو چھوڑ کر دنیاوی کامون پر بھی نظر ڈالئے، تو معلوم ہوگا کہ

ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے، اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں، اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چُن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع، یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے، تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نانِ نمک ہی رکھدیں، تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں، تو روحانی عالم میں انکے نتائج کیا کچھ ہوں گے

نیت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور بُرے کام کی بنیاد قرار دیا ہے، بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا، جتنا قلب کی کیفیت اور اُس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے، ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی، ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اُس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اُس کو مار ڈالیں گے، یا سخت تکلیف پہنچائیں گے اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا، اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بلانے والے کی نیت کی بُرائی میں اب بھی کوئی شک نہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے بات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا، لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے

مین درحقیقت اُس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیّت سے اس کو بلوایا، لیکن اتفاق سے وہ
راستہ مین کسی گڈھے یا کنوئین مین گر کر مرگیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب ہوگا
کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا، مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بُری تھی
ایک دوسری مثال فرض کیجئے، میری جیب مین روپیون کا ایک بٹوا تھا، اتفاق
سے وہ راستہ مین گر گیا، جب مین راستہ سے واپس پلٹا، تو ایک بٹوا پڑا دیکھا، اور دل مین
خیال کرکے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے مین کسی
بُرائی کا مرتکب نہین ہوا، مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے بُرائی کر چکا،
لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا، اور مین نے اُس
کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا، تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو، پھر بھی میرا دامن گناہ کی بُرائی سے پاک رہا
راستہ مین کوئی چل رہا ہو، اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اُس نے اس کو بیگانہ
غیر سمجھ کر کسی بُری نیت سے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی، یا
اوس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اُس کی بیوی ہے، حالانکہ یہ واقعہ
نہ تھا، تو پہلی صورت مین اس کا دل گنہگار ہو چکا، اور دوسری صورت مین اس کی بےگناہی
بالکل ظاہر ہے، نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے، لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا
اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے، تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا، اسی
طرح آپ اگر کسی مفلس کی امداد اس لئے کرین کہ لوگ آپ کی تعریف کرین گے تو اسلام کی

نگاہ مین یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورۂ آل عمران مین ہے،

وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ — اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو ہم

مِنْھَا وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ — دین گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا

نُؤْتِہٖ مِنْھَا (اٰلِ عمران-۱۵) — اس کو وہ دین گے،

ایک اور آیت مین اس کی تصریح کر دی گئی ہے، کہ جس کام کا مقصد صرف نمایش، اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہین، فرمایا،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا — اے ایمان والو! تم اپنی خیراتون کو

صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی — احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ

کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ — کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو ریا

النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ — کرتا ہے، جو لوگون کے دکھاوے کے

الْیَوْمِ الْاٰخِرِ — لئے خرچ کرتا ہے، اور خدا اور قیامت

(بقرہ-۳۶) — پر یقین نہین رکھتا،

اسی قسم کی اور بہت سی آیتین ہین جن کی تفسیر مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہین،

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، — انسان کے اعمال اس کی نیت پر

(صحیح بخاری باب اول) — موقوف ہین،

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے،

وَلِکُلِّ امْرِیٔ مَا نَوٰی فَمَنْ — ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ

کانت ھجرتہ الی اللہ و	نیت کرے، تو جس کی ہجرت خدا و
رسولہ فھجرتہ الی اللہ	رسول کی طرف ہے، تو اس کی ہجرت
ورسولہ ومن کانت ھجرتہ	خدا و رسول کی طرف ہے، اور جس کی
الی دنیا یصیبھا او امرءۃ	ہجرت کی غرض دنیا کا نا ہو، یا کسی
یتزوجھا فھجرتہ الی ما	عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے'
ھاجر الیہ[1]۔	تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہو جس
	کی غرض سے اس نے ہجرت کی،

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمامتر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے، اور اسی لئے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسن نیت نہ ہو، تو اخلاق کا بڑا سا بڑا کام بھی حسن خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر وبرکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے،

فلسفۂ اخلاق کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے، جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ جان ایس میکنزی اپنی تصنیف مینول آف ایتھکس کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے، وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام

[1] صحیح بخاری جلد اول باب ماجاء ان الاعمال بالنیۃ۔

تمامتر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں، ان کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں، اس کی اخلاقی حیثیت نہیں" اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے،

اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعوی کے ساتھ شروع کیا ہے، اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے، وہ کہتا ہے کہ بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں، بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں، جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے[۱]۔

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمامتر بنا ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے، تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے، کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اُس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں، مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اُس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے، اور ایک دن آئے گا، جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی، جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے، اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے، اسی لئے وحی محمدی نے

---

[۱] علم اخلاق، کتاب اول، باب ششم مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ، ۱۳۴۱ھ

خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر ایک عمل کی بنیاد و قرار دہی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا، اور نمایش بن جاتا ہے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا	اے ایمان والو! اپنی خیراتون کو جتا کر
صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ	یا ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ برباد
كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ	کرتا ہے، جو اپنے مال کو لوگون کے
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور خدا اور
(بقرہ ع-۳۶)	آخری دن پر یقین نہین رکھتا،

یہی ایمان صحیح جس سے حُسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہین،

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ	اور جو خدا اور قیامت کو نہین مانتے اُن
كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ	کے کام ایسے ہین جیسے میدان مین ریت
مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ	کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے جب وہان
شَيْئًا، (نور-۵)	جائے تو اُس کو کچھ نہین پائے،

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے، اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو،

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ	یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والون
مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن	کے کامون کی مثال ایسی ہی کہ اندھیرے

فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ	ہیں گہرے دریا میں اُس کو لہر ڈھانکے ہے
بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ	اس لہر پر دوسری لہر ہے، اس پر گھٹا
اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَا ؕ	چھائی ہے تاریکیاں ہیں ایک پر ایک
وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا	جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اُسے
فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ؕ	اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اُس کو
(نور - ۵)	کہیں روشنی نہیں،

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اُس کے سامنے عمل کے مواخذہ، بازپرس، اور جوابدہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی، اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے،

غرض وغایت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو عمل قالب ہے، تو صحیح غرض وغایت اُس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے، حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض وغایت ہو کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لیکر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں، لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں،

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے، بلکہ اس سے بحث ہے

کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہونی چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اعلیٰ پست اور بلند متعدد غرضیں اور غایتیں ہو سکتی ہیں، ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں، اور اس کو اس کے گھر تک آرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا، یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے، اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے، یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہماری بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے، بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی خوشی کے لئے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں، بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں، اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں، غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرک ہو سکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں، اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابلِ قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے، اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لئے کرنا بھی گو

پست مقصد ہے مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی، اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے، مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے، یہ بالکل فطری بات ہے کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے، مگر جب اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی، تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے،

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دیسکتے ہیں، لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے، اس لئے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے، اس لئے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دی گئی ہے یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں،

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کے بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ بُرائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس کے سبب سے اُس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے، غریب و لاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے، قاتل اور ظالم سے طبعًا ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے، یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر

مین ہے، ہراچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے، لیکن بری صحبت بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے مین انسان خوف کھاتا ہے اس کے ہاتھ پاؤن لرزتے ہین، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریاے احساس مین غرق ہوجاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہوجاتی ہے، لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دبا تا رہتا ہے، تو وہ دب کر رہ جاتی ہے، اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہوجاتا ہے،

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہین؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان مین نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہین یہ اس کے نتائج ہین، قرآن کہتا ہے،

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، (الشمس) — ہر نفس مین اس کی بدی اور نیکی الہام کردی ہے،

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے، اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی کی اصطلاح مین اس کا نام نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے، اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے، سورۂ قیامت مین ہے،

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ — اور قسم کھاتا ہون اس نفس کی جو ملامت

(قیامت - ۱) | کہ اُس کی بُرائیوں پر ملامت کرتا ہی،

آگے چل کر فرمایا،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّ لَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (قیامت - ۱)

کہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے، گرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں (کے پردے) ڈال لیتا ہے،

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن اُن کو موقع مل گیا، اور انھوں نے دریافت کیا، فرمایا، "نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے جائے، اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں" اسی طرح وابصہؓ بن معبد نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے، چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا، اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ اُن کو روک رہے تھے، مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا "وابصہ قریب آجاؤ" جب وہ قریب جاکر بیٹھے تو فرمایا "اے وابصہ میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے" عرض کی "حضور ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو" عرض کی سچ ہے یارسول اللہ فرمایا:-

یا وابصة استفت قلبك	اے وابصہ اپنے دل سے پوچھ کرا وہ
واستفت نفسك البرّ	اپنے نفس سے فتوی لیا کر نیکی وہ ہے
ما اطمأنّ الیه القلب	جس سے دل اور نفس مین طمانیت
واطمأنّت الیه النفس	پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل
والاثم ما حاك فی القلب	مین کھٹکے اور نفس کو ادھیڑبن مین
وتردّد فی النفس وان افتاك	ڈالے اگرچہ لوگ تجھے اس کا جواز
الناس[1]،	ہی کیون نہ بتائین،

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے، جس کا نام لوگون نے ضمیر کی آواز رکھا ہے،

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اُس کے دل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر ہوش مین آکر وہ توبہ واستغفار کرتا ہے، اور پشیمان ونادم ہوتا ہے، تو وہ داغ مٹ جاتا ہے، لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے، تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے، یہان تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کرکے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ مین ادا فرمایا،

انّ العبد اذا اخطاء خطیئة	بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے
نکتت فی قلبه نکتةٌ سوداءُ	دل مین داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑجاتا ہو

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۲۸ مصر،

فاذا ھو نزع واستغفر وتاب صقل قلبہ وان عاد زید فیھا حتیٰ یعلو قلبہ،

تو اگر اُس نے پھر اپنے کو علٰحدہ کر لیا، اور خدا سے مغفرت مانگی، اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے،" اگر اوس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھ جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے،

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت مین ہے،

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ،[1]

کبھی نہین، بلکہ اُن کے (بُرے) کامون کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا ہے،

(تطفیف - ۱)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل مین فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے، راستہ کے ادھر اودھر دونون طرف دو دیوارین کھچی ہین، اور ان دونون مین کچھ دروازے کھلے ہین، لیکن ان پر پردے پڑے ہین، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، ادھر ادھر اودھر مڑو نہین جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائین بائین کے دروازون مین سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے، تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اٹھانا

[1] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور،

اٹھاؤگے تو اندر چلے جاؤگے،" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں، اور یہ پردے اس کے حدود ہیں، اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے،

هُوَ واعظ اللّٰه في قلبِ كُلِّ مُؤمنٍ[۱]	وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے،

کیا کسی بڑے سے بڑے حکیم نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے،

مسرت و انبساط یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے، کرنے والے کو جو خوشی، اور بُرائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے، وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور بُرائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے، گو تمام تر صحیح نہیں ہے، تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے، اور بُرائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں، اور نہ اُن کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیئے کہ یہ بھی مادی خودغرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب ولاچار کی امداد سے بےشبہہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض وغایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول،

[۱] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد و بیہقی فی شعب الایمان ورزین و ترمذی مختصراً،

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ مین جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت و الم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض و غایت نہین، بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے، علمائے اخلاق مین بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہین، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارا محبوب بنایا
وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ	اور اس کو تمھارے دلون مین اچھا
اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَ	کر کے دکھایا، اور کفر اور گناہ، اور
الْعِصْيَانَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ	نافرمانی سے گھن لگادی، یہی لوگ نیک
الرّٰشِدُوْنَ، (حجرات-۱)	چلن ہین،

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ مین اس طرح فرمائی،

اذا سرّتک حسنتک وساءتک	جب تمھاری نیکی تم کو خوشی بخشے، اور
سیئتک فانت مومن،[۱]	تمھاری بدی تم کو غمگین کردے تو تم مومن ہو،
[illegible] من سرّته حسنته وساءته سیئته فهو مؤمن[۲]	جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنا دے وہ مومن ہے،

[۱] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴، حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر و ابن حبان و ابو داؤد عن عمر بن الخطاب،
[۲] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال جلد اول ص ۲۷،

مَن عَمِلَ سیئۃ فکرھھا حین	جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس
یعمل، وعمل حسنۃ فسر فھو	سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا
مومن[1]،	کام کیا، تو اس کو مسرت ہوئی وہ مومن ہے

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذتیہ کے لئے بھی قدم رکھنے کی گنجایش باقی رکھی ہے، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے، بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی، اس کی تصحیح فرمادی ہے،

رضائے الٰہی اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہئے، اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے، یہیں اگر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایان ہوتا ہے، حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے؟ اور معلم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض وغایت کیا قرار دینی چاہئے، انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا، ایثار اور حسن عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا،

[1] مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۳ حیدر آباد،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ	بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ	خوشنودی چاہنے کے لئے بیچتے ہیں
رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ، (بقرہ ۲۵)	اور اللہ بندوں پر مہربان ہے،

پھر مال کے متعلق فرمایا :-

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنی دولت
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ،	خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ
(بقرہ ۳۶)	کرتے ہیں،
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ	اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ
اللّٰهِ، (بقرہ ۳۷)	کی ذات کو چاہ کر،
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاءَ	اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی
مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ	کے لئے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا
اَجْرًا عَظِيْمًا، (نساء ۱۷)	اجر دیں گے،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ	اور جنھوں نے خدا کے لئے صبر کیا، اور
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	نماز کھڑی کی، اور ہم نے جو اُن کو
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	دیا ہے اس میں کچھ چھپے اور کھلے
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ	طریقے سے خرچ کیا، اور برائی کو نیکی
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰئِكَ	سے دور کرتے ہیں، ان ہی کیلئے

لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد - ۳)　　　　　　پچھلا گھر،

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل مین کھولی گئی ہی،

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی　　　　　　جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ　　　　　　ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان

تُجْزٰۤی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ　　　　　　نہین ہے جس کو ادا کرنے کے لئے

الْاَعْلٰی ۝　　　　　　دیتا ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب

(لیل)　　　　　　کے لئے دیتا ہے،

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث مین فرمائی ہی، ایک صحابی پوچھتے ہین، یا رسول اللہ کوئی اس لئے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لئے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اسلیے کہ اُسکو شہرت حاصل ہو، تو ان میں سے راہِ خدا مین لڑتا کس کو کہین گے، فرمایا اس کو جو اس لئے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو۔[1] ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لئے اجر کا موجب، کسی کے لئے پردہ پوش، اور کسی کے لئے گناہ ہے، اجر کا موجب اس کے لئے ہے جو خدا کی راہ مین اس کو باندھتا ہے، تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوش اس کیلئے ہے جو ضرورۃً اس لئے باندھتا ہے، کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے، تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسرون سے مانگنی نہ پڑے، تو وہ رحم و شفقت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول ص ۳۹۴

سے ساتھ اس سے کام لیتا ہے، اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اس کے لئے ہے جو فخر اور نمائش کے لئے باندھتا ہے۔[1]

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے، اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے، اور جس کو سُن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے، حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لئے اتریگا اور ہر امت اپنی جگہ پر گھٹنے ٹیکے ہوگی، اس وقت سب سے پہلے اُن کی پیشی کا حکم ہوگا جو قرآن کے عالم تھے، اور جو جہاد میں مارے گئے تھے، اور جو دولت والے تھے، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا، جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا تو تم نے اس پر کیا عمل کیا، ؟ وہ عرض کرے گا، بارالہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا، خدا فرمائے گا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہیں گے، یہ جھوٹا ہے، پھر خدا فرمائے گا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا کہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا، عرض کرے گا کیوں نہیں اے میرے رب! دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟ جواب دیگا، میں اہلِ استحقاق کا حق

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ۔

ادا کرتا تھا، اور خیرات دیتا تھا، ارشاد ہوگا، تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہین گے یہ جھوٹا ہے پھر خدا فرمائے گا تو تو اس لئے یہ کرتا تھا تا کہ لوگ کہین کہ تو بڑا سخی ہے تو یہ تجھ کو دنیا مین کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائے گا، جو جہاد مین مارا گیا، تو خدا اس سے دریافت کرے گا تو کس بات کے لئے مارا گیا، کہے گا خدایا تو نے اپنی راہ مین جہاد کا حکم دیا تھا، تو مین لڑا یہانتک کہ مارا گیا، خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، فرشتے بھی کہین گے یہ جھوٹا ہے، خدا کہے گا تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہین تو دنیا مین تجھ کو یہ کہا جا چکا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہین جو سب سے پہلے جہنم مین ڈالے جائین گے،[1]

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے! اور اس حدیث کی تائید مین قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق
وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ	چاہتا ہو، تو ہم اس کا عمل اسی دنیا مین
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ،	پورا کر دین گے، بے کم و کاست، ان
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ	لوگون کا آخرت مین کوئی حصہ نہین،
فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ	مگر دوزخ، اس دنیا مین انھون نے
مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا	جو بنایا، وہ مٹ گیا، اور جو کیا وہ
يَعْمَلُوْنَ، (ھود - ۲)	برباد گیا،

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ،

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے، اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے، بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے، جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں، بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ ۔ ۳۷)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے، مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر،
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (رعد ۔ ۳)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لئے صبر کیا،
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ (لیل)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لئے کرتا ہے،

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:-

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم ۔ ۴)	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا، اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں، اور وہی کامیاب ہیں،

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی

جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے نفس بنیادی اصول سے چلتا ہے، توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے جس میں کسی اصول اور غرض وغایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی۔ انجیل میں لفظی مناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں، مگر ان کی بنیاد صد درجہ کمزور ہے، ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے، یا گناہوں سے داغدار ہے، عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا تاثیر خمیر ہے، کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوا، گناہ گار تھے، اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے جس سے بچنا انسان کے لئے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے، تو وہ گناہگار مرا، اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا، بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائیگا کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی،

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے، اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا پھر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰى یعنی خدا کا اعتراف، ہر انسان روز ازل کر چکا ہے، اس لیے اس دنیا میں اگر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا

اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لئے کافی ہے، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زرّین حروف لکھے ہیں، وہ اپنے بزش و تیز کے بعد یا اُن کو اُبھار کر چمکا دیتا ہے، یا مٹا ڈالتا ہے، فرمایا:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التّین)	ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی راستی پر پیدا کیا،

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے، دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ (انفطار-۱)	جس خدا نے تجھ کو بنایا، پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا،

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا ہے، اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا، بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی، اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے، دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے، سورۂ اعلیٰ میں ہے،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى،
الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی، وَالَّذِیْ
قَدَّرَ فَهَدٰی،
(اعلیٰ - ۱)

اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان
کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا، اور
جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا،
پھر راہ دکھائی،

راہ دکھانا یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اُس نے اُسی طرح ودیعت رکھا ہے، جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے،

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا، اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ
اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝
(دہر - ۱)

ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے
سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر
کر دیا، اس کو سنتا دیکھتا، ہم نے
اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار
(نیکو کار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکو کار یا بدکردار، اچھا یا بُرا ہو جانا خود اُس کا کام ہے سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا
فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے
کی، پھر ہم نے اس کو الہام کر دیا (یا

مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا،	سوجھا دیا، اس کی نیکی اور بدی، تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف رکھا، اور ناکام ہوا، وہ جس نے اوس کو مٹی مین ملادیا (گندہ کر دیا)
(شمس - ۱)	

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے رو سے انسانی فطرت کو پیدایش کے ساتھ ہی گنہگار اور عصیان کا رہین قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس کی اصلی فطرت مین ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہی اسی لئے یہ کہا گیا،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ،	سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اُس نے لوگون کو پیدا کیا، خدا کے بنائے مین بدلنا نہین، یہی سیدھا دین ہے، لیکن بہت لوگ نہین جانتے،
(روم - ۴)	

یہ دینِ فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہین جن کی بنیادی چیز توحید ہے؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر مین فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے مان باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہین، جس طرح ہر جانور کا بچہ؛ صل

مین صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے، وہ کن کٹا نہین پیدا ہوتا[1] اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے، وحیِ محمدیؐ نے اسی مسئلہ کو ایک ادا ازلی مکالمہ کی صورت مین بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا مین تمہارا پروردگار نہین ؟ انھون نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا، بَلٰی ہان بیشک تو ہمارا پروردگار ہے "یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے، اور کہا ہے کہ "دیکھو شیطان نے تمھارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے مین نہ آؤ"

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت مین معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے، وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہین لاتا، قرآن کا فیصلہ یہ ہی کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر - ۳)	اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہین اٹھاتا،
كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (طور - ۱)	ہر نفس اپنے ہی عمل مین گروی ہے،

اور اسی کی تفسیر مین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

الا لا يجني جانٍ على ولده	ہان باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہین
ولا مولودٌ على والده[2]	اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ،

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان، [2] سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر،

اسی طرح اُن مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے، انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار، اور داغدار ٹھرایا ہے انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھدیا ہے،اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا، اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتاکر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے، یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے،

اب غور کیجیے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ، اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لئے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے، اسی کا نتیجہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے، آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے، فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لئے اٹھا دیا گیا، جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے"[۱]

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھاگئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں، آپ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے بچے بچپن میں مرگئے، وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے، اور اُن کو جنت میں لے جائیں گے"[۲] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے شیرخوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی، تو فرمایا "یہ جنت میں جاکر جنتی دایوں کا دودھ پئے گا"[۳]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الطلاق، و ترمذی فی من لایجب علیہ الحد [۲] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد [۳] ابن ماجہ کتاب الجنائز،

اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوّن کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہان رہین گے، فرمایا خدا کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے[1] لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی، ایک دفعہ رویا مین حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنت مین بیٹھے ہین، اور ان کے چارون طرف کمسن بچوّن کا ہجوم تھا، فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے، جو دین فطرت پر مرگئے، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکون کے بچے، فرمایا اور مشرکون کے بچے بھی[2] ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی مین مرجانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہہ اُٹھتے تھے، لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لئے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہدینا آپ نے مناسب نہین سمجھا، ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مرگیا تھا، اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، یا رسول اللہ! اس کو مبارک ہو، جنت کی چڑیون مین سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا، نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا، فرمایا، اے عائشہ! اللہ تعالی نے جنت کے لئے کچھ لوگ پیدا کئے ہین، اور جہنم کے لئے کچھ لوگ[3] ایک طرف عیسائیت ہے، جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچوّن کو جہنم مین جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے، جو اُن کے لئے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اُن کے لئے جنازہ کی نماز مین یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے، "خداوندا! اس کو میرے لئے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ مین مقبول ہو" احادیث مین ایسے موقعون پر جب

---

[1] صحیح مسلم کتاب القدر، [2] صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح [3] یہ حدیثین صحیح مسلم کتاب القدر مین ہین نیز امام نووی کی شرح مسلم مین بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد جلد ۲ ص ۳۳۰ و ۳۳۲، نولکشور،

کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہو کہ وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اُس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے[۱]"

خوف و رجا

اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گذرے ہیں، ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نااُمیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کو دنیا تمامتر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش و آرام، اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو، اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو، اور خوش رہو، اور کل کے غم کی فکر نہ کرو، اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں، پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قویٰ سرد ہو کر رہ جاتے ہیں، اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا، اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے، اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی، اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کی بیچ سے نکلی ہے، وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے، کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو، اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا، وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم

[۱] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا وصحیح بخاری ومسلم ترمذی کتاب الحج،

کرتا ہے، اُس کی شریعت میں خدا سے نا اُمیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو شکل سے مشکل اوقات میں بھی نا امید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا، قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا،

فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ (حجر-۴) | (ابراہیم) نا امیدوں میں سے نہ بن،

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی،

وَلَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ | اور اللہ کے فیض سے نا اُمید مت ہو،

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ | اللہ کے فیض سے نا امید وہی ہیں جو

إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف-۱۰) | خدا کے منکر ہیں،

اس اُمت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے،

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ | اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی

أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ | جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت

اللَّهِ (زمر-۶) | سے نا امید مت ہو،

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پُر اُمید رہنے کی تاکید کی ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں[1] یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے، وہی اُس کے لئے ہو جاتا ہوں، اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے،

---

[1] جامع ترمذی کتاب الزہد باب فی حسن الظن باللہ تعالیٰ،

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ	بھلا ایک وہ جو بندگی مین لگا ہے،
سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ	رات کی گھڑیون مین سجدہ کرتا ہے،
وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ	اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا
(زمر - ۱)	ہے، اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے

یعنی اُس کے دل مین یہ دونون کیفیتین یکجا ہین، گناہون اور تقصیرون کے مواخذہ اور بازپرس کا ڈر بھی ہے، اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے، خدا کے غضب سے ڈرنا، اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے، یہ ڈر اُس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہین ہونے دیتا، اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہین ہونے دیتی، اسی لئے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہلِ ایمان سے کہتا ہے،

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۚ	اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافرون
(نساء - ۱۵)	کو نہین،

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم مین ایک مومن اور کافر کے دل مین پیدا ہوتا ہے، کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہان ہے، اور جب وہ اس کو نہین پاتا، تو دل شکستہ ہوجاتا ہے، وہ کامیابی صرف مادّی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے، اور جب وہ نہین ملتی، تو افسردہ ہوجاتا ہے لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیاوی مادّی کامیابی سے ہم آغوش نہین بھی ہوتا، تب بھی اس کا دل شادان اور فرحان رہتا ہے،

کہ اُس نے نیکی کا کام کیا، اور بہر حال اس نیکی کا یہاں نہین تو وہان معاوضہ ضرور ملے گا، اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا، اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانون کو ہر نیک کام مین جری اور بہادر بنا دیا ہے، اور اُن کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قومون مین ناکامی اور نااُمیدی کی خودکشیون کا عام طور سے رواج ہے، ہندوستان مین ہندو عورتون کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات مین پڑھے جاتے ہین، یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکون مین ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے، جس وقت یہ سطرین لکھ رہا ہون وارسا (پولینڈ) مین ناکام نوجوان لڑکیون کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبرین اخبارون مین چھپ رہی ہین، مگر کسی مسلمان مین اخیر سے اخیر لحمہ مین بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا، اور خدا کے فضل و کرم سے اُس کی آس نہین ٹوٹتی۔ امیر ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولت مند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت مین وہ پُر امید رہتا ہے، مشکلات مین، بیماریون مین، محتاجیون مین، ناکامیون مین، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونون اس کے مذہب مین ایک ہین، اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہان نہین تو وہان ضرور ملے گا کہ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ	مین تم مین سے کسی کام کرنے والے

مِّنكُمْ (آلِ عمران - ۲۰) کے کام کو ضائع نہین کرتا،

اخلاق اور رہبانیت

اخلاق درحقیقت انسانون کے باہمی تعلقات مین خوش نیتی، اور اچھائی برتنے کا نام ہے، یا یون کہئے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہین اُن کو ادا کرنے کو کہتے ہین، اخلاق کی اس حقیقت ہی سے واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کیلئے باہم انسانون مین تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے، جو رہبانیت، تجرّد اور جوگی پن مین نہین پائی جاتی ہے، اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علٰحدگی، اہل وعیال، عزیز وقریب اور دوست واحباب کے تعلقات سے آزادی اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے، یا کم کردیتی ہے،

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لئے ہے کہ خلق سے قطعِ تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب مین اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے، اور وہ خود اور اُن کے عقیدتمند بھی اس کو اُن کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے، لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد اور جماعتون نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لئے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظرون سے چھپا کر بادشاہون کی طرح اپنے رعب واثر کو نمایان کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصوّر کرانے مین مدد ملے، اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کرسکین، اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل وعیال

اعزہ و اقارب، دوست واحباب اور قوم وملت کے فرائض وحقوق بجالانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لئے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق مین راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہین کی ہے، نبوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی مین رہ کر اور تمامتر انسانی جدوجہد مین شریک ہو کر گذاری ہے، یہی طرزِ عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہؓ کا تھا، اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد، اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، تنہائی، خلوت نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے لئے ایک اشارہ بھی پورے قرآن مین موجود نہین ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتون کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہین، اُن سے ہٹ کر نہین، وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ مین گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہین، کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہین،؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا خاص فرض انجام دیتے ہین؟ کیا وہ غریبون کا سہارا بنتے ہین؟ کیا وہ یتیمون کے سرپرست ہین؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہین،؟ کیا وہ لوگون کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہین؟ کیا وہ اپنے دست وبازو سے اپنی روزی کماتے ہین؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور جہاد جیسے فریضون سے عہدہ برآ ہین، حالانکہ اخلاقی عبادتون کے یہی بہترین مواقع ہین، اسی لئے اسلام کی نظر مین نجات طلبی کا عمومًا یہ مستحسن طریقہ نہین، قرآن پاک مین ہے،

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم-۱)	تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ،

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں، بلکہ اپنے ساتھ دوسرون کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانون کو خطاب کرکے فرمایا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم مین سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے، اور اس سے اوس کی ذمہ داری اور نگرانی مین آئے ہوئے لوگون کی نسبت پوچھا جائے گا امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے[1]۔

جماعتی مصیبتین جب آتی ہین تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہین چھوڑتین، یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اسی لئے وحی محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا، اور کہا،

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (انفال ۳)	اور اس فساد سے بچو جو جن کہ صرف گنہگارون ہی پر نہین پڑے گا،

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے، چنانچہ قرآن پاک مین اصحاب سبت کے قصہ مین ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگارون

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا، ص ۷۸۳۔

ہی میں شامل کیا ہے،

دنیا درحقیقت جد وجہد اور دار وگیر کا ایک میدان ہے، جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف وآرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے، اسی لئے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے، اپنا صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے،

ان المسلم الذی یخالط	وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا
الناس ویصبر علی اذاھم	ہے، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا
افضل من الذی لا یخالط	ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے
الناس ولا یصبر علی	نہیں ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر
اذاھم ؎	نہیں کرتا،

گوشہ گیری اور جماعت سے علحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے، اور فتنہ وفساد کے شعلے اتنے بھڑک اٹھے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے، تو اسے

؎ شعب الایمان بیہقی وجامع ترمذی، کتاب الزہد ص ۷۰۳،

وقت مین وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے مین نہ پائین، وہ مجمع سے الگ ہو جائین، فتنہ مین عزلت نشینی کی حدیثین اسی موقع سے تعلق رکھتی ہین، ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت مین تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کرکے جماعت کے بچانے مین پوری کوشش صرف کردے یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا مین پیش کر دیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ مین اسی کی پیروی کی،

آپ نے فرمایا کہ بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے بُرا سمجھے، اور یہ سب سے کمزور ایمان[1] ہے"

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیش نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ مین جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے، اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتون کے لئے کہنا اور بری باتون سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانون کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ — تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگون

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان،

لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کے لئے باہر لائی گئی، اچھی بات کا حکم
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران)	دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو،
يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ	وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہین اور
عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)	بری بات سے باز رکھتے ہین،

پھر خاص طور سے حکم ہوا،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ	اچھی بات کا حکم دے اور بری بات
الْمُنْكَرِ (لقمان - ۲)	سے روک،

مسلمانون کی تصویر یہ ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا	اور وہ آپس مین سچائی اور ثباتِ قدم
بِالصَّبْرِ (العصر)	کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہین
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا	اور آپس مین ثابت قدم رہنے اور مہربانی
بِالْمَرْحَمَةِ،	کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت
(بلد - ۱)	کرتے ہین،

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب مین اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایان کرتی ہے، اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہین،

توراۃ مین قابیل کا یہ فقرہ کہ کیا مین اپنے بھائی کا رکھوالا ہون؟[a] عیسائی مذہب کے

[a] سفر تکوین ۴-۹

اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام "شخصی آزادی کی بحالی" ہے لیکن اسلام کے قانون مین اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گذرا کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم مین ہر شخص نگہبان ہے۔ اور تم مین ہر شخص سے اُس کے زیر ذمہ داری لوگون کی نسبت بازپرس ہوگی" قرآن پاک مین صراحت کے ساتھ لوگون کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانون پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگون کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے۔ اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی مین لانے کا ذمہ دار ٹھہرے،

قرآن پاک مین اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے بنی اسرائیل کے لئے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا، بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی، وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی، اس موقع پر اس آبادی مین تین گروہ ہو گئے، ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے اُن کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور اُس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل مین شریک نہ تھا، لیکن اُن کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہین کرتا تھا، بلکہ خود سمجھانے والون سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگون کو سمجھانے سے کیا فائدہ؟ جن کو اللہ تعالیٰ اُن کے اُس جرم کی پاداش مین ہلاک کرنے والا ہے لیکن اُن پر عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا

گروہ بچ گیا، جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا، بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت، اور دوسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے، سورہ اعراف کے بیسوین رکوع مین یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر مین ہے،

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ	اور جب ان مین سے ایک فرقہ بولا
تَعِظُونَ قَوْمًا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ	کہ تم کیون ایسے لوگون کو نصیحت
أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا	کرتے ہو، جن کو خدا برباد کرنے والا
قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ	یا سزا دینے والا ہے، انھون نے
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا	جواب دیا کہ ہم تمھارے رب کے
نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا	آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لئے
الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ	اُن کو نصیحت کرتے ہین، اور شاید
وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا	کہ یہ نیک بن جائین، تو جب وہ
بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا	بھول گئے، جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو
يَفْسُقُونَ،	ہم نے اُن کو جو منع کرتے تھے بچا لیا،
(اعراف - ۲۱)	اور گنہگاروں کو ان کی بے حکمی کے
	سبب بڑے عذاب مین پکڑا،

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر مین اپنے دوسرے بھائیون کو گرنے سے بچانا، اور گرتون کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے! اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا

ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے، جیسا وہ اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں، اور اس کا کیا، بلکہ خود رسولؐ کا بھی یہ فرض نہیں فرمایا،

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ
(مائدہ ۱۳ و نور ۷)

رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے،

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لئے سورۂ مائدہ میں فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ
(مائدہ ۱۴-۱۴)

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے، تم اگر سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا،

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس آیت پاک کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے، کہ اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں[۱]، ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے، تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی

دریافت کئے تو فرمایا کہ نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو، اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو،
لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے، اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے، اور دنیا
کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے، تو اس وقت عوام
کو چھوڑ کر اپنی خبر لو، کہ تمھارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو
ہاتھ سے پکڑنا ہے۔[1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں"
منسوخ کردیا، واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں
رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی، قوموں کے رسوم وآداب اور ایٹیکیٹس اسی اصول
پر قائم ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیوٹ اور نجی باتیں
معلوم ہوتی ہیں جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے، مگر ذرا گہری
نظر سے دیکھئے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے
ہیں، ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہونچتا ہے، اور
اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے، دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام
نہ کی جائے، تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہوکر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک
معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں، اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی
مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے، اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر (مائدہ) میں ہیں، ص ۲۴۸ و ۲۴۹۔

مزاج فاسد ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے، ترمذی مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہؓ کی مجلس مین فرمایا کہ بنی اسرائیل مین اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب اُن مین بُرائی پھیلنے لگی، تو پہلے تو اُن کے علمار نے منع کیا، لیکن جب وہ نہ رُکے تو وہ اُن کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے، صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت اُن پر لعنت کی، اس کے بعد آپ سنبھل کر بیٹھ گئے، اور فرمایا نہین جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو، اور اس کو حق پر نہ جھکا دو۔[۱]

یہ ہے اس باب مین محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم!

اس کے چند شرائط | لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہین ہے، کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دے گا، یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیون سے بچا ہے، قرآن نے کہا،

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ ‎(بقرہ - ۵)

کیا تم دوسرون کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو،

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے، خود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا گیا،

أُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی

[۱] جامع ترمذی تفسیر مائدہ،

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل ۱۶) — سے اور اچھی نصیحت سے بلا،

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا،

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ ۲) — تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی،

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (نساء ۹) — اور تو ان کو نصیحت کر، اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات!

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لئے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے، اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے،

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے، اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے حکمانہ انتظامات جن کے لئے تنفیذی قوت درکار ہی صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لئے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے،

تجسس اور غیبت کی ممانعت یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے، اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے، کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ

ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا، لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے، اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا، اس لئے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے، جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے لیکن اگر لوگ اسکو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اُس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے، اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اُس کی علّت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے، کہ انما الاذن لاجل الرؤیۃ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لئے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے،

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی بُرائی اُس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ اُس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو، اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اُس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے چنانچہ وحیِ محمدی نے اسی لئے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا،

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اجْتَنِبُوْا	اے ایمان والو بہت سارے گمانوں
كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	سے بچتے رہو کہ بیشک بعض گمان گناہ
اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ	ہے اور نہ کسی کا اندر کا بھید ٹٹولا کرو اور
بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ	نہ پیچھے کسی کو برا کہو، بھلا تم میں سے
اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا	کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ
فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ	بھائی کا گوشت کھائے، ہو سو تم کو گھن
اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ	آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف
(حجرات - ۲)	کرنے والا مہربان ہے۔

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا، کہ جس طرح مردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں برا کہہ رہے ہو اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا، اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لئے اختیار کی گئی ہے، کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ اُس شخص کی جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہوسکتی ہے، اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کی شان ایمان کے شایان نہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی

وہ لگاتے پھرو گے تو اُن کو برباد کردو گے"

غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں،

| توسط اور اعتدال |

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا، اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کررہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا،

عدل وانصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے، اور احسان ونرمی ولاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے، اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[1]، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے، اُن کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[2]، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لئے عدل وانصاف کے جو اصول قائم کردئیے تھے، اُس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:-

[1] یہود کی سنگدلی کے سبب سے [2] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لئے۔

تم نے سُنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت[1] لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بُرائی کا بُرائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے، اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو، جو شخص لڑانے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑلے، اس کو چادر بھی دیدو، جو شخص تم کو ایک میل تک بیگار میں پکڑلے جائے اُس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ، جو تم سے مانگے، اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے، اُس کو واپس نہ کرو،

تم نے یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو" (متی باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا، جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے سُن رہی تھی، وہ سراسر اخلاق، رحمت، اور احسان تھا لیکن اسلام نے عدل واحسان دونوں میں امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کردیا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ، (نحل-۱۳)	بے شبہ خدا، عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے،

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعت موسوی، وعیسوی کی دو الگ الگ

[1] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے،

خصوصیتون کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل اور احسان

"عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لئے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے، عدل کے معنی برابر کے ہین، جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے، اُس کے ساتھ اتنی ہی بُرائی کی جائے، یہ عدل ہے، اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے۔ اسلام مین ان دونون کے الگ الگ مراتب ہین، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ مین اُس نے دیا ہے، یہ کسی ایک شخص کا کام نہین ہے، اور احسان ہر شخص کے ہاتھ مین ہے، اور یہ محض شخصی معاملہ ہے، قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے، اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے، اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے، اس لئے قانون کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ مین پیش کر کے ہمیشہ کے لئے تورات کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لئے قابلِ عمل نہین رہا، خود عیسائی سلطنتون کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہین رہ سکا، اور نہ بُرائیون کی روک تھام ہو سکی،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اُس شخص کا نہین ہوتا، بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر

اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے، اس لئے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہین ہے، کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کرکے جماعت کے ہزارون لاکھون افراد کے ساتھ گویا بُرائی کا ارتکاب کر رہا ہے، اس لئے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے مین بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے، جو شریعتِ محمدیؐ مین پوری طرح برتی گئی ہے، کیونکہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی،

پھر سب لوگ دنیا مین ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہین ہوئے، بعض نیک نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہین، جن کے لئے معاف کر دینا درگذر کرنا، اور بدلہ نہ لینا آسان ہے، اور بعض غصہ ور سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوئے ہین، جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لئے بغیر چین نہین لے سکتے، اُن کے لئے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے اُن کو روک دیا جائے، اور بُرائی بُرائی کے بقدر کے اصول پر عمل کرنے کے لئے اُن کو رضامند کر لیا جائے، اس لئے ایک عالمگیر شریعت کے لئے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لئے آئی ہو، عدل اور احسان دونون اصولون کی جامعیت کی ضرورت تھی،

قانون اور اخلاق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظون مین یہ ہے کہ دنیا مین امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بُرائیون کے انسداد کے لئے دو چیزین ہین، قانون اور اخلاق، اور گو ان دونون کا منشا، ایک ہی ہے، مگر ان کے

منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے، جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے، قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے، مگر دل میں اُس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا، جو انسانیت کی جان ہے، اور اخلاق پر عمل کرنے کے لئے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا تورات محض قانون ہے، اور انجیل محض اخلاق، اسی لئے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنۂ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی کامل شریعت لیکر آئے، جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کو جامع ہے،

اس جامعیت کا اصول شریعتِ محمدیؐ میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ اُس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی، اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کرکے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرکے ہر ایک کی حد مقرر کر دی، اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا،

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہ راست دوسروں تک پہونچتا ہے قانون کے تحت میں رکھا، مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا، چنانچہ ان جرائم کیلئے قرآن نے

سزا مقرر کی ہے، جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جا سکتی ہے، اور جو باتین ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھین، اُن کو اخلاق کے دائرہ مین رکھا، مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبون کی امداد وغیرہ، اس طرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونون کا مجموعہ ہے،

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اُس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے، کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے، بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے، اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانونِ انتظام وعدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونون کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے، اور اس لئے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشو و نما کی پوری طرح متکفل ہے، وہ عدل وانصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے، اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگون کی روحانی تکمیل مین بھی کسی طرح حارج نہین، وہ نہ یہودیون کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے، اور نہ عیسائیون کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے، بلکہ وہ جسم وجان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے،

عفو اور انتقام موسویؑ، عیسویؑ اور محمدیؐ اخلاقی تعلیمات مین باہم جو باریک فرق ہے، وہ اسی قانون اور اخلاق کی علٰحدگی، اور ترکیب کا نتیجہ ہے، اسلامی قوانین کو پیشِ نظر رکھکر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم مین اخلاقی روح نہین، لیکن اگر وہ

قانونِ محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدیؐ کو بھی سامنے رکھئے تو اُن کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ واضح ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے، اُس کا حکم ہے،

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا ... ... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت" (احبار ۲۴-۱۷، خروج ۲۱: ۱۲، گنتی ۳۰-۳۱، استثناء ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے، اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے:

"تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے دہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے" (متی ۵-۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک نے اس روحانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی، وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے، عدل قانون ہے، اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کئے گئے ہیں، اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے،

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ — اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں

عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (بقرہ ۔ ۲۲)	برابری کے بدلے کا حکم ہوا، آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت،

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا، اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (بقرہ ۔ ۲۲)	تو اگر اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا، تو دستور کے مطابق اُس کی پیروی کرنا، اور نیکی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے، یہ تمھارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی، تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس معافی یا خونبہا لینے کے بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لئے دکھ کی سزا ہے،

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے باوجود اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خونبہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی، اس لئے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا، اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد

ولائی گئی، اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خونبہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے،

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ	اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ	حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ
الْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ	کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،
بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ لا	دانت کے بدلے دانت، اور زخموں
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ	میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا
تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ	تو وہ اس کے لئے کفارہ ہے، اور
لَّهٗ ط وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ	جس نے خدا کے اتارے ہوئے
اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی
وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى	ظالم ہیں، اور ہم نے بنی اسرائیل کے
ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا	ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے
بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ	عیسیٰ کو بھیجا، جو اپنے آگے کی کتاب
وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ	توراۃ کی تصدیق کرتا تھا، اور اس کو
هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا	انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَ — اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق
هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ، — کرتی ہے، اور جو پرہیزگاروں کے لئے
(مائدہ ۷-) — ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲- یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے، مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے، فرمایا،

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ — اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی
اَمْوَالِكُمْ ، (بقرہ ۳۸-) — حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا،

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ — اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اُس کو
اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا — اُس وقت تک مہلت ہے جبتک
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ — اس کو کشایش ہو اور بالکل معاف
(بقرہ ۳۸-) — کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے، فرمایا،-

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ — اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ — دی گئی ہو، اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنیوالوں
لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ، (نحل ۱۶) — کے لیے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ	اور وہ لوگ کہ جب اُن پر چڑھائی ہو
هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ	تب وہ بدلہ لیتے ہین، اور بُرائی کا بدلہ
سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ	ویسی ہی بُرائی ہے، تو اگر معاف کردیا
اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ	اور نیکی کی، تو اس کا ثواب دینا خدا
لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (شوریٰ)	پر ہے، وہ ظالمون کو پیار نہین کرتا،

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ازخود کسی پر ظلم کرنے مین پہل اور سبقت نہ کرین لیکن اگر کوئی اُن پر ظلم کرے، تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہین جتنا اُن پر کیا گیا، کیونکہ قانون یہی ہے کہ بُرائی کا بدلہ اتنی ہی بُرائی ہے، جیسا کہ توراۃ مین بیان ہوا ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کردے، اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس بُرائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے، (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملیگا، اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے،

الغرض عفو اور انتقام مین سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے، اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو، تو جماعت کا نظام قائم نہین رہ سکتا، اور نہ ملک مین امن و امان رہ سکتا ہے، اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو بُرائیون سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی، اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے، حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے، اس لئے ان مین سے کسی

ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا، نظام ہستی کو ادھار کھنا اور آدھا مٹا دیتا ہے،
اس لئے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے جس کی نظر انسانی ہستی کے
پورے نظام پر ہے، اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں ڈ
اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجرار میں کوئی رحم نہ کیا جائے، اور نہ اس میں بڑے
چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام
قائم رہے، دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ بتایا، تاکہ اشخاص
کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے،

جماعتی انتظامات کے قیام کے لئے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجرار کے
وقت حکم ہوتا ہے،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي	اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں
دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ	گنہگاروں پر ترس نہ آئے، اگر تم کو خدا
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (نور-۱)	پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے، اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں
زیادہ سخت ہوگی، اس لئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنی گنہگار
بھائی پر احسان کرنا ہے، اس لئے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کیجائے،

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ
حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی تو

قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے، اور اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین سفارشین پہنچائی گئین، تو فرمایا: "اے لوگو! تم سے پہلی قومین اسی لئے ہلاک ہوئین کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا، تو اُس کو چھوڑ دیتے تھے، اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا، تو اس کو سزا دیتے، خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ کی بھی چوری کرتی تو مین اس کے بھی ہاتھ کاٹتا[۱]"

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہین لیا، الا یہ کہ اُس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے[۲]، تو اس کو قانوناً سزا ملی ہو، یہ عمل تھا، تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہین کہ مین نے آپ کی خدمت مین قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہین دیکھا، لیکن یہ کہ اُس مین آپ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا، یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت زر تاوان[۳] یا خونبہا لے کر معاف کر دینے کو فرمایا، معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہؓ سے فرمایا "آپس مین گناہون کو معاف کر دیا کرو، لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضرور ہو جائیگی[۴]" یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلون پر قائم رہے، چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے، ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی، وہ پکڑا گیا، اور عدالت نبوی مین پیش کیا گیا، آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جن صاحب کی چادر تھی، انھون نے اگر

---

[۱] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ [۲] ایضاً کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ [۳] ابوداؤد و نسائی کتاب الدیات [۴]

عرض کی کہ یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائیگا؟ مین یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کردیتا ہون؛ فرمایا کہ میرے پاس لانے سے پہلے کیون نہین یہ کرلیا؟[1]

یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدیؐ، موجودہ سلطنتون کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام مین اس سے بھی زیادہ وسیع ہے،

عفو و درگذر کی تعلیم اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے، لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے، سب کو معلوم ہے کہ اسلام مین شرک و بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے، اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے، جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے؛ تاہم مسلمانون کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ تم مشرکون کے بتون کو برا بھلا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ وہ چڑھ مین تمھارے خدا کو برا کہنے لگین؛

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ	پکارتے ہین، ان کو برا نہ کہو

[1] ابوداود کتاب الحدود

عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ہ — کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ

(انعام - ۱۳) — بُرا کہنے لگیں،

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے، پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوج پر صبر کرو، اور اُن کو معاف کرو، اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانون کو ہو رہا ہے،

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ — معاف کرنے کی خو کپڑ، اور نیک کام

أَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ وَإِمَّا — کو کہہ، اور جاہلون سے کنارہ کر، اور

يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ — اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھارے

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ — (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ

(اعراف - ۲۴) — وہ ہے سنتا جانتا،

سکون کی حالت مین عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ مین بھی بے قابو نہ ہونے پائے، صحابہؓ کی تعریف مین فرمایا:

وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ — اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف

(شوریٰ - ۴) — کر دیتے ہین،

نیکو کارون کی تعریف مین ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے،

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ — اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگون

عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ — کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے

الْمُحْسِنِیْنَ ، (آل عمران ۱۴) — کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بڑی بلند ہمتی کا کام ہے فرمایا:-

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ — اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف

لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ ۴) — کیا تو وہ بیشک ہمت کے کام ہیں،

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدی نے اپنے الفاظ میں عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاء اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے فرمایا،

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ — اور برداشت کر جس طرح ہمت اور

مِنَ الرُّسُلِ ، (احقاف ۴) — عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا،

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے، فرمایا،

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ — اچھی بات بتا اور بری بات سے روک

الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ — اور جو تجھ پر پڑے، اس کو سہار لے کہ یہ

اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان ۲) — ہمت کے کام ہیں،

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے، فرمایا:-

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ	اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ اختیار کرو، تو
ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آلِ عمران ۱۹)	یہ بڑی ہمت کے کام ہیں،

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت، اور اخلاقی بہادری کا کام، بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے، اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھیے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ	(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ کہ
لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ،	اُن کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے
(جاثیہ - ۲)	معاف کریں،

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ وہی ہیں جو کافر و مشرک ہیں، اب دیکھیے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے، اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اُن کو معاف کریں، اور ان کی خطاؤں سے درگذر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے۔؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر اُن کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے،

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ	اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو
اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ	یا چھپا کر کرو، یا کسی برائی کو معاف کرو

كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ، (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا

(نساء - ۲۱) معاف کرنے والا قدرت والا ہے،

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہئے، اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے، کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے، تو انسان جس کی قدرت محدود ہے، اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہئے اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے،

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ اور چاہیئے کہ معاف کریں اور درگذر

أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو

غَفُورٌ رَّحِيمٌ (نور - ۳) معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے؛

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو، تو اللہ تم کو معاف کرے گا، اس میں عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے،

برائی کی جگہ نیکی

عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے فرمایا۔

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا	بہتری سے دے، پھر دیکھ کہ وہ جس کے
الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ	اور تیرے درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا
كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، وَمَا يُلَقّٰهَآ	ہو جائیگا، جیسا ناطے وار دوست، اور
اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا	یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت
يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	(صبر) رکھتے ہیں، اور جس کی بڑی
(حٰمٓ السجدہ ۵-۵)	قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، پھر دوسری جگہ فرمایا، مشرکون اور کافرون کے طعنون کا برا نہ مانو، کیونکہ دینی معاملہ مین بھی غصہ سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے اگر ایسا موقع پیش آئے، تو خدا سے دعا مانگنی چاہئے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچائے اور غصہ سے محفوظ رکھے،

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ	مشرکون کی برائی کا جواب بھلائی سے دے
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ وَقُلْ	ہم جانتے ہین جو وہ کہتے ہین، اور کہہ کہ اے
رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ	میرے پروردگار مین شیطانون کی چھیڑ سے
الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ	تیری پناہ چاہتا ہون، اور اے رب! مین
اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (مومنون-۲)	تجھ سے پناہ مانگتا ہون کہ وہ میرے پاس آئین

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے، اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے، مگر تمام مذکورۂ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے، فرمایا

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَ
الَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ
رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ
اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ
عَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ
السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ
جَنّٰتُ عَدْنٍ ط
(رعد - ۳)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے
جوڑنے کا حکم اُن کو اللہ نے دیا ہے
(یعنی ایک دوسرے کا حق،) اور اپنے
رب سے ڈرتے ہیں، اور حساب کے
بُرے انجام سے خوف کھاتے ہیں، اور
جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لئے صبر
کرتے ہیں، اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم
نے اُن کو جو روزی دی اس میں سے چھپے
اور کھلے خیرات کرتے ہیں، اور بُرائی کے
بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کیلئے ہے پچھلا

اُن سے کہا جائے گا،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ
فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ؕ (رعد ۳)

تم پر سلامتی ہو اُس کے بدلے میں کہ تم
نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر،

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارتِ غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور

نہ خوف خدا کا، صرف ایک صبر کی جزار کی خوشخبری ہے، علاوہ ازین اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے اہم فرائض کے پہلو بہپلو اس کا بھی ذکر کیا جائے ایک اور آیت مین نومسلم یہودیون کو اپنے برخلاف اپنی ہم قومون سے جو دلآزار فقرے، اور اعتراضات سننے پڑتے ہین، اور وہ اس پر صبر کرتے ہین اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہین،

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ	وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا
بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ	پائین گے، اور وہ برائی کا جواب بھلائی
السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ	سے دیتے ہین اور ہمارا دیا کچھ خیرات
وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ	کرتے ہین، اور جب کوئی لغو بات سنتے
وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ	ہین تو اس سے درگذر کر لیتے ہین اور
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ	کہہ دیتے ہین، کہ ہمارے لئے ہمارے کام
(قصص ۔ ۲)	ہین، اور تمھارے لئے تمھارے کام بھلا مت
	(ہو ہم کو بے سمجھون سے مطلب نہین)

ان آیتون کے آخری ٹکڑے پر غور کیجئے، نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہین، اور درگذر کرتے ہین، بلکہ ان کے حق مین سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہین،

صحیح بخاری مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ

نہیں ہے، جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو۔[1]

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں، مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں، اور وہ جہالت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو، یعنی نیکی کے لقمہ سے ان کا منہ بند کر رہے ہو، اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی۔[2]

حذیفہؓ کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے، تو ہم بھی کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے نہیں بلکہ اپنے کو پرسکون اور مطمئن رکھو، لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو، اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو۔"[3]

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کاری، معاہدوں، اور پرفریب ہتھکنڈوں سے دھوکا دیا کرتے تھے، ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ	اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ ص ۳۲۳ (ترتیب)

عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ، (مائدہ-۳)

رہتا ہی، تو تو اُن کو معاف کر، اور اُن کے قصوروں سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے،

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصوروں سے درگذر کرنا اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا اُن نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس بات میں کس قدر اہم اور کامل ہے،

اسلام کی اخلاقی تعلیم
کا
تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ مین نظامِ حکومت مین جو ترقیان ہو جاتی ہین، اُن کی وجہ یہ نہین ہوتی کہ تمدن اصول قانون مین کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت مین قانون کے نفاذ مین ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے، جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی اُن کے حدود سے باہر نہین جا سکتا، لیکن وحشت کے زمانہ مین صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے، اور گرد وپیش اور اطراف وجوانب کے حالات پر نظر نہین کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہین ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اُس وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دئے جائین، جو اس جرم مین اعانت کرتے ہین، موقعِ واردات کا

سُراغ دیتے ہین، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہین، وغیرہ وغیرہ، بہرحال تمدّنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح وامتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول وآئین کو نہایت وسیع اور عام کردیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت مین یہ وسعت اور ہمہ گیری نہین پائی جاتی، تمدن کے زمانہ مین انسانی ضروریات مین جو غیر محدود اضافہ ہوجاتا ہے، اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے،

تفصیل اور ہمہ گیری

مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے، اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے، اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ ومقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جاسکتا ہے، مثلاً اصول شریعت مین دنیا کے اکثر مذاہب مین اشتراک واتحاد پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے عقائد مین، اعمال مین عبادات مین، معاملات مین، اخلاق مین، جو چیزین ناجائز اور مصالحِ عامہ کے مخالف تھین، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی، اور جو چیزین جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھین، اُن کی ترغیب دی، لیکن امر ونہی کے طریقے، اور اُن کی جزئیات کے احاطہ مین کمی وبیشی ہے، اور اسی نے ان مذاہب کے احکام وشرائع مین باہم امتیاز پیدا کردیا ہے، اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے، جس سے برائیون کا تمام تر سدباب ہوتا ہے، اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کرلیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی

تعلیم وہ ہے، جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصار کیا ہو، اور عام انسانون کے لئے کھول کر اُن کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو، اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجایش نہ رہے، اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے اُس کا ایک سبب اُس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری، اور انضباط ہے، یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیون کا کلی استیصال ہو گیا ہے، اور نیکیون کے مظاہر عام ہو گئے ہین، اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت ناکمل اور اجمالی تشریح کی ہے،

مثلاً توحید تمام مذاہب کا اُمّ الاصول ہے، لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اُس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہین کی، اس بنا پر ہر مذہب مین شرک کسی نہ کسی صورت مین شامل ہو گیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی، اور عرب کے تمام بُت توڑ دیئے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہین کیا، بلکہ ان تمام چیزون کو ناجائز قرار دیا، جو ان بتون کی یاد کو تازہ کر سکتی تھین، تصویر بجائے خود کوئی بُری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی، اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا، کسی کی مدح مین غلو و اغراق اگرچہ

ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور اُن کے نفوذ و طاقت مین غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے، تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے، اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ مین شرک کی صورت اختیار کر لی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی،

لا تطرونی کما اطرت النصاری	میری شان مین مبالغہ نہ کرو، جس
ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا	طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان
عبداللہ ورسولہ،	مین کیا، مین تو خدا کا بندہ ہون، تو
(بخاری کتاب الانبیاء)	کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول،

یہ ایک کلی حکم تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اُس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا، اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤن کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا، اور کوئی بات سوال وجواب کے لئے باقی نہین رکھی، یہی معنی اس تکمیل کے ہین، جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتون سے فرمائی ہے،

۱- تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

۲- ہر برائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ،

۳- نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل، اور ان کے مواقع کی تحدید،

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پرایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنائی گئی ہے، اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکام عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے، ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر، اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت، اور چوتھا سبت کے دن، آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے، باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں، (دیکھو خروج باب ۲۰)

توراۃ کے اخلاقی احکام

۱- تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے،

۲- تو خون مت کر،

۳- تو زنا مت کر،

۴۔ تو چوری مت کر،

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے،

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اُس کے غلام اور اُس کی لونڈی، اور اُس کے بیل، اور اُس کے گدہے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ مت کر،

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے، اس کے بعد خروج باب ۲۲، اور ۲۳ مین قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتین اور آگئی ہین، یعنی مسافر، بیوہ، اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم، اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، پھر احبار باب ۱۹ مین انھی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے،

۱۔ تم مین سے ہر شخص، اپنی مان اور باپ سے ڈرتا رہے،

۲۔ تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو،

۳۔ تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ،

۴۔ تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے،

۵۔ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے، اندھے کے آگے مت رکھ،

۶۔ تو حکومت مین بے انصافی نہ کر، غریب دامیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر،

۷۔ تو عیب جوؤن کے مانند اپنی قوم مین آیا جایا نہ کر، اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ،

۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل مین نہ رکھ،

۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندون سے بدلہ مت لے، اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ،

۱۰۔ تو اُس کے آگے جس کا سر سفید ہے، اٹھ کھڑا ہو، اور بوڑھے مرد کو عزت دے،

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمھاری زمین پر تمھارے ساتھ سکونت کرے، تم اس کو مت ستاؤ، بلکہ مسافر کو جو تمھارے ساتھ رہتا ہے، ایسا جانو، جیسے وہ جو تم مین پیدا ہوا ہے، بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو،

۱۲۔ تم حکومت کرنے مین، پیمایش کرنے مین، تولنے مین، ناپنے مین بے انصافی نہ کرو،

انجیل کے اخلاقی احکام

انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہین کیا ہے، بلکہ اُن کی تفصیل بھی نہین کی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی، اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی، یہ حقیقت جس طرح احکام مین نظر آتی ہے، اخلاق مین بھی جھلکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفون مین خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھین، اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ مین اُن کے سامنے پیش کیا، اس مشہور اخلاقی وعظ مین بہ ترتیب حسبِ ذیل باتین بیان کی گئی ہین،

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راستبازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگذر، پاکدامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنون کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھارے ساتھ کرین، ایسا تم بھی اُن کے ساتھ کرو،

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انھی لفظون کے ساتھ جو انجیل مین ہین، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفون مین مذکور ہین، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے اُن اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود اُن مین اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا،

اسلام مین اخلاقی احکام کا استقصاء

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہین، اسلئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا، اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہین رکھا گیا، بلکہ تمام قومون اور زمانون تک وسیع کیا گیا، اس لئے تمام قومون اور زمانون مین جو برائیان پائی جاتین، یا پائی جانے والی تھین، اُن سب کو استقصا کرکے منع کیا گیا، اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا، اور اُن کے اصول کی تاکید کی گئی، گذشتہ صحیفون مین جن برائیون سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیون کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک نے اُن کی تمام جزئیات کا استقصاء کیا، اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کردیا، ذیل مین ہم اُن اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہین جن کی

تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے،

سچ بولنا، جھوٹ کی بُرائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو، و درگذر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ مین جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم بخل کی بُرائی، اسراف اور فضول خرچی، کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزون قرابت دارون، یتیمون، مسکینون اور پڑوسیون کے ساتھ نیکی، مسافرون، سائلون، اور غریبون کی امداد غلامون اور قیدیون کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی بُرائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا عہد کا پورا کرنا، معاہدون کا لحاظ رکھنا، صدقہ و خیرات، نیکی، اور بھلائی کی بات کرنا، آپس مین لوگون کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو بُرا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ بُرے نامون سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتون مین باہم بھلائی، اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگون کو اچھی بات کی تعلیم دینا، اور بُری بات سے روکنا، اولاد کشی، خود کشی، اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اُس کے مال و جائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت ناپ اور تول مین بے ایمانی نہ کرنا، ملک مین فساد برپا کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھین نیچی رکھنا، کسی کے گھر مین بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب،

خیانت کی بُرائی، آنکھ، کان، اور دل کی بازپرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسرون کو معاف کرنا، دشمنون سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی بُرائی، مناظرون اور مخالفون سے گفتگو مین آداب کا لحاظ، مشرکون کے بتون تک کو بُرا نہ کہنا، فیصلہ مین عدل وانصاف، دشمنون تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگون پر احسان دھرنے کی بُرائی، اُلاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی، اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقوی اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی بُرائی، رفتار مین وقار ومتانت، مجالس مین حُسنِ اخلاق، ضعیفون، کمزورون، اور عورتون کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی بُرائی، چغلخوری، طعنہ زنی، اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑون کی پاکیزگی، اور طہارت، شرمگاہون کی سترپوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، اور نمایش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثبات قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی بُرائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکون کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتون سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگون سے بے رُخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے

کی نمایش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری،

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے، ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال میں ہے، جو ان کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں، ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات ایک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۱۰۰ صفحون میں ہیں، جن میں سے ہر صفحہ میں ۲۰ سطریں ہیں، اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں، ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں، تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا جو داعی اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو، اور جس پہ دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو، ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں،

صلۂ رحمی، ماں، باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت، اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبرگیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسانوں

کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر احسان، فریادیوں کی فریادرسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں
کی خیرخواہی، جانوروں پر شفقت، اور رحم، محسنوں کی شکرگذاری، ایک مسلمان کا دوسرے
مسلمانوں پر حق، بیماروں کی خدمت، و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں
کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے
کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی
خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط
کرنا، عفو و درگذر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخر کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے
گھر بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسروں کے گھر جاکر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے
لئے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور استغناء، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں
کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے
کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت
رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پر مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی
ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق
کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت
گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قماربازی
کی ممانعت، سچائی کی ہدایت، اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا
فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن

سے زیادہ ناراض ہوتا ہے، منافقت، اور دورُخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خواری، زناکاری، اور چوری کی ممانعت، طہارت وصفائی، دوست واحباب کی ملاقات، سلام وتحیت مصافحہ ومعانقہ، دیگر آداب ملاقات، آداب مجلس، آداب طعام، آداب لباس، آداب نشست وبرخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتون کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام،

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانون کو عطا کیا گیا ہے،

اخلاقی جزئیات کا استقصاء

انسان بڑا بہانہ جو، اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے، اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظون کے ہیر پھیر کے سایہ مین پناہ لے، اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کرلے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے، اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے، اور اُس کی تہ کی اصلی گہرائیون تک پہنچا جائے اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے، اور اُن کے متعلق صریح احکام دیے جائین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے اس کی توضیح کے لئے امر ونہی دونون کی ایک ایک دو دو مثالین کافی ہون گی،

صدقہ وخیرات تمام مذہبون مین ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن قرآن

نے اس کو صرف عُشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اُس مین نہین ملتا، انجیل نے سب کچھ غریبون کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دونون کو یکجا کر دیا ہے، اور ہر ایک کے ایک ایک جزو کی تفصیل کر دی، توراۃ مین یہ مبہم تھا کہ کتنے غلہ یا سونے چاندی کے مالک پر عُشر یا زکوٰۃ فرض، اور کن کن چیزون مین فرض ہے، شریعتِ محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی، وہ اجناس مقرر کر دیے جن مین عشر یا زکوٰۃ واجب ہے، اُن کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، اُن کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتون کی تشریح کر دی، اُس نے یہ حکم نہین دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا مین لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ، بلکہ یہ کہا،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ	لوگ تجھ سے پوچھتے ہین کہ وہ کیا
قُلِ الْعَفْوَ،	خرچ کرین، کہدے کہ جو تمھاری
(بقرہ ۔ ۲۷)	ضرورت سے زیادہ ہو،

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر دوسرون کی حاجت پوری کرو، تو یہ تمھارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصار جنھون نے خود تکلیفین اٹھا کر مہاجرینؓ کی مصیبتین دور کین اُن کی تعریف مین خدا نے فرمایا،

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	وہ دوسرون کو اپنے اوپر ترجیح

كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو
(حشر-۱)	حاجت ہو،

صحابہؓ کی مدح میں فرمایا،

يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ	خود کھانے کی خواہش کے باوجود
مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّ اَسِيرًا،	مسکین، یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلا
(دھر-۱)	دیتے ہیں،

قرآن پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے،

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں، جو سڑی، گلی، خراب اور نکمی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے نفس کی اور دنائت اور آلودگی ظاہر کرتا ہو، فرمایا،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب
مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ وَمَا تُنْفِقُوْا	تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو، جو
مِنْ شَيْءٍ ۝ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ	تم کو محبوب ہے، اور جو بھی تم
عَلِيْمٌ، (آل عمران-۱۰)	خرچ کرو، خدا کو اس کا علم ہے،

پھر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا	اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو،

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	اُس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمھارے
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ	لئے زمین سے نکالتے ہیں، اس میں
وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ	سے کچھ خدا کی راہ میں دو، اور اس
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ	میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَ	نہ کرو، کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ	تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو، اور
	یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں
(بقرہ - ۳۷)	والا ہے،

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے"، یعنی اُس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی، اس کا یہ سبب نہیں، کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہو کہ وہ تو ہماری ہر اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے، بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے، اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے،

سب سے پہلے تمھاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں، جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل و عیال، دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر،

يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ	کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال
وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ	خرچ کرو، وہ ماں، باپ، رشتہ دارون،
وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ	یتیمون، مسکینون، اور مسافر کے لئے،
خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ،	اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو، اللہ اس
(بقرہ ۲۷-۲۶)	سے واقف ہے،

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگون نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا، مزدوری کرے، اور جو ملے، اس مین کچھ خود کھائے، کچھ محتاجون کو کھلائے، صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے، اور اگر یہ بھی کچھ نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے"[1] دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا، اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر کانٹا، اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول مین ڈال دینا بھی صدقہ ہے"[2] غور کیجیے کہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے،

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۴۰، مصر [2] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی صنائع المعروف،

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرکے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اُس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمایش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہوجاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا، فرمایا :-

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر-۱)	اور اپنا احسان نہ جتا کر تو اور زیادہ چاہے

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا	اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان
صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ	رکھکر اور جتا کر برباد مت کرو، جس طرح
كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ	وہ برباد کرتا ہے، جو لوگوں کے دکھانے
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ	کے لئے خرچ کرتا ہے، اور خدا اور
الْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ-۳۶)	پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا،

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس
مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَ	خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے
اللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ،	احسان جتا کر دینے والے کے دل
	کو صدمہ پہنچایا جائے، اور خدا بے نیاز
(بقرہ-۳۶)	اور بردبار ہے،

ریا اور نمایش سے بچنا ہو، تو چھپا کر دو، اور لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصود ہو

تو دکھا کر کے بھی دے سکتے ہو،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا	اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا
هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا	ہے، اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ	تو وہ تمھارے لئے سب سے بہتر
یُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ	ہے، اور اللہ تمھاری برائیوں کا کفارہ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ	کر دے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ
(بقرہ - ۳۷)	اُس سے خبردار ہے،
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	جو لوگ اپنا مال رات اور دن
بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً	چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ
فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	کرتے ہیں تو اُن کا ثواب اُن کے رب
وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ	کے پاس ہے، نہ اُن کو خوف ہوگا
یَحْزَنُوْنَ ہ (بقرہ - ۳۸)	اور نہ غم،

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے یعنی خوشی ہونی چاہیئے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے،

وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ	اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے
(توبہ - ۷)	لیکن کڑھ کڑھ کر،

صدقہ و خیرات کھلے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنے مال اللہ کی
ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل جما کر
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ الآیۃ	کے خدا کی راہ مین خرچ کرتے ہین اس
(بقرہ-۳۶)	باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو،

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ	اور تم تو خرچ نہین کرتے مگر اللہ
وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ	کی ذات کو چاہ کر، اور جو خیرات کروگے
خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ	وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ
لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ-۳۷)	دبا نہ رہے گا،

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشون کا احاطہ کیا ہے،

مسکرات کی حرمت مین جزئیات کا احاطہ

احکام مین یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایان طور پر نظر آتی ہے، مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہین کیا ہے، مگر اچھا کسی نے نہین سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب، اور شک اور ہان اور نہین کے تمام پہلوؤن کو دور کرکے اس بارہ مین ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کردیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگون نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا، لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اُن کے نقصانات سے محفوظ نہین کہا جاسکتا،

اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیۃً محفوظ نہیں رہ سکتے، مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اُس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن اُن برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا،

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم، لعن اللہ الخمر وشاربها وساقیها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة الیہ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا، خدا شراب پر، اُس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اُس کے لیجانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے (لعنت کرتا ہے)

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے، سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے، اور ان کا اثر بھی مختلف تھا، قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی، چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی

تعیین فرمادی،

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البرّ خمرا وان من الشعیر خمراً،

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

آپ نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہون سے بھی، اور جو سے بھی،

قال سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول ان الخمر من العصیر والزبیب والتمر والحنطۃ والشعیر والذّرۃ، وانی انھاکم عن کل مسکر، (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

راوی کا بیان ہو کہ مین نے آنحضرتؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہون، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے، اور مین تم کو ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہون،

عرب کے مختلف حصّون مین ان ہی چیزون کی شراب بنتی تھی، اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا، اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصّون مین شراب کی دوسری قسمین استعمال کی جائین، اور تحدید اُن کو شامل نہ ہو، اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلّی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی،

كل مسكرٍ خمرٌ وكل مسكرٍ حرامٌ — ہر نشہ آور چیز شراب ہے، اور ہر نشہ آور

(ابوداؤد کتاب الاشربہ، صحیح مسلم، احمد، ترمذی، نسائی) — چیز حرام ہے،

كل شراب اسكر فهو حرامٌ — ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ

(ابوداؤد، احمد، بخاری، مسلم) — حرام ہے،

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے، نشہ ہے، لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا،

ما اسكر كثيره فقليله حرامٌ — جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے،

(ابوداؤد کتاب الاشربہ) — اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے،

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں، جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں، اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بھی ممانعت فرمائی،

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشی

عن كلّ مسكرٍ ومفترٍ — و مخدر چیز سے منع فرمایا،

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی نشی چیزیں استعمال کریں، جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو، عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جس کو

وادی کہتے تھے، چنانچہ آپ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا،

یقول یشرب ناس من امتی	آپ نے فرمایا کہ میری امت میں
الخمر یسمونہا بغیر اسمہا،	کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال
(ابوداؤد کتاب الاشربہ)	کریں گے،

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں اُن کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی،

نھی عن الدباء والحنتم	آپ نے کدو، سبز وسیاہ رنگ کے برتن
والمزفت والنقیر،	اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کرکے
	شراب رکھی جاتی منع فرمایا،

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرمادیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسری یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی، چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہوگئی، حضرت ابوطلحہؓ نے آپ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنالیا جائے، لیکن آپ نے اجازت نہ دی،[1]

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ، اس سرکہ کے جواز وعدم جواز میں فقہاء کا اختلاف ہے،

ایک بار دیلم حمیری نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں، اور سخت کام کرتے ہیں، اس لئے گیہون کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے، انھون نے کہا ہاں" آپ نے فرمایا تو اُس کو چھوڑ دو، انھون نے کہا لیکن اور لوگ نہین چھوڑین گے، ارشاد ہوا کہ اگر نہ چھوڑین تو اُن سے جہاد کرو[۱]

سود کی حرمت مین جزئیات کا احاطہ

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیون سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگون کو روکا ہے تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے لیکن اسلام نے جب اُس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزون مین کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی، اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا، اس ظلم مین لوگ کسی طرح بھی شریک ہون، اُن سب کو شریک جرم ٹھہرایا،

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے
اکل الربوا و موکلہ وشاھدہ	والے، سود کھلانے والے، اس پر
وکاتبہ	گواہی دینے والے، اور اس کے لکھنے
(ابوداؤد کتاب البیوع)	والے پر لعنت بھیجی،

رشوت کی حرمت مین استقصا

لعن رسول اللہ صلی اللہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت
علیہ وسلم الراشی	دینے والے اور رشوت لینے والے

---

[۱] ابوداؤد جلد ۲ ص ۰۰۰ کتاب الاشربہ،

دالمرتشی، دونوں پر لعنت بھیجی ہے،

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات مین بھی اس قسم کی تفصیل، استقصار، اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے، کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہوجاتا ہے، اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتین پیدا ہوجاتی ہین، اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت مین مبتلا ہوجاتا ہے، اسلئے جب تک ان تمام صورتون کو مٹا نہ دیا جائے اُس چیز کا کلیۃً قلع و قمع نہین ہوسکتا،

مسیحی اخلاق کی کمزوری

نرم و گرم اخلاق | مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا مین ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کردی تھی کہ اُس نے حسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم مین کردیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ منفعل قوتون کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتون کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کے امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لئے دونون قسم کی متناسب قوتون کے امتزاج کی ضرورت ہے، جس قدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے، اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے، جس طرح عفو و درگذر بلند ہمتی کا کام ہے، اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بجا ضروری ہے، محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندون کے لئے ضروری سہی، مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے،

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر

جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے ہین اُن مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے، وہ اسی لئے ہے کہ

وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری، اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہین جن سے لوگون مین عزم بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس، اور خودداری کے جوہر پیدا نہین ہو سکتے، وہ کہتا ہے،

"مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے، مسیحیت نے طبائع انسانی کی تمام خودداراانہ قوتون کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے مسیحیت نے زبردست دماغون کا ستیاناس کر دیا ہے[۱]"

اسلامی اخلاق کا اعتدال

لیکن اُس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۰۰ برس بعد اس نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے، جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیون کی تصحیح کر دی، اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا، جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے، اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہین گذری تھی کہ محکومون نے حاکمون کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی، مسیحی یورپ کو ان مین سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی، جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے بارہا قبول نہین کیا،

نفوس کا اختلاف استعداد

اخلاقی تعلیم کوئی ایسی طب نہین ہے، جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریون کا علاج ہو، تمام انسانون کی اندرونی کیفیتین، اخلاقی استعدادین اور نفسانی قوتین یکسان نہین ہین، انسانون مین کمزور و پست ہمت بھی ہین، اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع

[۱] نٹشے از ایم اے گے، ترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے، باب سوم،

بھی ہیں، اور متکبر و خود دار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بردبار بھی ہیں، اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں، اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، نا اُمید بھی ہیں اور پُراُمید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں، اور قوی دل بھی، ظالم اور زبردست بھی ہیں، اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں، کہ سب کے لئے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہو سکتی، بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم، اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں، اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو،

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح

صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھکر جو عنصر کم ہو، اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کرکے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے، وہ کمزور کو بہادر، اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ، اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے، وہ نا اُمید کو پُراُمید کرے، اور اُمید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے، وہ خدا سے مل رہا ہے، وہ قانع کو بلند ارادہ، اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کرکے خدا سے مانگنے والا کردے، وہ ذلیل و خوار کو خود دار اور خود دار کو غیر متکبر بنادے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے، اور بُری قوتوں کا رُخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر اُن کی بُرائی کو کم سے کم کردے،

قوتِ غضب اور قوتِ شہوت میں تعدیل

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اُس کی دو قوتوں پر ہے، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے

نامناسب امور کے پیش آنے پر اُن کی مدافعت کی قوت کا، اور شہوت نام ہے نفس
کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا، ان دونون قوتون کی، افراط و
تفریط، اور اعتدال، اور اُن کے مختلف مراتب سے سیکڑون اچھے بُرے اخلاقی جزئیات
پیدا ہوتے ہین، اور اُن مین سے ہرایک کا الگ الگ نام ہے، غضب کی قوت اگر
افراط و تفریط سے پاک ہو، اور عقل کے قابو مین ہو، تو اس کا نام شجاعت ہے، اور
وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکرون مین جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خودداری
دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثبات قدم، وقار، صبر و سکون
مطالبۂ حق، جد و جہد، سعی و محنت، جہاد، پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر، افراط
کی طرف مائل ہوتی ہے، تو تہور بن جاتی ہے، اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود
پرستی، تکبر، ترفع، دوسرون کی تحقیر، ظلم، قتل نفس وغیرہ کی بُرائیان، پیدا ہوجاتی ہین، اور
جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے، تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور
دنائت کے قالب مین ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت مین جب کامل اعتدال
ہوتا ہے، تو اُس کو عفت کہتے ہین یہی صفت مختلف سانچون مین ڈھل کر مختلف نامون
سے پکاری جاتی ہے، یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری، جود و سخا، شرم و حیا، صبر و شکر،
قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت
کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے
تو اس سے حرص و طمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک،

وغیرہ اوصاف ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہین،

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق

مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونون غضبی اور شہوی قوتون کا استیصال ہے، اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونون کو افراط و تفریط سے ہٹا کر اُن مین توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے، مسیحیت کے نزدیک نفس یہ دونون قوتین بذاتہ بری ہین اور اسلام کے نزدیک یہ دونون قوتین بجائے خود بری نہین ہین، بلکہ کبھی کبھی اون کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہین ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کرکے دشمن کو پیار کرو، اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کرکے مجرد بنو، اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گذارو، بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمن کو بہتر یہ ہے کہ معاف کردو اور خدائی دشمنون کے حق مین دعائے خیر کرو کہ انھین ہدایت ملے، اور خدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ، لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو، امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے غصہ کے مٹانے والے کی نہین، اُس نے وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کہا ہے، وَالْفَاقِدِیْنَ الْغَیْظَ نہین،

مسیحی اخلاق کی کمزوریان

دنیا مین علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جد و جہد جو کچھ ہے وہ ان ہی دونون قوتون کی جلوہ آرائیان ہین، اگر یہ دونون قوتین یک قلم مٹ جائین یا ان مین افراط و تفریط پیدا ہوجائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مرجائے نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہون، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن و

امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ، اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثبات قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہون، قومون کی ترقی، اور ملکون کا نظام درہم برہم ہو جائے، اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بنجائے جس مین حرکت و جنبش کا نام نہ رہے،

مسیحی اخلاقی تعلیم مین یہ نکتہ ملحوظ نہین رہا ہے کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہین ہے، بلکہ بیجا غصہ اور ناجائز خواہش بری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بُری چیزین ہین، اسی قدر وہ معائب بھی جو ان دونون قوتون کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہین، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دنائت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، پستی، فاقہ زدگی بھی بُرے ہین، اسلام نے اپنے پیرون مین ان دونون قوتون کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے، اُس نے جہان اُن کو رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (آپس مین رحمدل) اور اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (مومنون کے فرمانبردار) کی تعلیم دی، وہین اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (کافرون پر بھاری) اور اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (کافرون پر گران) بننے کی بھی تعلیم دی، اور اُن کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور اُن کے فرمانبردارون کے حصہ مین ہے، وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ، مسیحی قومون کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہین ہوا، جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انھون نے فائدہ نہین اٹھایا، لیکی تاریخِ اخلاقِ یورپ کی دوسری جلد مین کہتا ہے:

کی کا اعتراض
حی اخلاق پر

- لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمامتر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے، ....

.... اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزون ومناسب رہا، تاہم تمدّن کی روز افزون ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا، ترقی تمدّن کے لئے لازمی ہے کہ قوم مین خودداری ہو، اور حریت کے جذبات موجود ہون، اور انکسار وتواضع اس کے دشمن ہین، خانقاہانہ طرز زندگی کا مثل، فوجی طرز زندگی کے اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو، تاہم سپاہیون مین تو پھر بھی فی الجملہ خودی وخودداری موجود ہوتی ہے، لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمحِ نظر تھا، کسی طرح ترقی تمدن کے حق مین مفید نہین پڑ سکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدون مین تو اس جذبے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہین لیکن عوام مین تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہوجاتا ہے، اسی کو دیکھ کر متاخرین حکماے اخلاق نے بجاے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا، اور اس کے دو مظاہر ہین، ایک مردانگی، اور دوسرے خودداری، ان ہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک مین جو صاف گوئی، آزادخیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت وحمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک ملکون مین نہین پائی جاتی، بلکہ اُن کے بجاے دنائت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہین، اور سب بڑھ کر یہ کہ اوّل الذکر مین سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیان ہین، اُن سے آخرالذکر یکسر خالی ہین، (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق | لیکن اس کے بالمقابل معلّم اسلام علیہ السّلام کی تعلیم جو کچھ ہے، اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ معالی الامور	بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقرات
ویبغض سفسافها؛	امور کو ناپسند کرتا ہے؛

معالی امور سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام، اور محقرات سے مراد چھوٹی، اور دنی باتیں ہیں، اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

المؤمن القوی خیرٌ واحبُّ	کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان
الی اللّٰہ مِنَ المؤمن	زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا
الضعیف وفی کُلّ خیر	ہے، اور ہر ایک میں بھلائی ہے،
احرص علی مَا ینفعک استعن	وہ چیز جو تجھے نفع دے، اُس کی
باللّٰہ ولا تعجز وان اصابک	پوری خواہش کر اور خدا سے مدد
شیئ فلا تقل لو انی فعلت	چاہو، اس راہ میں کمزوری نہ دکھا
کان کذا وکذا ولکن قل	اور اگر تجھے اس میں تکلیف پہنچ جائے

قدر اللہ وما شاء فعل
فان لو تفتح عمل الشیطان

تو یہ نہ کہہ اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا، بلکہ یہ کہہ کر کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا، اور جو چاہا اُس نے کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

(صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ)

تقدیر، توکل، صبر اور شکر یہ حدیث اُن تمام مسائل کی شرح کرتی ہے، جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے، اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں، اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جاچکی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پر امیدی، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو، مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کرکے کام شروع کر دینا چاہیے اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہو، تو دل میں یاس و ناامیدی کے بجائے، صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے، اور سمجھنا چاہیے کہ خدا کا منشا یہی تھا، (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے؛

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ

جب تو پکا ارادہ کرلے پھر خدا پر بھروسہ کر، بیشک اللہ توکلوں کو پیار کرتا ہے۔

إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهٖ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ط

(آلِ عمران - ۱۷)

اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں، اور اگر وہ چھوڑ دے، تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے، خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے،

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا ط إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ج لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ

(حدید - ۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، یہ اس لئے تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کرو، اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو، اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا،

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل، اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لئے نہیں، بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری، اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے،

اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہؓ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتون اور فوجون کا مقابلہ کیا، اور کامیاب رہے، اُن کو مشکلات مین خدا کے دوسرے برگزیدون کی یہ دعا سنائی گئی،

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ،
(بقرہ - ۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم پر صبرو ثبات کا پانی بہا، اور ہمارے پاؤن کو مضبوط گاڑ، اور ہم کو کافر لوگون پر فتحیاب کر.

اور بتایا کہ مشکلات مین دوسرے پیغمبرون کے ساتھیون نے کیا کیا،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ج فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ، وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

اور کتنے نبی تھے کہ اُن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والون نے لڑائی لڑی، تو خدا کی راہ مین جو مشکل یا مصیبت پیش آئی، اس سے وہ سست نہ ہوئے، اور نہ کمزور ہوئے، اور خدا ثابت رہنے والون کو پیار فرماتا ہے، اور اُن کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما

(آل عمران - ۱۵) اور ہمارے پاؤن مضبوط رکھ اور ہم کو کافرون پر فتح دے،

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا	اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو
وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ	اور دشمن کے مقابلہ مین ثابت قدم رہو
لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ہ	بہادر ثابت ہو، اور اللہ سے تقویٰ کرو
(آل عمران - ۲۰۰)	تاکہ کامیاب ہو،

ان آیتون سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی، اور مشکلات مین صبر و ثبات قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی، اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے اسی طرح سطوت اور بہادری اور حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے،

اپنے دشمنون کو پیار کرو | مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زرین اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنون کو پیار کرو، اس مین شک نہین کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینون کی آنکھین خیرہ ہو جاتی ہین لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسرون[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق مین دعائے خیر

---

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی،

کرسکتے ہو، مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہین کرسکتے کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہین،

اخلاقِ محمدیؐ نے اس کے بجاے وہ تعلیم دی جس پر ہر خوش نصیب عمل ممکن ہی اور اللہ کے بندون نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے یعنی دشمنون کے ساتھ نیک سلوک کرو، برُا چاہنے والون کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بددعائین دین انکو دعا دو، جو تمھارا قصور کرین اُن کو معاف کرو، اور جو تم پر ظلم کرین اُن کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا،

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا	اے ایمان والو! خدا کے لیے کھڑے
قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ	ہوجایا کرو انصاف کے ساتھ گواہ
وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	بن کر، اور کسی قوم کی دشمنی تم کو
عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا	عدل و انصاف کرنے سے باز نہ
ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔ وَاتَّقُوا	رکھے، انصاف کرو کہ انصاف کرنا
اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا	پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہی؛
تَعْمَلُوْنَ،	اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمھاری کامون
(مائدہ ۲-۲)	کی خبر ہے،
وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا	اور بھلائی اور برُائی برابر نہین برائی
السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ	کو بھلائی سے دفع کرو، تو دفعتًہ وہ
فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ	جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی

عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝	رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائیگا
وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ	اور اس پر عمل کی توفیق ان ہی کو ہوتی
وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	ہے، جو صبر کرتے ہیں، اور ان ہی کو
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ	یہ سعادت ملتی ہے، جو بڑی قسمت
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ	والے ہیں، اور اگر شیطان تم کو اکسائے
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝	تو خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا
(حٰمٓ السجدۃ ۔ ۵)	جاننے والا ہے،

۱۔ اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتایا گیا ہے، کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے،

۲۔ اس آیتِ پاک میں جس نیکی اور حسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے، وہ اُن لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے، جو تمہارے دشمن ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا،

۳۔ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا، اور اُس کو عظیم انسانی خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

۴۔ دشمن کے ساتھ بُرائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے، اور اُس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عباسؓ

جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں[۱]،

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی برائی کرنے پر علم اور عفو و درگذر کا حکم دیا ہے، وہ ایسا کریں گے تو خدا اُن کو شیطان کے پنجہ سے چھڑا لیگا اور اُن کا دشمن بھی دوست کی طرح اُن کے آگے سر جھکا دے گا۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے تھے، گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اُس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اُس نے پھر تیسری مرتبہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے، اور کچھ بول اُٹھے، یہ دیکھکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) فوراً اُٹھ گئے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یارسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہوئے، فرمایا اے ابوبکر جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا، تو وہ ہٹ گیا[۲]"

آپنے فرمایا "صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلہ رحم کرو، بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو[۳]" یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے،

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمت نبوی میں آکر عرض کی، یارسول اللہ مجھے وہ بات بتائیے جس کے کرنے سے جنت مل جائے، آپنے اس کو چند باتیں بتائیں منجملہ اُن کے

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۱۲، وابن جریر جلد ۲۴ ص ۷۰ مصر، [۲] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی الانتصار،
[۳] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ ص ۸۸۶،

فرمایا ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتون کی بارش کرو۱

اسلام کی نظر مین کافر و مشرک سے بڑھ کر کوئی مذہبی دشمن نہین ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانون کو اپنے ایسے دشمنون کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے،

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا	(اے پیغمبر) مسلمانون سے کہدے
لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ	کہ ان کو جو خدا کے دنون پر یقین
لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا	نہین رکھتے، معاف کر دیا کرین تاکہ
يَكْسِبُوْنَ،	خدا ایسے لوگون کو ان کے کرتوتون
(جاثیہ ۲-)	کا بدلہ دے،

اگر عملی مثالین چاہتے ہو تو وہ ریاکار فریسیون اور سانپون اور سانپون کے بچون۲ والی مسیحیت کے واعظ مین نہین، بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ مین ہے جس نے فاتح بن کر مفتوح ہو کر نہین، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہین، بیک دفعہ مکہ کے ان ہزارون دشمنون کو معاف کر دیا، جن مین سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا۳ جس نے اس کو معاف کیا، جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا۴ جس نے خیبر مین اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا۵ جس نے

---

۱ مستدرک حاکم کتاب المکاتب جلد ۲ ص ۱۱ حیدرآباد دکن ۲ انجیل متی ۲۳، ۲۵-۳۲ ۳ صحیح بخاری باب فتح مکہ ۴ صحیح بخاری کتاب الہجرۃ ۵ صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبوی،

اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا[۱]، جس نے حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا[۲]، جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا[۳]، جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا[۴]، جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا، اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پاکر معاف کیا[۵]، جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی[۶] جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی، جس سے اس کے پاؤں خون آلود ہو گئے تھے، جس نے احد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دعا دی[۷]، جس نے دشمنوں کے حق میں بددعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں، بلکہ رحمت کے لئے آیا ہوں[۸] صلی اللہ علیہ وسلم۔ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی،

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ

لیکن جن مشرکون سے تم نے عہد باندھا، پھر انھون نے تم سے کچھ کم نہ کیا، اور نہ تمھارے خلاف کسی

---

۱ صحیح بخاری فتح طائف ۲ صحیح بخاری باب فتح مکہ ۳ کتب سیر وطبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ وہبار بن اسود ۴ جامع ترمذی کتاب التفسیر سورہ فتح ص ۵۰۰، ۵ صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۴۰۱، ۶ ابن سعد غزوۂ طائف ۷ فتح الباری ج ۷، ص ۲۰۶ مصر باب احد ۸ صحیح بخاری مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۹ مشکوٰۃ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم،

أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ	کی مدد کی، تو اُن کا عہد اُن کی مدت
عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ	مقررہ تک پورا کرو، اللہ پرہیزگارون
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ، (توبہ-۱)	کو دوست رکھتا ہے،

کفار و مشرکین سے عدم موالات

اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے اُن احکام کو پیش کرتے ہین جن مین مسلمانون کو کافرون اور مشرکون کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ یہ بالکل علحدہ چیز ہے، یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروون کو اُن کے اُن مخالفون کے میل جول، رازداری، اور رفاقت سے روک دے، جو زور یا سازش سے اُس کے مٹانے اور برباد کردینے کے درپے ہون، خصوصاً ایسے وقت مین جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششین ہو رہی ہون اور طرفین مین لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہین پھیلا کر اس کے پیروون کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہون چنانچہ اس قسم کی آیتین،

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ	ایمان والے مسلمانون کو چھوڑ کر
أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ	کافرون کو اپنا دوست نہ بنائین
وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ	توجو ایسا کرے گا، تو اس کو اللہ سے
مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ	کوئی علاقہ نہین، مگر یہ کہ تم اُن سے
تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً (آل عمران ۳)	بچاؤ چاہو،

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا	اے ایمان والو! اپنے باپ، اور
اٰبَآءَکُمْ وَ اِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ	بھائیون کو اگر وہ ایمان کے برخلاف
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ؕ	کفر سے محبت رکھین، اپنا دوست
وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ	نہ بناؤ، اور تم مین سے جو کوئی اُن
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ،	سے دوستی رکھے گا، تو وہی حد سے گذرنے
(توبہ-۳)	والے ہون گے،

اسی موقع کی ہین، ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہون تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہو گی، فطرۃً اُن اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علٰحدگی ہو گی، جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہون، اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہین، جو شہزادۂ امن کے اس اعلان کے ہین،

"یہ مت سمجھو کہ مین زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہین، بلکہ تلوار چلانے کو آیا، کیونکہ مین آیا ہون کہ مرد کو اُس کے باپ، اور بیٹے کو اُس کی مان اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کرون، آدمی کے دشمن اُس کے گھر کے لوگ ہون گے، جو کوئی باپ یا مان کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہین" (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق مین یہودیون کے ساتھ وہ نرمی، درگذر، لین دین

رفیق القلبی نہ تھی، جو دوسرے نادان بُت پرستون اور گنہگارون کے ساتھ تھی وہ یہودیون کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے، جب حجاز کے یہودیون اور سرحد شام کے عیسائیون سے مسلمانون کی جنگ چھڑی، اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان اسلحہ اور مستحکم قلعون کے سبب سے اُن کا پلہ مسلمانون سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا، تو مدینہ کے منافقون اور کمزور دلون کی عاقبت بینی، اور دور اندیشی اُن کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنون سے ساز باز رکھین، تاکہ اُن کے مقابلہ مین اگر مسلمانون کو شکست ہو تو اُن کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانون کو اپنے ساتھ ملا کر اُن کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانون کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:-

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! یہودیون اور
الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاءَ	نصرانیون کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَ	مین ایک دوسرے کے رفیق ہین
مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ	اور جو کوئی تم مین سے اُن سے رفاقت
مِنْهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى	کرے، وہ ان ہی مین ہے، اللہ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فَتَرَى	بے انصاف لوگون کو راہ نہین
الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	دیتا، اب تو ان کو دیکھتا ہے جن
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ	کے دل مین بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ
اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا
عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
نٰدِمِيْنَ، وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ
لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ
دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ
يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ،

(مائدہ ۸-۰)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

اُن سے مِلے جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ
ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے
تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح
یا (اُن کی کامیابی کی) کوئی اور بات
اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے
دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں،
اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں
جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں، خراب گئے اُن کے عمل اور پھر
رہ گئے نقصان میں۔ اے ایمان والو!
اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھرے گا
تو خدا کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین
کے لئے اور دوسرے لوگوں کو لائے گا،
جن سے راضی ہوگا، اور وہ اللہ سے
راضی ہوں گے، جو ایمان والوں کے
نرم اور بردبار اور کافروں پر بھاری ہوں گے
اے ایمان والو! اہل کتاب

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا — اور کفار میں سے اُن کو جو تمہارے
وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ — دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا
مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ — رفیق نہ بناؤ، اور خدا سے ڈرو اگر
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (مائدہ ۹) — یقین رکھتے ہو،

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ، اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا — اے ایمان والو اپنے غیر کو اپنا بھیدی
بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا — نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں
يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا — کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے، اُن کو
عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ — خوشی ہے، دشمنی اُن کی زبان سے
مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي — نکلی پڑتی ہے، اور جو اُن کے جی میں
صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا — چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے،
لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ — ہم نے تم کو باتیں بتا دیں اگر تم
(آل عمران ۱۲) — کو عقل ہے،

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کفر و دوستی قرابت کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے، اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جن کی روک تھام

کے لئے مسلمانوں کو اُن کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے، سب سے زیادہ تصریح
سورۂ ممتحنہ میں ہے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا
عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ
تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ
وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ
الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَ
إِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ
رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ
جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ
بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا
أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ
يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَاءَ السَّبِيلِ، إِنْ يَثْقَفُوكُمْ
يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَ
يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں
کو دوست نہ بناؤ کہ تم اُن کو دوستی
کا پیغام بھیجو، اور وہ اس سچائی کے
جو تم کو ملی منکر ہیں، وہ رسول کو اور
تم کو اس لئے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم
اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے
اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری
خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم اُن کو
دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے خوب معلوم
ہے، جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے
ہو، جو تم میں ایسا کرتا ہے، وہ
سیدھی راہ بھولا ہے، اگر وہ (جن کو
تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو
موقع سے پائیں تو تمہارے دشمن ہو جائیں
اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے

وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ، لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَآ أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ،

(ممتحنہ - ۱)

ہاتھ بڑھائین، اور بُرائی کے ساتھ اپنی زبانین کھولین، اور چاہتے ہین کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ، تم کو تمھاری قرابت اور تمھاری اولاد قیامت کے دن نفع نہین پہنچائیگی،

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا إِلَيْهِمْ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ، إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُولٰٓئِكَ

خدا تم کو اُن لوگون کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہین رکھتا جو تم سے مذہب مین لڑائی نہین کرتے اور نہ تم کو تمھارے گھرون سے نکالتے ہین، خدا انصاف والون کو پیار کرتا ہے، وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے، جو تم سے مذہب مین لڑائی لڑین، اور تم کو تمھارے گھرون سے نکالین، اور تمھارے نکالنے پر ایک دوسرے کے مددگار بنین، جو ان سے دوستی کا دم بھریگا،

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (ممتحنہ ۲)	تو وہی بے انصاف ہوں گے،

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سنادی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی، اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی، فرمایا،

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ	اُمید ہے کہ اللہ تمھارے اور تمھارے
وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ	دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کردے
مَّوَدَّةً ۚ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ (ممتحنہ ۲)	اور اللہ قدرت والا ہے،

ان آیتوں کا مطلب اُن کے شان نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہوجاتا ہے، انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بیخبری میں مکہ پر قبضہ کرلینا چاہتے تھے، تیاریاں ہورہی تھیں، کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکہ کی سمت روانہ کردیا، کہ قریش خبردار ہوجائیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر ہوگئی، آپنے دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں، وہ خط آیا تو آپ نے حاطب سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی یارسول اللہ جلدی نہ فرمایئے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں لیکن اُن سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں، اور جس قدر مہاجر ہیں، وہاں اُن کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے اُن کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں، میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی، جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا، کہ میں اُن پر یہ احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں، میں نے دینِ حق سے مرتد ہوکر ایسا نہیں کیا، آپ نے فرمایا، تم بدر والے لوگ ہو خدا نے تمھارے گناہ

معاف کئے ہین، اس پر یہ آیت اُتری، یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا، اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنون کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ احکام اسی قسم کے ہین، جو عہد عتیق مین بھی مذکور ہین، زبور مین ہے،

"اے خدا تو یقیناً شریرون کو قتل کرے گا، پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ، کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتین کرتے ہین، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہین، اے خداوند کیا مین اُن کا کینہ نہین رکھتا، جو تیرا کینہ رکھتے ہین، کیا مین اُن سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہین، بیزار نہین، مین شدت سے اُن کا کینہ رکھتا ہون، مین انھین اپنے دشمنون مین گنتا ہون"

(۱۳۹ - ۱۹ - ۲۲)

یشوع کے صحیفہ مین ہے،

"اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو، اور اُن لوگون کے بقیہ سے لپٹو، جو تمھارے درمیان باقی ہین، اور اُن کے ساتھ نسبتین کرو، اور اُن سے ملو، اور وہ تم سے ملین، تو یقین جانو، کہ خداوند تمھارا خدا پھر ان گروہون کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کرے گا بلکہ وہ تمھارے لئے پھندے اور دام اور تمھاری بغلون کے لئے کوڑے اور تمھاری آنکھون مین کانٹے ہون گے، یہان تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمھارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے، (یشوع باب ۲۳، ۱۲)

لہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ،

قرآن پاک اور احادیث مین بعض احکام ایسے بھی ہین جن مین منکرون، ظالمون بدرون کا اور گنہگارون سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہی،

وَدُّوْا لَوْتَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا	وہ چاہتے ہین کہ تم بھی کفر کرو جس
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا	طرح انھون نے کفر کیا، تو ان مین
مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا	سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہان
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ،	تک کہ وہ خدا کی راہ مین ہجرت نہ
(نساء - ۱۲)	اختیار نہ کرین،
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ	اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری
فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى	آیتون کی شان مین لغو بکتے ہین، تو
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ط	اُن سے کنارہ کرلے، یہان تک کہ
وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ	وہ اس کے سوا دوسری بات مین
فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى	لگ جائین، اور اگر تجھ کو شیطان
مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ٥	بھلادے، تو یاد آنے کے بعد پھر ان
(انعام - ۸)	گنہگار لوگون کیساتھ نہ بیٹھ،
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ	اور تم پر کتاب مین یہ حکم اتار چکا کہ جب
اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ	سنو اللہ کی آیتون سے انکار ہوتے
يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا	اور ان پر ہنسی ہوتے، تو اُن کے

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا | ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ
فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا | کرنے لگیں، نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی اُن ہی
مِّثْلُهُمْ (نساء-۲۰) | کے جیسے ہو جاؤگے،

یہ احکام اس لئے ہیں تاکہ بُری صحبت کا بُرا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، اُن کے معنی قریب قریب وہی ہیں، جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں،

مین نے خط مین تم کو لکھا کہ حرام کارون مین مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرام کارون یا لالچیون یا لٹیرون یا بُت پرستون سے نہ ملو، نہین تو تمھین دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر مین نے اب تمھین یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی یا بت پرست، یا گالی دینے والا، یا شرابی، یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا، .... غرض کہ تم اس بُرے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو، (اول قرنتیون ۵)

اور تم بے ایمانون کے ساتھ نالائق جُوے مین مت جُتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی مین کونسا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی مین کونسا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتون سے کونسی موافقت ہے، ......اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم اُن کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو، اور ناپاک کو مت چھوؤ،
(۲ قرنتیون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیرت کے باوجود اسلام دنیاوی

معاملات اور اخلاق مین مسلمانون کو اُن سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہی
مین لڑائی کی حالت مین بھی یہ حکم ہی،

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ	اور اگر مشرکون مین سے کوئی تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ	پناہ مانگے، تو اس کو پناہ دے، یہان
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ	تک کہ وہ اللہ کا کلام سُن لے، پھر
مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ	اسکو تو اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دے
لَّا يَعْلَمُونَ ٥ (توبہ - ۱)	یہ اس لئے کہ وہ نادان لوگ ہین،

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حُسن سلوک ہوسکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآنِ پاک مین یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک کافر ہون تو بھی اُن کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات مین اُن کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اُن کی مسلمان اولاد پر فرض ہی، فرمایا :-

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ	اور اگر وہ دونون (والدین) اس پر ضد
بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا	کرین کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک
تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا	جس کا تجھے علم نہین، تو اُن کی بات
مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ	نہ مان، اور دنیا مین اُن کے ساتھ نیکی
أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	کا برتاؤ کر، اور اس کی راہ چل جو میری
فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ	طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف

تَعْمَلُوْنَ، (لقمان - ۲) | آنا ہے، پھر مین تم کو جتا دونگا جو تم کرتے تھے،

مذہبی دشمنون کے ساتھ اِس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود اُن کی دنیاوی خدمت اور اُن کے ساتھ نیک برتاؤ مین کوئی کوتاہی کیجائے،

سختی کا جائز موقع اس مین شک نہین کہ اسلام مین نہ صرف کفار بلکہ اُن کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح مین "منافقین" کہتے ہین، بعض موقعون پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانون کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانون کے ساتھ آباد ہین، وہ دھوکے سے دشمنون کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلین، یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانون کے اندر رہکر اُن کی جماعت مین تفرقہ پردازی کرین، اور طرح طرح کے شبہون اور افواہون سے مسلمانون کی جمعیت مین پریشانی پیدا کرین، اس حالت مین اُن کافرون اور منافقون کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانون کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑین تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے، یہان تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز آجائین، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے اس موقع کی دو آیتین سورۂ توبہ مین ہین،

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے پیغمبر اُن کافرون اور منافقون
وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ	سے جہاد کر اور اُن پر سختی کر، اور اونکی
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ	جائے پناہ دوزخ ہے، اور وہ کتنی
الْمَصِيْرُ، يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ	بری بازگشت کی جگہ ہے، یہ اللہ کی

مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ
الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ
وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا وَمَا
نَقَمُوْا اِلَّا اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنْ
يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ
يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا
اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ
(توبہ - ۱۰)

قسم کھاتے ہین کہ انھون نے ایسا نہین
کہا، حالانکہ انھون نے یقیناً کفر کی بات
کہی، اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر
کیا، اور اس بات کا قصد کیا تھا جسکو
وہ نہ پا سکے، اور انھون نے عیب نہین
کیا، لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول
نے اپنی مہربانی سے اُن کو دولتمند کردیا
تو اگر وہ باز آجائین تو اُن کے لیے یہ بہت
اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیرین تو اللہ
اُن کو اس دنیا مین اور آخرت مین
دردناک سزا دے گا، اور زمین مین
نہ اُن کا کوئی دوست ہوگا، نہ مددگار"

یہ آیتین اس سختی کے موقع پر خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہین، اور اُن کے آگے، اور پیچھے جو اور آیتین ہین، وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہین، تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ مین مسلمانون کو رومیون[1] کے مقابلہ مین اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰ ص ۱۰۴، مصر،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا	اے ایمان والو ان کافرون سے لڑو
الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ	جو تمھارے ہم سرحد ہین، اور چاہیے
وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً	کہ وہ تمھارے اندر سختی پائین،
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ	اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگارون
(توبہ - ۱۶)	کے ساتھ ہے،

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانون کو کمزور سمجھ کر اُن پر حملہ کی نیت نہ کرین،

تحریم اور ایلا کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیت نبوی مین پھوٹ ڈال کر مسلمانون کی جماعت مین افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا،

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے پیغمبر! اُن کافرون اور منافقون
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ	سے جہاد کر، اور اُن پر سختی کر اور اُن کا
وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ	ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بازگشت کی
الْمَصِيرُ (تحریم - ۲)	کتنی بُری جگہ ہے،

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام، اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہین، اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ مین وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہین، جو اس انتظام و نظام کی بربادی مین کفار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے،

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالفینِ اسلام پر سنگدلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں، اور وہ سورۂ فتح کی حسبِ ذیل آیت ہے، جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف اُن کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ	محمد خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ
مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ	ہیں، وہ کافروں پر سخت (بھاری)
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ،	ہیں، اور آپس میں مہر و محبت رکھتے
(فتح — ۴)	ہیں،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگدلی، بے رحمی، اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار اُن سے مرعوب ہیں، اور مقابلہ میں مسلمان اُن پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے، اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں، بلکہ یہ کرنا چاہئے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی اُن پر غالب اور اُن کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، اُن سے کسی طرح دبتے نہیں، چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحرالمحیط میں قاضی بیضاوی نے انوارالتنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں، جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اَعِزَّةٍ	فرمانبردار ہین مسلمانون کے اور بھاری
عَلَى الْكَافِرِينَ (مائدہ ۸-۸)	ہین کافرون پر،

یہ محاورہ قرآن مین کئی جگہ ہے، مثلاً سورہ ہود مین ہے،

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے
مِّنَ اللّٰهِ، (ھود - ۸)	زیادہ بھاری (مضبوط) ہے،

دوسری آیت مین ہے،

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ ۱۶)	تمھاری تکلیف رسول پر گران ہے،

لسان العرب میں ہے،

وَرَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِيٌّ وَالجمعُ	مرد شدید یعنی قوی اور اس کی جمع
اَشِدَّاء (جلد ۴ ص ۲۱۸ مصر)	اشدّاء ہے،

قرآن پاک مین اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتون مین استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی مین آیا ہے، دوسرے مشتقات مین بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہین،

اُشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ، (طٰہٰ ۲)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر،
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا	اور تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان
(نبا)	بنائے،
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ (ص-۲)	اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی،

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، (قتال۔۱) پھر مضبوط باندھو،

شدید کے مشترک معنی یہ ہین، کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے، بلکہ اس کے مقابلہ مین مضبوط اور سخت رہے، اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی، انھون نے کفار کی بڑی بڑی مخالفون کی پروانہ کی، تکلیفون اور مزاحمتون کا پُرزور مقابلہ کیا، دشمنون کی تلوار کے نیچے سر رکھدیا، اُن کے نیزون کو سینون مین جگہ دی، اُن کے تیرون کی بوچھار سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا پھر اُسی کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا، آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اُن سے دبنے لگے، اور مسلمانون کی ایمانی قوت کا رُعب اُن پر بیٹھ گیا، قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی، کہ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (آل عمران وانفال) کہ مین اُن کافرون کے دلون مین مسلمانون کا رعب بٹھادونگا، وہ بالآخر پوری ہوئی، اور فرمایا، وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب وحشر۔۱) اُن کے دلون مین مسلمانون کا رعب ڈالدیا،

مخالفون کے دلون مین اسی رُعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو ہمیشہ سامانِ جنگ تیار رکھنے کا حکم دیا ہے،

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (انفال)

اُن کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے اُور گھوڑون کو باندھنا، وہ تم تیار رکھو کہ اس سے دشمنون کو مرعوب کرو،

اس آیت کا یہ مطلب نہین کہ کفار کو ڈرایا کرو، بلکہ یہ ہے کہ تمھارا ساز و سامان اور

جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانون پر فرض ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑون کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے، فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ مین باندھتا ہی اور اس کا حق ادا کرتا ہے، وہ اُس کے لئے ثواب کا موجب ہے، جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے اس کے لئے پردہ پوش ہے، اور جو نمایش کے لئے باندھتا ہے، وہ اس کے لئے عذاب ہے[1]، اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ مین نیت کا سوال سب سے اہم ہے اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفون کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے، اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو، بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور رضا کے لئے ہو، لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیون کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤن کو نہین روکا ہے،

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی

یہان کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیون نہین کر دیا لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہین، اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکین، اور تمام جدوجہد، ان ہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہین، اگر انسان کو ان دونون جذبات سے پاک کر دیا جائے، تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرمجوشیان سرد پڑ جائین، اور یہ آگ کا شعلہ

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے، اس لئے یہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اُس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علحدہ کر دیا جائے، محمد رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ وغضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو، جو یقیناً ناممکن ہے، بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع ومحل متعین کیا جائے، چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے، اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع ونقصان کے لئے نہ ہو، بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو، صلح وجنگ، دوستی ودشمنی، رضامندی وناراضی، اور محبت وعداوت، جو کچھ ہو، وہ خدا کے لئے ہو، الحب فی اللّٰہِ وَالبُغضُ فِی اللّٰہِ،

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی وناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے، مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے، ناخوشی وناراضی کو سرے سے فنا نہین کیا جا سکتا ہے، بلکہ جو ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی وناراضی کے موقع ومحل کی اصلاح کی جائے، یہ ممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے، وہ جب خیر سے محبت کریگا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکیان

سے دوستی کرے گا، تو شریروں سے علحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ مین صرف ایک دل ہے، اور ایک ہی دل مین ایک شے کی، اور پھر اسی کی ضد کی دونون کی محبت یکجا نہین ہوسکتی، جیسا کہ قرآن نے کہا،

مَاجَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (احزاب-۱)

خدا نے کسی کے سینہ مین دو دل نہین بنائے،

ع سینہ مین کسی شخص کے دو دل نہین ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ مین ادا کیا ہے،

"کوئی آدمی دو آقاؤن کی خدمت نہین کرسکتا، اس لئے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی، یا ایک کو مانے گا، اور دوسرے کو ناچیز جانے گا، تم خدا اور مال دونون کی خدمت نہین کرسکتے (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولون نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوس[۱] نے خدا اور آدمی، یعقوب[۲] نے خدا اور دنیا، یوحنا[۳] نے خدا اور دنیا کے بری کامون کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا، وہ دوسرے سے نہین،

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ مین ہے کہ محبت اور عداوت دونون صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے، اپنی ذات کے لئے نہین، بیہقی کی شعب الایمان مین ہے

---

[۱] گلیتون کے نام ۱-۱۰، [۲] یعقوب ۴-۴،

[۳] یوحنا ۲، ۱۵،

کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابوذر سے پوچھا کہ ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟ عرض کی، خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے؟ فرمایا یہ کہ باہمی میل جول خدا مین ہو، محبت بھی خدا ہی مین ہو، اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی مین ہو، مسند احمد مین ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت کیا کہ کونسی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے؟ کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپ نے فرمایا، نیکیون مین سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے، کہ خدا ہی کے لئے محبت اور خدا ہی کیلئے مخالفت ہو۔[۱]

اسلام مین کسی سے ذاتی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہین

خدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا ناراضمندی کے یہ معنی ہین کہ نفسانی غرض وغایت کو اس جذبہ مین کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے تشخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو، اور اس کے سبب اس شخص سے علٰحدگی و بیزاری ہو، جس مین یہ صفتین پائی جاتی ہون، قرآن پاک کی ایک آیت ہے،

حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَ	خدا نے ایمان کو تمھارا محبوب بنایا، اور
زَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ	اس کو تمھارے دلون مین مزین کیا، اور
إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَ	کفر اور بے حکمی، اور نافرمانی کو تمھارے
الْعِصْيَانَ، (حجرات ۱)	نزدیک مکروہ بنایا،

۱؎ مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ،

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مؤمن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و ناراضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے، یہ دور ہو جائے، تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے، فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	تو اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں، اور نماز
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي	پڑھیں، اور زکوٰۃ دیں، تو وہ تمہارے
الدِّيْنِ، (توبہ-۲)	دینی بھائی ہیں،

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعۃً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور ناراضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے، کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملچھ ہے، نہ چنڈال ہے، نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے، اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے، اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یورپین غیر یورپین کی تقسیم ہے، جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے، ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے، اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلال حبشی رضؓ، صہیب رضؓ رومی، اور سلمان رضؓ فارسی کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ وہی سفیانؓ وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بنکر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے، بیک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے

سرگروہ ہوگئے، اور مسلمان اُن کے فدائی بن گئے، اور سب آپس مین بھائی بھائی ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا،

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا، (آل عمران-۱۱)	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے، تو اس نے تمھارے دلون مین باہم اُلفت پیدا کردی، اور تم اس کے فضل وکرم سے بھائی بھائی بن گئے،

ناپسندیدگی وبیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے توبہ وندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت وشفقت سے مبدّل ہوجاتا ہے، مبشّرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگارون کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سُنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ، (زمر-۶)	اے میرے وہ بندو جنھون نے گناہ کرکے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، خدا سب گناہون کو معاف کرسکتا ہے، وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے،

آپ نے فرمایا التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ [1] گناہ سے توبہ کرنے والا

---

[1] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ،

ایسا ہے جیسا کہ جس کا گناہ نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور اُن کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا، اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سُنائی، ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی، وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑ کر آئے، تو صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا "تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو، خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے، وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو پیار کرتا ہے[۱]" اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گناہگار پر بددعا نہ کی جائے[۲]۔ ماعز بن مالک ایک صاحب تھے، جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے، واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا، وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے، تاہم انھوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی، اور سزا کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ اُن کی درخواست رد کی، لوگوں نے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں، سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے، اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، وہ میدان میں کھڑے کئے گئے، اور اُن پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی، اور اسی حال میں انھوں نے جان دی، صحابہ میں بعض ایسے بھی تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعز کو بُرا کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا، ماعز کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اُس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجایش ہو سکتی ہے[۳]۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الحدود ص۱۰۰۲ [۲] فتح الباری شرح حدیث مذکور ص۵۳ [۳] یہ دونوں واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود میں ہیں۔

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا، اور سزا کی کی درخواست کی، آپنے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا، وہ اس کے بعد آئی، فرمایا بچہ کی پرورش کر لو، جب بچہ دودھ چھوڑ دے، تب آنا، وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی، اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا، آپنے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا، اُس کو سنگسار کیا گیا، تو اس کے خون کی چھینٹیں اُڑکر حضرت خالد بن رضؓ ولید کے منہ پر پڑین، اُنھون نے عورت کو بُرا کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا کہ خالد چپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، اُس نے توبہ کی ہی کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا۔[1]

ترک ہوی | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہو کہ انسان کے نیک سے نیک عمل کی اچھائی بھی اس کی غرض وغایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے، تو وہ نیک اور اچھا ہے، اور اگر اُس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے، تو وہ نیکی نہین، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک مین ھوی ہے، ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال واخلاق کو ہوی سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لئے وہ کام کرتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگون کو جو دین حق کے پیرو نہین، اور اپنے کامون کی بنیاد اخلاص پر نہین رکھتے، یہ کہا کہ اُن کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے، اور اُن کے

[1] یہ دونون واقعے صحیح مسلم کتاب الحدود مین ہین،

سینوں کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش و ہوا کے بُت چھپے ہیں، قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا،

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ، (جاثیہ - ۲) | اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اسی لئے نفس کے تزکیہ و صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لئے شریعتِ محمدیؐ نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا، بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بُری خواہش سے پاک ہو جائے، کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بُری خواہش سے پاک ہو جائے تو اُس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی، اور نہ اُس کا کوئی محرک باقی رہے گا اسی لئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں، بلکہ ہر بُری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے، کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے، وحیِ محمدیؐ نے فرمایا،

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ، (قصص - ۵) | اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی،

پھر فرمایا،

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ | اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کر

عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ، (ص-۲) وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی،

عدل وراستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے، وہ اسی ہوئی کے زہر قاتل سے مرجاتی ہے، فرمایا :-

فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا (نساء-۲۰) عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو،

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اُس کے امن کی جگہ جنت ہی، فرمایا،

وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے

وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى کھڑے ہونے سے ڈرا، اور نفس کو بری

فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِىَ الۡمَاۡوٰى خواہش سے روکا، تو بیشک جنت ہی

(نازعات-۲) اُس کے امن سے رہنے کی جگہ،

اخلاق اور محبت الٰہی

دین ودنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو، یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہوسکتی ہے، ان میں دیگر ضروریات دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے، عقائد کے باب میں "محبت الٰہی" کے زیر عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہوچکا ہے، مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہی، اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہی کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے، اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے، مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں

داعیِ خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا،

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ	کہدو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ،	میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت
(آل عمران ۴)	کرے گا،

اس لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق، اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے، بلکہ نام بنام اُس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہین، اور اس دولت سے محروم کون ہین، اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ مین آتا ہے کہ اُن کامون سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہین حُسنِ خلق بھی ہے، اور ان امور مین سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے، بداخلاقی اور بدکرداری بھی ہے،

پہلی صف مین حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتین داخل ہین،

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ	(آلِ عمران-۷)	اور خدا ایمان والون کا دوست ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ	(بقرہ ۲۴ و مائدہ ۳)	خدا اچھے کام کرنیوالون کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ	(بقرہ ۲۸)	خدا توبہ کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ،	(آلِ عمران ۱۷)	خدا توکل کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ	(مائدہ ۶، حجرات)	خدا انصاف کرنے والون کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ	(توبہ ۱)	خدا تقوی والون کو پیار کرتا ہے،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ،	(اٰل عمران ۱۵)	اور خدا صبر کرنے والون کو پیار کرتا ہی
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ،	(توبہ ۱۳)	اور خدا پاک صاف رہنے والون کو پیار کرتا ہی
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ		خدا اُن کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ
فِیْ سَبِیْلِہٖ،	(صف ۱)	مین لڑتے ہین،

ان آیاتِ پاک مین نو باتین ایسی بیان کی گئی ہین کہ جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہین، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد،

حسب ذیل صفتین وہ ہین جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہین،

فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ،	(اٰل عمران ۴)	تو خدا کافرون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ،		خدا حد سے بڑھنے والون کو پیار
	(بقرہ ۲۴، مائدہ ۲۰)	نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ		خدا اس کو پیار نہین کرتا جو اترانے والا
مُخْتَالًا فَخُوْرًا،	(نساء ۶)	اور شیخی مارنے والا ہو
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا		خدا اس کو پیار نہین کرتا جو خیانت کا
اَثِیْمًا،	(نساء ۱۶)	گنہگار ہو،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ	(انفال ۷)	خدا خیانت کرنے والون کو پیار نہین کرتا،
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ		خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار
کَفُوْرٍ ۝	(حج ۵)	نہین کرتا،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ، (قصص ۸) خدا اترانے والون کو پیار نہین کرتا،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (قصص ۸) خدا فساد کرنے والون کو پیار نہین کرتا،

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ، (انعام ۱۷) خدا فضول خرچ لوگون کو پیار نہین کرتا

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ، (نحل ۳) خدا مغرورون کو پیار نہین کرتا،

إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ ۴) خدا ظالمون کو پیار نہین کرتا،

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ (بقرہ ۳۸) خدا ناشکر گنہگار دل کو پیار نہین کرتا،

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے مین حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیان ہین، جو انسان کو محبت الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہین،

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب مین محبت الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے،

تعلیم اخلاق

کے

طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی، یعنی لوگون کو سکھانا، اور بتانا، اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتون کا پابند اور بُری باتون سے روک کر، آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَيُزَكِّيهِمْ (بقرہ ۱۵) — وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا اور پاک وصاف کرکے نکھارتا ہے "

اور اسی لئے حدیث مین آیا ہے کہ

وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا، (ابن ماجہ باب فضل العلماء) — اور مین تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہون،

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقون سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا،

ایک کامیاب معلم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس مین اپنے موقع پر سختی، اور

نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے، اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے، اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے، اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا، مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے، تو اس کو سزا دیتے تھے،[۱] قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئیں بعض مسلمانوں نے ان کی سفارش کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دیتی تھیں، اور جب بڑے لوگ کرتے تھے، تو ان کے حکام ٹال جاتے تھے،[۲]

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا صحابہ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اس کو مارنے کو دوڑے، آپؐ نے روکا، اور فرمایا کہ تم سختی کیلئے

---

[۱] صحیح بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [۲] صحیح بخاری کتاب الحدود،

نہین بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلاکر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہین، یہ نجاست کے لئے موزون نہین، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہین، پھر لوگون سے فرمایا کہ اس پر پانی بہادو،[1]

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان مین بحالت روزہ ایک غلطی ہوگئی اس نے لوگون سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو، انھون نے کہا یہ ہم سے نہ ہوگا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کردو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہین، فرمایا، دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی مین تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلادو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہین، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ، اور اس سے صدقہ لے کر پہلے ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ، اور جو بچے وہ تم اور تمھارے گھر والے کھائین، وہ خوش ہوکر اپنے قبیلہ مین آیا، اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے، اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی،[2]

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہان حدود الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا، وہان نرمی نہین برتی جاتی تھی، لیکن جن امور مین وسعت ہوتی یا جہان مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ نرمی سے سمجھاتے اور لطف و محبت سے فرمادیتے تھے، ع

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول،

[2] ابوداؤد باب فی الظہار،

قاہری یا دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل ورذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے کہین کسی اخلاقی تعلیم کو حکم خداوندی بتاکر کہین اچھی اچھی مؤثر تشبیہون کے ذریعہ کہین اُس کے اچھے یا بُرے نتیجون کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے،

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم مین کہین فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور
الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی	رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بیحیائی
الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ	کی بات، اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ	سے منع کرتا ہے تمھین وہ نصیحت فرماتا
لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (نحل ۱۳)	ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو،

یہان اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے، اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور اُن سے بچو، تمام انسانون کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہین، یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کرین، اس تعمیل مین بندون کے چون وچرا کی گنجایش نہین،

تعمیل کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہون کے ساتھ، اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتون مین اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع

فضائل کی طرف مائل، اور رذائل سے روگردان ہو جائے، مثلاً خدا کی راہ مین دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یون کھینچی گئی کہ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ (بقرہ ۳۶-۳۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اگتا ہے اور ہر بال مین سینکڑون دانے ہوتے ہین، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑون ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے،

ریا و نمایش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے، اور نہ خدا کے ہان اس کا کوئی بدلہ ہے، قرآن نے اس کو یون ادا کیا،

کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ ۳۶-۳۶)

اسکی مثال ایسی ہو کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہان ذرا زور کی بارش ہوئی، تو بیج اور مٹی سب بہ گئی، اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا!!

بے ایمانی سے یتیمون کے مال کھا جانے کو یون ادا کیا "کہ جو ایسا کرتے ہین وہ اپنے پیٹ مین آگ بھرتے ہین" (نساء ۱-۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یون ظاہر کی "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے" (حجرات ۲)

کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی بُرائی کو یون ظاہر فرمایا ہے "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کرکے پھر چباتا ہے" اس سے زیادہ مکروہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے،

تیسرا اصول یہ کہ ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا، اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود

اگر عدالتِ نبویؐ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا، اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضورؐ نے تحقیقات کے بعد اُس کے سنگسار کئے جانے کا حکم دیا، جب وہ سنگسار ہو چکا، تو آپؐ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سُنا کہ "اُس کو دیکھو کہ خدا نے اُس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اُس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا، اور کُتّے کی طرح سنگسار کیا گیا،" حضورؐ یہ سُن کر خاموش رہے، تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی آپ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم یہ ہیں یا رسول اللہ! فرمایا تم اُترو، اور اُس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائیگا فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے[۱]

غیبت کی بُرائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر طرز کوئی ہو سکتا ہو؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور بُرے کاموں کے بُرے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار، اور بُرے کام کے ترک کا جذبہ اُبھرے اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے، مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا، تو اس کے بُرے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا "مسلمانو! شراب، جوا، اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے" (مائدہ ۱۲) شراب اور جوے کے بُرے نتیجے یہ ہیں کہ اُن کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے، اور

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الحدود ۱۲۰

انسان اُن میں پھنسکر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی ومالی بربادی ہوتی ہے،

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں، اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے، مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی، تو یوں فرمایا،

إِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوْهُ أَوْ	اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ	یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ بھی معاف
عَفُوًّا قَدِيْرًا، (نساء - ۲۱)	کرنے والا قدرت والا،

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے، مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے[1]،

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا نہیں،

ان اللہ جمیل یحب الجمال (صحیح مسلم و ترمذی)	اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے،

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۳۸۲،

اس لئے بندون کو بھی چاہیے کہ اپنے طور وطریق ولباس مین سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھین،

مسلمانون مین عزم واستقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ، (احزاب۳)	تمھارے لئے اللہ کے رسول مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

حق کے مقابلہ مین ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے کے نمونہ سے دی گئی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (ممتحنہ-۱)	تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون مین پیروی کا اچھا نمونہ ہے،

ان دونون آیتون مین اخلاق کی بعض صفتون کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کرکے اُس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور اُن کی پیروی کی ترغیب دی ہے،

فضول خرچی کی بُری صفت سے مسلمانون کو بچانا تھا تو اس کی بُرائی کو یون ذہن نشین کرایا،

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ، (بنی اسرائیل۳)	بے شبہہ فضول خرچ شیطانون کے بھائی ہین،

اب کون ہے جو شیطانون کا بھائی ہونا پسند کرے گا،

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبون سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی بُرائی اجاہل عربون کے ذہن نشین کردی، جابر بن سلیمؓ ایک صحابی دربارِ نبوت مین اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہین کہ مین نے دیکھا کہ مجلس مین ایک

شخص بیٹھا ہے جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجا لاتے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سُن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپ پر سلام (علیک السلام) آپ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، میں نے کہا کہ کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اُس اللہ کا رسول ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو، تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے، اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو، تو وہ اگا دیتا ہے، اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو، تمھاری سواری وہاں گم ہو جائے [؟] کرتے ہو تو وہ اس کو تمھارے پاس لوٹا دیتا ہے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کسی کو برا نہ کہو، جابرؓ کہتے ہیں کہ آپ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی برا نہیں کہا، آپ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کئے جاؤ اور تم کو چاہئے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمھارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے، اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے[1]، اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا، اور اگر تمھیں کوئی گالی دے، اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے تو تم اُس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ، کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہوگا[2]۔

---

[1] عرب امراء فخر و غرور کے لئے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی [2] سنن ابی داؤد، باب فی اسبال الازار،

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اُس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اُس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہون گے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پوچھنے والون کے جواب مین ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتین بتائین، حضرت جابر رضی کو جو تعلیم دی، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو، اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیرین بتائین،

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر، اُس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا، آپ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر،[۱] اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ہر شخص کا علاج اُس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص مین غصہ ہی اتنا ہوگا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی بُرائیان ہو جاتی ہون گی، اس لئے آپ نے اُس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر مین معمولی سمجھا، اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے ہر بار یہی فرمایا، کہ غصہ نہ کیا کرو،

ایک دفعہ حضرت ابو ذر رضی صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب کامون مین بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ مین جہاد کرنا، پھر پوچھا کہ کس غلام کا آزاد کرنا ...

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب، و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب،

کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے؟ فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا تو کسی بیکس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے، فرمایا کہ شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو، (ادب المفرد بخاری ص ۵۴ مصر)

کبھی آپ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپ ان کی اس توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی، ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا، لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی، اس پر تہمت لگائی ہوگی، اس کا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس کو مارا ہوگا، تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دے دیا جائے گا، اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اس کے ذمہ دار لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا، تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا،[1]

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے،

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو، لوگوں نے نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو

[1] صحیح مسلم، کتاب البر باب تحریم الظلم،

غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے،[1]

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم کس کو کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی،[2] احادیث میں ہے کہ جو بچے کمسنی میں مرجائیں، اور اُن کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں اُن کی شفاعت کریں گے، اس طریقہ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی،

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور بُرا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے، (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور بُرے لوگوں کے نام لیں گے) آپ نے دوسری بار بھی سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا ہاں، یا رسول اللہ فرمائیے! ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی اُمید کی جائے، اور جس کی بُرائی سے لوگ امن میں ہوں، اور تم میں سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے، اور جس کی بُرائی سے کوئی امن میں نہ ہو؟[3]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر اُن پر عمل کرتا ہے، اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ اُن پر عمل کریں، ابو ہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول! ابو ہریرہؓ

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب [2] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب [3] ترمذی: اواخر کتاب الفتن صحیح

کہتے ہیں کہ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اُس پر راضی رہو، تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[۱] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں[۲]! کون جانتا ہو کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اُٹھے ہوں گے، ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے، اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بیحیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کیجائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے،

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپکے غلام ثوبانؓ نے اٹھکر کہا میں اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ نہ مانگا کرو، چنانچہ انھوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا[۳]

سب کو معلوم ہے کہ ارض حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے

[۱] جامع ترمذی ابواب الزہد [۲] صحیح بخاری باب حفظ اللسان [۳] مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵

کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا، لوگو! آج کون دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر پوچھا یہ کون مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے، فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں، سب نے کہا جی ہاں پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے، پھر سب خاموش رہے، کہ آپ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ کیا یہ بلد الحرام نہیں، ہے، سب نے کہا جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی، تو فرمایا مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لئے ایسی ہی محترم ہے، جیسا یہ دن اس مقام میں اور اس مہینہ میں[1]

کبھی خاص خاص صاحبوں کو اُن کی مناسبتِ طبع دیکھ کر خاص، خاص طور کی نصیحتیں فرماتے

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، اُن کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا! اے ابوذر! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو، بُرائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اُس کو مٹا ڈالو گے، اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو،[2]

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ

---

[1] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ [2] ترمذی باب ما جاء فی معاشرۃ الناس،

دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے۔[1]

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی، اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی،

کبھی آپ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں، وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی، اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی، (سورۂ ممتحنہ ۲)

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آپ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ "ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے، اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے، اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"[2]

یہی عبادہ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپ نے نقیب بنایا، تو ان میں سے ایک میں بھی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی "ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے، اور

---

[1] ترمذی فی صنائع المعروف [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۱۸،

نافرمانی نہ کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے، تو ہمیں جنت ملیگی، اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے[1]" اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا،

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے، سوال سُن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دیتے تھے، دریافت فرمایا کہ افترا کس کو کہتے ہیں۔ پھر خود ہی فرمایا وہ چغلی ہے، " لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے اودھر پہنچانا[2]" ایک بار ارشاد ہوا، "کہ تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں"، لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اُس کا رسول جانتا ہے"، فرمایا تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اُس کو ناپسند ہو" کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ بُرائی واقعی موجود ہو تو فرمایا اگر اس میں ہے، تب ہی تو وہ غیبت ہے، ورنہ پھر وہ بہتان ہے[3]، ایک موقع پر ارشاد ہوا "میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر کمزور و نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو، لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اُس کی قسم پوری کردے، پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ فرمایا ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور[4]"،

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے، اور اُس کو بار بار دہراتے،

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۱۵ کتاب الدیات [2] صحیح مسلم باب تحریم النمیمہ [3] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ [4] صحیح مسلم باب جہنم،

حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اُس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے، اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے؟ اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر اُن کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا، ایک دفعہ خود سے فرمایا "خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا" صحابہ نے مشتاق ہو کر پوچھا کہ کون یا رسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اُس کی بُرائیوں سے امن میں نہ ہوا۔[1] ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے" صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کس کے ساتھ، فرمایا اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ، اور عام مسلمانوں[2] کے ساتھ"۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین [2] ایضاً بحوالہ صحیح مسلم۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصا کیا جائے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے حقوق، فضائل و رذائل اور آداب،

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں، اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں،

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن، اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے، اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں ہے

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے، اس کو آداب کہتے ہیں، مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور و طریق،

ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے:

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی

حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہو کہ اس کی مزید تفصیل کردی جائے قرآن پاک مین اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝ (بقرہ ـ ۳)	خدا نے تمھارے (کام کے) لئے زمین کی ساری چیزین پیدا کین،

اس لئے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اُس کے نفع کا تعلق ہے، یک گونہ لگاؤ ہو اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہو کہ اس کی ترقی و حفاظت مین کوشش کی جائے، اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے، اور ان موقعون پر اُس کو صرف کیا جائے جن مین خدا نے اُس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے، اور اُس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اُس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام حق ہے، جس کو ادا کرنا ضروری ہے ارشاد ہوا،

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات ـ ۱)	اور اُن کے مالون مین سائل کا اور اس کا حق ہو جس پر مالی افتاد پڑی ہو

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور
حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ	اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی تنگی
الْمَحْرُوْمِ (معارج-۱)	پڑی ہو،
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ	اور قرابت والے کو اس کا حق دے
الْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (بنی اسرائیل)	اور مسکین کو اور مسافر کو،
فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ	تو قرابت والے کو اس کا حق دے
وَابْنَ السَّبِیْلِ (روم-۴)	اور مسکین کو اور مسافر کو،

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اُس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے، اُن کو اُس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ اُن کا حق ہے، اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے،

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وَ	اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن
تُسْرِفُوْا، (انعام-۱۷)	ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو،

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا، اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی، اور پھل پھول نکلے، اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے، اور اس میں اُن کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی، اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کر کے ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے، اور اس

کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچانا ہے،

حدیث میں آتا ہے:۔

اِنَّ لِزَوجِكَ عَلَيكَ حَقًّا وَ	تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق، اور تیرے
لِزَورِكَ عَلَيكَ حَقًّا (بخاری صوم)	ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے،
وَلِاَهلِكَ عَلَيكَ حَقًّا (" ")	تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے،

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اُس کو کھانا کھلائے، کپڑے پہنائے، اور اُس کے چہرہ پر تھپّڑ نہ مارے" (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں، بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے اُس کے ایک ایک عضو کا اُس کے اوپر حق ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

فَاِنَّ لِنَفسِكَ عَلَيكَ حَقًّا (بخاری صوم)	بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے
فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيكَ حَقًّا وَلِعَينِكَ	تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیری
عَلَيكَ حَقًّا، (" ")	آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے،

حقوق کی وسعت | جب انسان کا تعلق کائنات دنیا کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے کہ اُس کی ذمہ داری بھی اُس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو اُگنے و نشو و نما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی

اُن کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے، اور اُن کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے، اور انسانون سے بھی کہ اُن کی ہر ضرورت مین مدد کی جائے، اور اُن کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے، اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس سے مناسب طور سے وہ کام لے،

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات مین اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آ کر ختم ہو جاتا ہے،

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہین، لیکن انسان کے علاوہ اس کائنات ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزون کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیح مقصد کے لئے مفید ہے،

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزون کے دو حق انسان پر ہین، ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہین، اُن سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ اُن کے قدرتی نشو و نما، پرورش اور ترقی مین وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اُس کے مناسب اسباب فراہم کرے، اور اس کے مناسب غذا، سیرابی، اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونون حقوق کلام پاک کی اسی حقیقت سے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا، (بقرہ-۳)

زمین مین جو کچھ ہے وہ سب اسنے تم (انسانون کے) لئے پیدا کیا،

سے مترشح ہین کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزین پیدا ہوئین، تو انسان کا فرض ہے کہ

اُن سے وہی کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئین، اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانون کو اپنا نفع پہنچا سکین، اُن کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے مجمع مین ایک تمثیلی حکایت مین اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ "ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعۃً اس نے منھ پھیر کر سوار سے کہا کہ مین تو اس کے لئے پیدا نہین کیا گیا، مین تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہون[1]" اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا، فرمایا گیا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہین، اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]" اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]،

ایک اور تمثیلی حکایت مین آپ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اُس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی، اور ایک اور شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھا، اور اس کو کھانے پینے کو نہین دیا، یہان تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اُس پر اس سے بازپرس ہوئی[4]

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہین تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعہ جلد اوّل ص ۳۱۲ [2] صحیح بخاری و مسلم باب مذکور، [3] فتح الباری شرح صحیح بخاری شرح مذکور، جلد خامس ص ۷، مصر [4] یہ دونون واقعے صحیح بخاری مین ہین،

دائرہ کتنا وسیع ہے، وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی،

حقوق کی ترتیب | مگر ان تمام حقوق کی ادائگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے، جس کی تفصیل ذیل میں ہے،

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو تورات و انجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف "محبت کرنا" کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے جو اس محبت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے، آپ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو، جو اپنے لئے رکھتے ہو"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جسم وجان اور مال وملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم وجان اور مال وملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لئے چاہنا اور پسند کرنا تورات وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے، اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جس کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے، اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی، اور دوری ونزدیکی کی تاریخ اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے، مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی، ؕ ایک

---

[1] صحیحین کتاب الایمان،

اجنبی شخص کے مقابلہ مین ایک دوست کی غیرون اور بیگانون کے مقابلہ مین ایک عزیز کی، اوران عزیزون مین بھی قرابت کی دوری ونزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ مین اس غیر وبیگانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بناپر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح مین عصبیت (تعصب) ہے، جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے،[1]

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مین انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہین ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہین قائم کیا گیا ہے، مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیم مین انسان اور حیوان کے، اور پھر انسانون مین اہل ملک، قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہین، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس مین کوئی دفعہ نظر نہین آتی اسی طرح ہندو قانون مین ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے، اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی مان کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت مین تمام قرابت دارون کو چھوڑ کر صرف مان باپ کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کے برتر انہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت مندون اور رشتہ دارون کو ان مین کوئی مرتبہ نہین دیا گیا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ مین پوری تفصیل سے کام لیا ہے،

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب مین جس کا درجہ بڑھکر ہے، اس کے ساتھ

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ،

تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے، مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے، ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے، اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے، جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں، اور اسی ترتیب سے ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے، یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّ	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور
بِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَ	رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں
الْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ	کے ساتھ، اور رشتہ دار پڑوسی
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ،
بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَ	اور ساتھی کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ،
مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء)	اور لونڈی غلام کے ساتھ؛

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	اے پیغمبر اُن سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو،
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ	وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ	یتیموں، اور غریبوں، اور مسافر کے
السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ	لئے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو، اللہ
خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲۶)	اس سے آگاہ ہے،
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا	کا، اور مسافر کا اور فضول خرچی
(بنی اسرائیل ۳)	نہ کر،

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے، اور اسلام مین بھی اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے، مگر اس کی تکمیلی شان اس باب مین بھی اسی طرح نمایان ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب مین،

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں اُن کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اُن کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے، تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے،

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تا کہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، دراز ہو، (خروج ۲۰-۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے،

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے، اس کا خون اسی پر ہے" (احبار ۲۰-۹)

اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے، (خروج ۲۱-۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا، اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے، بلکہ اُن کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا،

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے، پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھکو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا، اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے، تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا (متی ۱۵-۴ تا ۶)"[1]

نبوتِ محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اُس نے توراۃ وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور اُن سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی، بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی، اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی، اور حمل، وضعِ حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دلدہی کرنے اور اوس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

[1] اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹-۱۹- مرقس ۷-۱۰ و ۱۰-۱۹ لوقا ۱۸-۲۰،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے
حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّ	واسطے تاکید کی، اس کی ماں نے اس
فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ ؕ	کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا
(لقمان-۲)	اور دو برس تک دودھ پلایا،
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ
إِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ	اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے اس
كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ	کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ
وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ	پیٹ میں رکھا، اور تکلیف کے ساتھ
شَهْرًا ؕ	جنا، پیٹ میں رکھنا، اور دودھ پلا کر
(احقاف-۲)	چھڑانا تیس مہینے میں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کی پھر کون فرمایا تیری ماں! تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ[1]! ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سر فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا، اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب،

حرام کی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مین نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری مان زندہ ہے؟ جواب دیا نہین، دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی ہے، فرمایا تو اُس کے ساتھ نیکی کر، یہی اسکی توبہ بتائی، ایک اور صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! مین نے جہاد مین شرکت کا ارادہ کیا ہے، اور آپ سے مشورہ چاہتا ہون، فرمایا کیا تمھاری مان ہے؟ جواب اثبات مین دیا، فرمایا، تو اُسی سے چمٹے رہو کہ جنت اُس کے پاؤن کے پاس ہے؟

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مین مخلوقاتِ انسانی مین جنسِ لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے، اور یہ برتری بالکل فطری ہی، انسان سب سے زیادہ اپنے وجود مین جن کا ممنون ہے، اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہین، وہ خالقِ اکبر کی علتِ فاعلہ ذات کے بعد مان اور باپ ہین لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحون اور چند قطرون سے زیادہ نہین، مگر مان وہ ہستی ہے جس نے اُس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا، اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہکر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ مین رکھا، پھر اُس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر اس نو پیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتیون سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا، اور اوسکی پرورش اور خورد و پرداخت مین اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک، اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی، ایسی حالت مین کیا مان سے بڑھ کر انسان اپنے وجود مین مخلوقات مین کسی

۱؎ صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب ۲؎ جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ ۳؎ ترغیب ترہیب منذری جلد ۲ ص ۳۷۴ بحوالہ

اور کا محتاج ہے، اس لئے شریعت محمدی نے اپنی تعلیم مین جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے، وہ اُس کی سزاوار ہے،

۲۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی، بچہ کی تولید و تکوین مین شریک ہے، وہ باپ ہے، اور شک نہین کہ اس کی نشو و نما اور تربیت مین ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششین شامل ہین، اس لئے جب بچہ اُن کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے، تو اُس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت مین ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح اُن کی "عزت" کرنے اور اُن سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ اُن کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہان تک تاکید کی کہ اُن کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤن کو اپنے حق مین قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے، بلکہ ان ہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے، قرآنِ پاک مین والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتون مین نازل ہوئی ہے، اور اکثر موقعون پر تعلیم توحید اور خداپرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے، کہ پہلی تخلیقِ انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ مین ہے، جس مین تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے فرمایا:

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶) ابنِ ماجہ و نسائی و حاکم،

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ	کہ تم نہ پوجو گے، مگر اللہ کو، اور ماں
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بقرہ۔۱۰)	کے ساتھ نیکی کرو،

یہ آیتِ پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے، جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں، بلکہ نیکی کرنے کا وسیع المعنیٰ لفظ ارکھا گیا ہے، جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے، اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزت کا مفہوم اُس کے اندر پیدا ہے،

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ	فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (الآیہ)	ماں، باپ اور رشتہ داروں
(بقرہ۔ ۲۶)	(وغیرہ) کے لئے،

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا	اور اللہ کو پوجو، اور اس کے ساتھ
بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	کسی کو شریک نہ بناؤ، اور ماں باپ
(نساء۔ ۶)	کے ساتھ بھلائی کرو،

کفّار کو جنھوں نے اپنے وہم وخیال اور رسم ورواج سے حلال وحرام کی ہزاروں

رسمی وخیالی باتین پیدا کرلی تھین، اللہ تعالیٰ خطاب کرکے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزین حرام نہین، آؤ ہم بتائین کہ حقیقت مین حرام چیزین کیا ہین، خدا کے ساتھ شرک کرنا، اور مان باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا،

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج (انعام-۱۹)	کہہ (اے پیغمبر!) آؤ مین تمھین پڑھکر سناؤن کہ تمھارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اور مان باپ کے ساتھ نیکی کرنا،

معراج کے احکام دوازدہ گانہ مین خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دیجاتی ہے کہ اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، اُن کے حق مین دعاے خیر کرو، اور بڑھاپے مین اُن کی خدمت کرو، فرمایا،

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ه و	اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، مان باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر اُن مین سے ایک یا دونون تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائین تو انکو اُف بھی نہ کہو، اور نہ ان پر خفا ہو اور

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ۝

(بنی اسرائیل - ۳)

ان سے ادب سے بولو، اور اُن کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ، اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو اُن پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے،

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بُری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی، اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ اس شرک کی دعوت دیں تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے، ارشاد ہوا،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

(عنکبوت - ۱)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اگر وہ تجھکو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھکو علم نہیں، تو ان کا کہا نہ مان تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمھارے کرتوت سے آگاہ کروں گا،

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمھارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں

تو صرف ان کی اُس دعوت کو قبول نہ کرو لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک مین کوئی فرق نہ آنے پائے بلکہ وہ اس حالت مین بھی اپنی جگہ پر قائم رہے، فرمایا

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى	ان باپ کے ساتھ نیکی کرو، اسکی
وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَيْنِ	مان نے اس کو تھک تھک کر
اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَيْكَ	پیٹ مین رکھا، اور دو سال مین
اِلَیَّ الْمَصِيْرُ، وَاِنْ جَاهَدٰكَ	اس کا دودھ چھڑایا کہ وہ میرا اور اپنے
عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَيْسَ لَكَ	مان باپ کا احسان مانے میرے
بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونون اس
وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْيَا	پر تجکو مجبور کرین کہ میرے ساتھ اسکو شریک
مَعْرُوْفًا	جسکو تو نہین جانتا تو انکا یہ کہنا مان اور دنیا
(لقمان - ۲)	مین ان کیساتھ بھلائی سے گذران کر،

اس اہتمام کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسانمندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب مین ان کی بات اولاد نہ مانین، مگر دوسری دنیاوی باتون مین اُن کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بناپر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لاکر حسنِ خاتمہ پر مرے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ،	اے میرے پروردگار مجھے اور میرے
(ابراھیم-۶)	ماں باپ کو بخشدے،

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی،

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ،	میرے پروردگار مجھے اور میرے
(نوح-۲)	ماں باپ کو بخشدے،

اس لیے والدین کے حسنِ خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہیں، ان کی خدمت بجالاتے ہیں، اور ان کے لیے خدا سے دعاے خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت اُن کو عطا فرماتا ہے،

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو تاکید کرکے کہہ دیا
إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ	کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا،
كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ	اس کی ماں نے اُس کو تکلیف کرکے
وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ	پیٹ میں اٹھایا، اور تکلیف کرکے
شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ	جنی، اور تیس مہینوں تک اُس کو

وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً، قَالَ
رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ
وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ
صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ
فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ
وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ
مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ
سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ
وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا
يُوْعَدُوْنَ ۝

(احقاف-۲)

پیٹ میں رکھنا، اور دودھ چھڑانا،
یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان
ہوا، اور چالیس برس کا ہوا، اُس نے
کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے
کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں
جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ
پر کیا، اور اس کی کہ میں وہ کام کروں
جس کو تو پسند کرے، اور میری اولاد
نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر
آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں،
یہی وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول،
اور اُن کے بُرے کاموں سے درگذر
کرتے ہیں، یہ جنت والوں میں ہوں گے،
یہ سچائی کا وہ عہد ہے، جس کا اُن سے

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہانی بتایا ہے، جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کبھی

فرمایا ہے کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت[1] ہے" کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے" کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حُسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے، فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گذارش کی پھر کون، چوتھی بار فرمایا تیرا باپ، اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے، ایک دفعہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) مجلسِ قدس میں تشریف فرما تھے، جاں نثار حاضر تھے، فرمایا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا صحابہؓ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی، ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی، پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا، پھر کون، فرمایا خدا کی راہ میں محنت اٹھانا، (جہاد)

ایک دفعہ آپ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلادھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اُس غار کا منہ بند ہو گیا، (اب اُن کی بیکسی دیکھا دگی اور اضطراب وبیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، اُن کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی)

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد ونسائی وبیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلہ،

اس وقت انھون نے پورے خضوع وخشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی مین دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا بار الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے، اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، مین بکریان چراتا تھا، اور انہی پر اُن کی روزی کا سہارا تھا، مین شام کو جب بکریان لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت مین لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچون کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ مین بکریان چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے، مین دودھ لے کر اُن کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت مین خلل آجاتا، اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت اُن کی آنکھین کھلین اور دودھ مانگین، بچے بھوک سے بلک رہے تھے، مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہون مین اسی طرح پیالہ مین دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ مین نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی، اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافرون کی باری آئی، اور انھون نے بھی اپنے نیک کامون کو وسیلہ بنا کر دعا کی، اور غار کا منہ کھل گیا،

اسلام مین جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے، مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہین کہ جہاد کے میدان مین سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے، اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے، اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر اُن کو اپنے جسم وجان کے کھونے کا حق نہین جس کو اُن کی خدمت گذاری

کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، اسی لئے ابھی اوپر گذرچکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی، دریافت فرمایا کہ تمھارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو،

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے، احادیث میں بھی اُس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے، صحابہؓ سے فرمایا کہ "تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے" ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں، انھوں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ فرمایا "خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا" آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے، اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی، اور ہاں جھوٹی گواہی"[1]

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے، جو بیحد سخت تھے، وحیِ محمدی نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کر دی ہے، اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں، اور مجرم کو اپنے فعل پر نظرِ ثانی کی تا زندگی مہلت

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتبِ حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیت کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلہ، جامع ترمذی کتاب البر والصلہ، مشکوٰۃ باب مذکور،

ملتی ہی، لیکن اگر اوس نے اس مُہلت سے فائدہ نہ اٹھایا، تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون مین ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتون میں وہ اس کے قصاص مین قتل نہ ہوگا، بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے، اس کا مقتضا یہی ہر کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے، تاآنکہ اُس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو،[1]

اسی سلسلہ مین ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہی، توراۃ نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کردیا ہے، لکھا ہی،

"اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا، اور اپنی جورو سے ملا رہے گا، اور وہ ایک تن ہون گے، (پیدایش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینون سے ناآشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ مین ہے، ماں باپ کے مقابلہ مین بیوی کی طرف داری

---

[1] فقہاے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہین، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہین لیا جائیگا، امام مالکؒ کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہی ورنہ نہین اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت مین قصاص ہی، اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہی اصل یہ ہی کہ باپ کی وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہی اس لئے اکثر فقہا نے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجاے اس پر دیت لازم کی ہے، الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سو قصد کو ظاہر کرتے ہون،

اور حمایت کی، اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا، (مرقس، ۱۰۔ ۷ و ۸) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو، اور اس لئے ان دونوں مین سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس سوال مین بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جا سکتا، اور مٹ کر بدل سکتا ہے لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھین جن سے وہ راضی تھے، مگر اُن کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھین اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کرین،

اولاد کا حق

اصولی تعلیم جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں، اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں، اور یہ وہ عنوان ہے، جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا، اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذہب لیکر تشریف لائے اُس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے، ان حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے، یہ متن اُن سب پر محیط ہے، فرمایا،

لیس منا من لم یرحم صغیرنا	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے
ولم یوقر کبیرنا	اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے
(ترمذی)	وہ ہم میں سے نہیں،

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئین اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کرین یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹون اور بڑون کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام مین قائم کی گئی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت مین چھوٹون، بڑون، افسرون، ماتحتون، آقاؤن، نوکرون اور بزرگون اور عزیزون کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹون اور بڑون مین کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونون پلڑون مین توازن قائم نہین رہا ہے، حکیمون اور مقننون کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون، اور قاعدون کا بے پایان دفتر جو کام نہین کرسکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہین، اور دیتے ہین، اگر واقعاً کسی جماعت مین یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونون کا بارگران بھی پھر اس کو برابر نہین کرسکتا،

اولاً سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے اُن کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اُس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنین، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشو و نما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کرین جو ان کی قوت اور استطاعت مین ہے، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہین سمجھا ہے، اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے،

اولاد کشی کا انسداد عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا، یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے، اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو مذہبی تھا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کے اُن پر چڑھا دیتے تھے منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچہ[1] کی قربانی کریں گے، یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں "اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا، اس قتل کی کوئی بازپرس نہ تھی، اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج[2] تھا" ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے، اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا، اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کیلیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں، قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے[3]

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ	(جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں
الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ	خدا ے برحق کے ساتھ اُن کے دیوتاؤں

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ، کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا قصہ نیز موطا امام مالک باب ما لا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ [2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص۲۳
[3] کشاف زمخشری تفصیل آیت ذیل،

شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ	نے اپنا حصہ لگایا ہے) اسی طرح بہت سے
وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ	مشرکون کو ان کے دیوتاؤن نے یہ بات
وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ	خوبصورت کرکے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ	کو قتل کردین تاکہ یہ دیوتا انکو (ہمیشہ کیلیے)
	ہلاک کردین اور انکے دین کو ان پر مشتبہ
(انعام - ۱۶)	کردین اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے
	تو ان مشرکون کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے
	ہین کہ خدا نے انکو ایسا حکم دیا ہے اسکو چھوڑ دے،

اسی سلسلہ مین آگے چل کر خدا فرماتا ہے،

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْآ اَوْلَادَهُمْ	گھاٹے مین ہین وہ جنھون نے اپنی اولاد کو
سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام - ۱۷)	نادانی سے بے جانے قتل کیا،

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربون کا عام فقر و فاقہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہوگی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہوگا، اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے، نبوت محمدیؐ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہین کھلاتا، بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے، اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ — اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ

اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود ۱) — اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے،

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی،

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ — اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے

اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ — مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو انکو اور تمکو

وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ — دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا

خِطْاً كَبِيْرًا (اسرا ع-۴) — بے شبہہ بڑا گناہ ہے،

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنھوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں؟

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ — کہدے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھکر

عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ — سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے

شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا — تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ — شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ

اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ — اچھا سلوک کرنا، اور مفلسی کے ڈر سے

وَاِيَّاهُمْ — اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور انکو

(انعام-۱۹) — دونوں کو روزی دیتے ہیں،

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد، فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی[1]، یہ جواب حقیقت میں آیت بالا کی تفسیر ہے، ان ہی تعلیمات اور نبوت کے اس پرتو فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق خدا ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے، اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو گئی،

اولادکشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمھاری شرم کا باعث ہو، اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے،

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ	اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے
لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ	کی خوشخبری دیجائے جسکی وہ رحمت والے
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ	خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر
(زخرف - ۲)	غصہ کے مارے اسکا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورہ بقرہ و سورہ فرقان و کتاب الادب کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان،

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم وعار کے مجسمہ کو پردۂ خاک مین چھپا کر باپ اس مصیبت
سے نجات پانے کی فکرین کرتے، قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان
الفاظ مین کھینچا ہے،

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى	اور جب ان مین سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری
ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ	دیجاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور
كَظِيْمٌ ، يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ	غصہ کے گھونٹ پی کر رہجاتا ہے، اس
مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ	خوشخبری کے رنج سے وہ لوگون سے منہ
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اسکو
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ	اپنے پاس رہنے دے یا اسکو مٹی مین
(نحل - ۷)	چھپا دے (یعنی زندہ دفن کردے)

یون تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب مین تھا، مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف
کہتے ہین کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم مین اس کا رواج سب سے زیادہ تھا[1]، بنو تمیم کے
رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا کہ انھون نے اپنے ہاتھ
سے آٹھ دس لڑکیون کو زندہ دفن کیا ہے[2]، یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ص ۲۲۳ وکتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۱۰۰ مطبعۂ
خیریہ مصر زیر مثل اضل من موؤدۃ [2] ابن جریر وابن کثیر و درمنثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز
و مصنف عبد الرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر،

انجام دیجاتی تھی، اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[1] ہے کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے، اور اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، جب میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے پاس آتی، ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی، میں آگے بڑھا، اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا، جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا، اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہکر پکارتی رہی، اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی"۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس پُردرد افسانہ کو سنکر آنسو ضبط نہ کر سکے، ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضور کو غمگین کر دیا، فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر اُن صاحب سے فرمایا "ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر تو سناؤ"۔ انھوں نے دوبارہ پھر بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریشِ مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے، اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو"۔

[1] سنن دارمی صفحہ اول، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے۔

قبیلۂ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مین نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیان زندہ دفن کی ہین، فرمایا اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس اونٹ ہین، فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ مین ایک اونٹ قربانی کرو"[1]

مردون کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتین بھی اس جرم مین مردون کی شریک تھین، مائین خود اپنی لڑکیون کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھین، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے،

مالقی الموؤدمن ظلم اُمّہ ۔۔۔ کما لقیت ذھل جمیعا وعامر

زندہ دفن ہونے والے بچے نے اپنی مان کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہین اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی خدمت مین ایک عورت نے آکر کہا کہ مین نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کرون گی، فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفارہ دے دو"[2]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیون نے ایسی لڑکیون کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا، اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس مین بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آیا تو عرض کی یا رسول اللہ!

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبد الرزاق و بزاز و در منثور سیوطی بحوالہ مسند بزاز و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ۔

مین نے اسلام سے پہلے ۔ ۳۰۰ لڑکیون کو خرید کر موت سے بچایا ہے ، کیا مجھ کو اسکا ثواب ہوگا ، فرمایا ! ہان تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے[1] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیمی کے پیرو تھے ، وہ بھی اس قسم کی لڑکیون کو اپنے آغوشِ شفقت مین لے لیتے تھے ، اور انکی پرورش کرتے تھے ، جب وہ بڑی ہو جاتی تھین تو وہ ان کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو مین تم کو واپس کر دون ، چاہے ان کو میرے ہی پاس رہنے دو[2] ، یہ شخصی کوششین تھین ، جو ملک مین بار آور نہ ہوئین ، لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتون کے موسم پر ہمیشہ کے لیے خزان چھا گئی ،

لوگ عموماً لڑکیون کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے ، نبوتِ محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئین ، فرمایا "جو کوئی ان لڑکیون مین سے کسی لڑکی کی مصیبت مین مبتلا ہوا اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی اور وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بنکر حائل ہو جائے گی"[3] نیز فرمایا "جو دو لڑکیون کی بھی پرورش کرے یہانتک کہ وہ جوان ہو جائین تو قیامت مین میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیون کو اٹھا کر فرمایا کہ یون برابر ہوگا"[4] غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے ننگ و عار کا موجب تھی ، عہد محمدیؐ

---

[1] تفسیر درمنثور بحوالہ طبرانی ، تفسیر سورۂ واذا الشمس کورت[2] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اصفحہ ۵۴۰

[3] صحیح بخاری کتاب الادب ، صحیح مسلم کتاب البر[4] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق ،

مین آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی،

ان اخلاقی نصیحتون کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپ نے عورتون اور مردون سے بیعت لی، صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتین اسلام لائین ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس مین ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ (ممتحنہ) "کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرین گی" چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتون سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن جب عورتین فوج در فوج اسلام کے لیے حاضر ہو رہی تھین تو آپ نے عورتون سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انھون نے اقرار کیا،[1] عید کے اجتماع عام مین عورتون کے مجمع مین آپ تشریف لائے، اور دوسری باتون کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا[2] کہ وہ قتل اولاد کی مرتکب نہ ہون گی، دوسرے موقعون پر بھی جو خاتونین دربار رسالت مین حاضر ہوتین ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا[3] بعض روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحین تھین ان مین ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ مین سب سے پہلے انصار سے جن باتون پر عہد لیا گیا تھا، ان مین ایک یہ بھی تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرین گے"[4]

حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت مین

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۲۶، تفسیر سورہ ممتحنہ، صحیح مسلم باب بیعۃ النساء، [2] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۳۳، باب عظۃ الامام النساء یوم العید، [3] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمی بنت قیس، [4] تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۳۴۳ بر حاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۴۴ علی شرط مسلم،

حاضر تھے، آپ نے فرمایا کہ "ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کروگے، بدکاری نہ کروگے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کروگے، جو اس عہد کو پورا کریگا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے، اور اگر کسی نے ان مین سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفّارہ ہو جائے گا، اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا مین مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخشدے چاہے عذاب دے[1]" صحابہ سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤن کی نافرمانی اور لڑکیون کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے[2]"

ان تمام تدبیرون کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتون، ان تمام سنگدلیون اور ان تمام سفاکیون کو مٹانے مین وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہین کرسکتی تھین، قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہین، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمالنامے شہادت مین پیش ہین کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیان خون سے رنگین کپڑون مین آکر کھڑی ہو جاتی ہین شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم مین ماری گئین،

وَاِذَا الْمَوْءُدَۃُ سُئِلَتْ یاد کرو جب (قیامت مین) زندہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان وباب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۱۸، [2] صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل،

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ، (تکویر)

دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی،

کس درجہ بلیغ اور موثر طرزِ ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کردیتے تھے، یا یہ زمانہ آیا کہ اداے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے، اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے، اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے، حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہئے کہ حمزہ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دیدیتے ہیں، کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے[1]"

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی جس کی پیدائش کی خبر سُن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑجاتا تھا، اور وہ لوگوں کے مجمع میں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا، یا یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعۃً چار چار گود خالی ہوجاتے ہیں، اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک

[1] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء،

کا ذریعہ بنتی ہے،

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ	(جنت اُن کو بھی ملے گی جو......)
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا	جو کہتے ہیں، کہ ہمارے پروردگار ہماری
قُرَّةَ اَعْیُنٍ،	بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں
(فرقان-۶)	کی ٹھنڈک عنایت فرما،

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا،

غدا الناس مذ قام النبی	پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہی
الجواریا،	کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں،

رضاعت وحضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اُس کی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے، اس کی خبر گیری کی جائے، اور اس کے بعد اُس کی نابالغی کے زمانہ تک اُس کی نگرانی، اور اُس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے، تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیرخوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے، اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو، تو باپ پر اُس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا، اور اس شیرخوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی

مقرر کردی گئی ہے،

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ	دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لئے ہے
يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُودِ	جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری
لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ	کرے، اور لڑکے والے (باپ) پر ان
	دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا
(بقرہ ع ۳۰)	دستور کے مطابق واجب ہے،

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا، اور اُس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے، فرمایا،

وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَ	اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں،
أَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ،	جنہوں نے تم کو دودھ پلایا، اور تمہاری
(نساء ع ۴)	دودھ شریک بہنیں،

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو و نما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے، کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے،

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری

باپ پر ڈالی گئی ہے، تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے، اور باپ نہ ہو تو دادا پر، اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے،

تعلیم و تربیت

ظاہری اور جسمانی نشو و نما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے، کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے
وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (تحریم-۱)	اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ،

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگِ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن تمام بُرائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے،

خدا نے اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بارِ الٰہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حسن، صورت و سیرت کی خوبی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا،

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا	اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں

مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ	کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری
اَعْيُنٍ ٥	بیویوں اور ہماری اولادوں کی طرف سے
(فرقان - ۶)	آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما،

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادتمندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہئے، ایک سورہ مین خدا ارشاد فرماتا ہے، کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق مین مغفرت کی دعا مانگتے ہین، اور اُن کی خدمت کی توفیق چاہتے ہین، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق مین اپنی کوششون کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہین

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ	اور (اے خداوند!) میرے لئے میرے
اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ	کامون کو میری اولاد مین صالح بنا،
الْمُسْلِمِيْنَ ٥	مین اپنے گناہون سے تیری طرف با
(احقاف - ۲)	آیا، اور مین فرمانبردارون مین ہون،

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب مین وحی الٰہی کے مقصود کو تعلیم زبانی یا کر مختلف طریقون سے واضح فرمایا،

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربار نبوی مین آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا کیا آپ

بچّون کو پیار کرتے ہین، میرے دس بچے ہین، مین نے اُن مین سے کسی کو پیار نہین کیا حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہین کرتا، اس پر رحم نہین کیا جاتا"؛[1] دوسری روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے، تو مین کیا کرسکتا ہون"؛[2] ان دونون کا منشا یہ ہے، کہ بچّون کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے، کہ جو اپنے بچّون پر رحم نہین کرتا خدا اُس پر رحم نہین کرتا،

ایک دفعہ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیان بھی تھین، اس وقت کاشانۂ نبوی مین ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، اُمّ المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اُس کے نذر کردی، ماں کی ماتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے، اور ان ننھی جانون کو اس سدِ رمق سے محروم رکھے، اُس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کرکے دونون بچیون کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے، تو یہ واقعہ عرض کیا، حضورؐ نے سُن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیون کی کوئی مصیبت پیش آئے، اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لئے آڑ بن جائین گی، نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیون کی پرورش کرے، یہان تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائین تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہوگا، کہ وہ اور مین (دو انگلیون کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوے

---

[1] و [2] یہ دونون روایتین صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الوالدین مین ہین، نیز دیکھو ابوداؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ،

ہون گے[1]، اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے، ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہین دیسکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے[2]،

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے، اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اسے جنت مین داخل فرمائے گا[3]، باہم لڑکون مین بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعتِ محمدی مین قائم نہین، اسی لئے دنیا کی اکثر شریعتون اور قانونون کے برخلاف اسلام مین بڑے اور چھوٹے کے امتیازی حقوق نہین کہ ہر ایک کو ان مین سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہان تک کہ اگر لڑکون مین سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکون مین سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو، انھون نے خدمتِ اقدس مین حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچون کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہین، فرمایا تو مین ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ ہون گا[4]،

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات [2] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی ادب الولد

[3] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً [4] ابوداود کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل،

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیون، رومیون، ہندوؤن، اور دوسری پرانی قومون مین رائج تھا، اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو؛ اصلاح کردی گئی، اور باپ کی نظر مین اس کے تمام لڑکون کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹون پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا، اس کا خاتمہ ہوا،

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست مین تیسرا درجہ زن وشو کا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بڑھون کی تسکین روحانی کا ذریعہ، اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوّن کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوڑون کے بلکہ ہر گھر کے عیش ومسرت کا انحصار ہے،

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے، اُن سب مین عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقی مدارج کے لئے عائق ومانع تسلیم کیا گیا تھا ہندوستان مین بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب مین تجرّد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا[1] اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا، اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرّد مین ہو سکتی تھی اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج مین ممکن ہے، کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سُلوک کا ہے جو کسی

---

[1] انجیل قرنتیون ۷-۸،

کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو، اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے، اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لئے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے، اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے، مذہبی تجرد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے،

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَ	اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا
الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ	(خواہ وہ کواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے
اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ	غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں
مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہوں گے
(نور - ۴)	تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا
	اور اللہ گنجایش رکھنے والا اور علم والا ہے،

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ اگر وہ غریب و تنگدست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے اُن کو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی، تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے

کو فائدہ پہنچے گا، اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنے والے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشتکار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے، تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے، اس لئے جو بے کاری سے غریب ہے، بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے خصوصاً اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردے گی، جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہو سکتا آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے، اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے، اور پھر علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے، اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں،

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو، تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا،

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ	اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا
يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ	ہو، کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح
فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	کرسکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ	سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ
اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ	میں ہو، اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا
(نساء-۴)	ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو،

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو، تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہان سے دو شبہے پیش آتے ہین، ایک یہ کہ کیا نومسلم باندیان پُرانے مسلمانون کے برابر ہوسکتی ہین ؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہین ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا، اور خدا کے نزدیک قبول ہے، دوسرا شبہہ یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتین شریف خاندانون کے ہم رتبہ کیسے ہون گی، تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے۔ اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہین،

یہ اہتمام بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسون مین پڑکر نکاح سے باز نہ رہین، اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل مین کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اتزوج النساء فمن رغب	مین عورتون سے نکاح کرتا ہون، تو
عن سنتی فلیس منی[۱]،	جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہین،

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہین ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہمجنس کی تلاش ہوتی ہے، اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے، چنانچہ زن وشو کے باہمی اخلاص ومحبت کو خدا نے اپنی نشانیون مین سے ایک قرار

[۱] صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح،

دیا ہے، فرمایا:۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ	اور اس خدا کی نشانیوں میں
مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا	سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس
اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً	سے تمہاری بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم
وَّرَحْمَۃً ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ	اُن کے پاس سکون پاؤ، اور تمہارے
لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ،	آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا، بےشک
(روم۔ ۳)	اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی
	نشانیاں ہیں،

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن وسکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہئے کہ اُس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب غریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہر ومحبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے،

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اُن لوگوں

کی سخت برائی کی ہے، جو زن و شو کے باہمی میل جول اور مہر و محبت مین فرق ڈالین، فرمایا،

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے ہین جس
بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ	سے شوہر اور اس کی بیوی مین تفرقہ ڈالتے
.... مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ	ہین، ....
مِنْ خَلَاقٍ،	...... اس کے لئے آخرت مین کوئی حصہ
(بقرہ - ۱۲)	نہین ہے،

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری، اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شو باہم اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہین، لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے، اور اُس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے، اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالی نے مرد کو مشکلات مین پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتین عورتون سے کچھ زیادہ دی ہین، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد، عورتون کے سر دھرے
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	ہین، اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک
وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ،	پر بزرگی دی ہے، اور اس لئے کہ مرد
فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ	اپنا مال اُن پر خرچ کرتے ہین تو نیک
بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ،	بیبیان فرمانبردار ہوتی ہین، اور غائبانہ

(نساء - ۶) نگہبانی کرتی ہین، کہ خدا نے اُن کی حفاظت کی ہے،

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن مین آتا ہے کہ نیک بی بیان شوہر کی غیر حاضری مین اپنی اور شوہر کی عزت وآبرو اور مال کا خیال رکھتی ہین، اور اُن کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن مین اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کرکے اُن کو محفوظ کر دیا ہے، اب اگر کسی عورت سے اُس کے خلاف ظہور مین آئے، تو وہ فعل خلاف فطرت ہے،

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونون کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہین، قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ مین ادا کر دیا ہے،

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (بقرہ - ۲۳)	عورتین تمھاری پوشاک ہین اور تم اُن کی پوشاک ہو،

اس پوشاک کے پردہ مین جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیون معنی پوشیدہ ہین، تم اُن کے ستر پوش ہو، وہ تمھارے لئے، تم اُن کی زینت ہو، وہ تمھاری، تم اُن کی خوبصورتی ہو، وہ تمھاری، تم اُن کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمھاری، یہی نکاح کے اغراض ہین، اور انھی اغراض کو پورا کرنا حقوق بیاہ دیجین

کو ادا کرنا ہے

ایک اور آیت مین اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور اُن کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا :-

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۗ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ؁
(نساء-۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا
لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات
سے پیدا کیا، اور اُسی کی جنس سے
اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونون
سے بہت سے مردون اور عورتون
کو پھیلایا، اس خدا کا جس کا واسطہ
دیکر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے
ہو، اور رحمون (رشتون) کا لحاظ رکھو،
اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو نکاح کے خطبون مین عموماً پڑھا کرتے تھے، ان آیتون مین انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑون مرد و عورت پیدا ہوئے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات مین اپنے اس خالق حقیقی کا، اور ان رحمون (رشتون) کا لحاظ کرین جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہین، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی خرابیون اور رشتہ داریون کی جڑ

یہی نکاح ہے، یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا، اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے، اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے، کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے،

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے، مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (مائدہ - ۱) "پاکدامنی کے لئے، نہ شہوت رانی کے لئے"، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا: "اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو، وہ نکاح کرے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے"، (ابن ماجہ نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے، اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو، باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہئے، اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہئے، اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاحِ حال کی باربار تاکید کی گئی ہے، فرمایا، اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا، (بقرہ - ۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا، (نساء - ۱۹) اگر اصلاح کرو اور تقوی کرو، کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدود کو قائم کرنا کہا گیا ہے،

اَن یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللہِ، (البقرہ - ۲۹) — یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے،

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے، اور جب انھیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں مجبور ہیں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا،

وَلَا تَجْعَلُوا اللہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (البقرہ - ۲۸) — اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو، اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو، اور اللہ سنتا اور جانتا ہے،

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن وشو کے معاملہ سے ہے، اور یہی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (برّ) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی، اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے،

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں،

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ، (نساء - ۶) — تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں، اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزت و آبرو) کی حفاظت

گویا عورت کے فرائض یہ ہین کہ وہ اپنے مردون کی فرمانبردار رہین، اُن کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت اُن کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھین، اور اُن کی عزت و آبرو کی جو خود اُن کی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری مین بھی حفاظت کرین، مختصر لفظون مین عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہین، حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھکر کوئی چیز نہین کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اوس کی طرف دیکھے تو وہ اُس کو خوش کر دے، اگر شوہر اس کو قسم دے کہ کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کردے، اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے" (ابن ماجہ نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین ان الفاظ مین فرمائی،

"لوگو! عورتون کے حق مین میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمھارے ہاتھون مین قید ہین، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہین رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھُلی بےحیائی کا کام کرین، اگر ایسا کرین، تو اُن کو خوابگاہ مین علحدہ کردو اور اُن کو ہلکی مار مارو تو اگر وہ تمھاری بات مان لین، تو پھر اُن پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمھارا عورتون پر، اور عورتون کا تم پر حق ہے، تمھارا حق تمھاری عورتون پر یہ ہے کہ وہ تمھارے بستر کو دوسرون سے پامال نہ کرائین، جن کو تم پسند نہین کرتے، اور نہ تمھارے گھرون مین اُن کو آنے کی اجازت دین جن کا آنا تم کو پسند نہین، اور ہان! اُن کا حق تم پر یہ ہے کہ اُن کے پہنانے اور کھلانے مین نیکی کرو (ابن ماجہ

کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے، فرمایا جب خود کھائے تو اس کو کھلائے جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منھ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے، اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علحدہ کرے، (ابن ماجہ کتاب النکاح) دوسری طرف آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں، یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے" آپ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کیلئے اختیار فرمایا ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں،

ایک مشہور حدیث میں آپ نے فرمایا:-

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ، (ترمذی ودارمی وابن ماجہ)	تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے،
خِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَاءِھِمْ، (ترمذی)	تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہیں،

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کرسکتا، وہ دوسروں کے ساتھ کیا کرسکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہئے،

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا یہ حال سُنا تو اُن کو بلوا کر فرمایا،

ولزوجك عليك حقًا	اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے،

(بخاری کتاب النکاح)

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ مین بیویون کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی قصورون پر ماری پیٹی جاسکتی تھین، حضرت عمرؓ فرماتے ہین کہ ایک دفعہ مین نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اُس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہین کہ "ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتون کو کسی شمار و قطار مین نہین سمجھتے تھے، اسلام آیا تو اُس نے اُن کے بارہ مین احکام اُتارے، اور اُن کے حق مقرر کیے"[1]

اسلام نے اُن کی قدر و منزلت کو یہان تک بڑھایا کہ اُن کو قانونًا مردون کے دوش بدوش کھڑا کر دیا، اور آپس کے قانونی حقوق مین اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقًا رتبہ مین مردون کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا،

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ	اور عورتون کا حق دستور کے مطابق مردون
بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ	پر ویسا ہی ہے جیسا مردون کا عورتون پر
دَرَجَةٌ، (بقرہ ع - ۲۸)	اور مردون کو اُن پر ایک منزلت حاصل ہے

لیکن یہ منزلت بھی اُن کو بے وجہ نہین دی گئی ہے، یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتون کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکین یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر

[1] صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورۂ تحریم،

بنائے گئے ہین، یہ نکتہ اس سے سمجھ مین آتا ہے، کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑون کے دور کرنے کے سلسلہ مین ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشون کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونون کے قانونی حقوق یکسان ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے،

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہین، قرآن پاک نے اس کی مصلحتین بھی بتادی ہین، فرمایا،

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد عورتون کے نگراں ہیں، اس سبب
بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى	سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نسآء)	اور اس لئے کہ انھون نے اپنا مال خرچ کیا

یعنی مردون کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردون کو عورتون پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ مین جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید مین ہین، اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہئے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان نفقہ اور پرورشِ اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے، اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس مین تعلقات کی خوشگواری قائم رہے،

اکثر عورتون مین ضد اور ہٹ ہوتی ہے جو شاید ان کی نظری کمزوری اور عدم تربیت کا نتیجہ ہو بعض مرد یہ چاہتے ہین کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ مین سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دین، آپ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دیکر نصیحت فرمائی کہ عورتون کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو، کہ ان کی پیدایش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے[1] آپنے مردون کو بیویون کے معاملہ مین خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا اپنی بیوی مین کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس مین کوئی دوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی[2] یہ نصیحت حقیقت مین قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے،

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا	اور بیویون کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائین تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے، اور خدا نے اس مین بہت خوبی رکھی ہو،
(نسآء-۳)	

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتون کو دو حصون مین بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی، خانگی مشغولیتون کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتون کا بار گران مرد کے کندھون پر رکھا ہے، اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کامون کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونون پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا، اور

[1] صحیح بخاری و مسلم نکاح [2] صحیح مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء،

سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے، اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان نفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے، تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے، اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے، تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے[1]، انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے، جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں،

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے، تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدر ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں، لیکن یہ کہ میں اُن کے مال میں سے اُن کی لاعلمی میں کچھ لے لوں، فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو[2]،

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اُس کی نسبت بازپرس ہوگی، ...... مرد

---

[1] اس اختیار کی تشریح میں فقہا مختلف ہیں، تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیئے، نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر، [2] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل ص ۸۰۸،

اپنی بیوی بچون کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی" (بخاری اول ص ۹، باب قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقرون مین کیا کچھ نہین کہہ دیا گیا،

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے،

قرآن پاک مین ایک آیت ہے جس مین مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتون مین وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے وہ آیت یہ ہے،

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ	اور جن بیویون کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو
فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی	اُن کو سمجھاؤ، اور خوابگاہون مین اُن سے
الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ	علٰحدگی برتو، اور اُن کو مارو تو اگر وہ تمہارا
اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا	کہنا مان لین، تو پھر اُن پر راہ مت تلاش
(نساء - ۶)	کرو،

لغت مین "نشوز" کے معنی "اُٹھ جانے" کے ہین، اور عورت کے حق مین اس کے اصطلاحی معنی جو ہین، وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ مین حسب ذیل ہین :-

وَمعنی ذالك اذا رایتم	اور اس کے معنی یہ ہین کہ جب تم اُن
مِنھُنَّ مَا تخافون ان	عورتون کی وہ حالت دیکھو جس سے
ینشزن علیکم من نظرالی	تم کو اُن کے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی
مالا ینبغی لھُنَّ ان ینظرن	اود ھر دیکھنا جدھر اُن کو دیکھنا نہین
الیه ویدخلن و یخرجن	چاہئے اور وہ آئین اور نکل جائین، اور تم کو

وَاسْتَرِيْبَتْمُوْھُنَّ[1] بِامُوھن (تفسیر طبری ۵-۳۸)	اُن کی بابت شک ہو جائے،
عن محمد بن کعب القرظی اذا	محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ
رای الرجل تقصیرھا فی حقہ	جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر سے
فی مدخلھا و مخرجھا قال	باہر آنے جانے میں اُس کے حق میں قصور
یقول لھا بلسانہ قد رأیتك	کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں
منك کذا وکذا فانتھی،	نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی، یہ دیکھی تو
(تفسیر طبری مصر، ۵-۳۸)	اب باز آجا،

فقہ کی کتابوں میں ہے

الناشزة ھی الخارجة عن	نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر
منزل زوجھا المانعة نفسھا	کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ
منہ، (عالمگیری، نفقات)	کو اُس کے سپرد نہ ہونے دے،

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بد اخلاقی کی بعض مشتبہ باتیں پائی جائیں، کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اُس سے بے رُخی کرے، اور اس سے بغض رکھے (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے

---

[1] اصل متن تفسیر میں واستریتم غالباً غلط چھپا ہے،

نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیتِ مذکور پوری یہ ہے:-

الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۔

(نساء ع ۔ ۶)

مرد عورتوں کے نگران ہیں، (ایک اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، اور (دوسرے) اس لئے کہ مرد اپنا مال (اُن پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت و آبرو[۱] کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے اُن کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے، اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو، تو اُن کو سمجھاؤ، اور اُن کو خوابگاہوں میں علٰحدہ کردو، اور اُن کو مارو، تو اگر وہ تمھارا کہا مان لیں تو پھر اُن پر راستہ تلاش نہ کرو،

اس آیتِ پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں، اُن کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیبیاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں، اور اُن کے پیٹھ پیچھے اُن کے گھربار[۱] عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمھیں "نشوز" کا ڈر ہو

---

۱ اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے ۱۲

تو اُس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت مین اس سے کنارہ کرو، یا اُس سے بات کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے، تو پھر اُس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو،

اب جب اوپر مین بتا چکا کہ مردون کو عورتون کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر بھی یہی کہا جا چکا کہ نیک بیویان وہ ہین جو شوہرون کی فرمانبردار ہین، اور شوہرون کے پیچھے اُن کے گھر بار، مال و دولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہین، اور اس کے بعد یہ ہو کہ اگر تمھین عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اُس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہین یعنی شوہر کی فرمانبرداری، اور شوہر کے پیچھے اُس کے گھر بار، عزت وآبرو کی حفاظت، جو عورت ان دونون کو یا ان دونون مین سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہین کرتی، وہی ناشزہ ہو، اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے،

"شوہر کی عزت وآبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے، اس کی تصریح احادیث مین موجود ہے، آپنے فرمایا "سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے، اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو، تو وہ اپنی جان اور اُس کے مال کی حفاظت کرے" "اپنی جان کی حفاظت" سے مقصود عفت وعصمت ہو،

حجۃ الوداع کے خطبہ مین عورتون کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے ہین اُن مین نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے صحیح مسلم مین ہو،

واتقوا اللہ فی النساء فانھن	عورتون کے بارہ مین خدا سے ڈرو،

عند کم عوان ولکم علیھن
ان لا یوطئن فرشکم احداً
تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن
ضرباً غیر مبرح ،
(مسلم)

کہ وہ تمہارے بس میں ہیں ، تمہارا اُن
پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے
نہ روندواویں جس کو تم ناپسند کرتے
ہو ، اگر وہ ایسا کریں تو اُن کو اتنا مارو
جو تکلیف دہ نہ ہو ،

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں ،

استوصوا بالنساء خیرا فانھن
عند کم عوان لیس تملکون
منھن شیئاً غیر ذلک الا
ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ
فان فعلن فاھجروھن فی
المضاجع واضربوھن ضربا
غیر مبرح فان اطعنکم فلا
تبغوا علیھن سبیلا ،
(کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے
کے بارہ میں میری وصیت کو قبول
کرو ، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم
کو اُس کے سوا اُن پر کوئی اختیار
نہیں ، مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بیحیائی کا
کام کریں ، تو اگر ایسا کریں تو اُن کو
خوابگاہوں میں علیحدہ کردو ، اور ان
کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو ، تو
اگر وہ تمہارا کہا مانیں تو اُن پر کوئی
راستہ نہ ڈھونڈو ،

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے ، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے

جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو، اور کھلی بیحیائی" سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشۃ مبینۃ کی تفسیر میں داخل کیا ہے، (تفسیر سورۂ نساء، رکوع ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے، اور شرع کی تصریح ہے، کہ یہ ضرب غیر مبرح "یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے، بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے، (تفسیر طبری جلد ۵ ص ۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی، ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو" تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی نتیجہ یہ ہوا، کہ بہت سی عورتیں اہلبیت نبوی کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لیکر آئیں، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں، جو اپنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں"، (ابوداؤد وابن ماجہ ودارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپ سے مشورہ لیا، اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپ نے

ط۱؎ یہ بیّن بانداز ہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک ومشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لئے ہے، ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے،

فرمایا: "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اُتارتا"[1] یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپنے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا، ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے، فرمایا "تو اُس کو سمجھایا کرو، اس مین صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی، لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو"[2] ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہمبستر ہو"[3]

---

[1] صحیح مسلم باب المطلقہ ثلثا، [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح، باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد، [3] ایضاً بحوالہ صحیح بخاری و مسلم،

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے، عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلۂ رحم" ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدی میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآنِ پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے، اور اس کو انسان کا احسان نہیں، بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے چنانچہ فرمایا:۔

فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم-۴)	تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کرو،
وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ (اسرائیل-۳)	اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر،

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لئے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے،

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ	(اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے ...) مال کو

ذَوِی الْقُرْبٰی، (بقرہ ع - ۲۲) اس کی محبت پر قرابت مندون کو دیا،

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہین، فرمایا،

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ.... (بقرہ ع - ۲۶) فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ مان باپ اور رشتہ دارون کے لئے....

مان باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ دارون کے ساتھ حسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے اُن خاص احکام مین ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا،

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى ٥ (بقرہ ع - ۱۰) (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور مان باپ اور رشتہ دا ر کے ساتھ نیکی کرنا،

سورہ نحل مین اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى (نحل ۱۳) بے شک اللہ انصاف اور حسنِ سلوک اور قرابتدار کو دینے کا حکم کرتا ہے،

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہین، فرمایا

قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ ٥ (بقرہ ع - ۲۶) کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، تو وہ اپنے مان باپ قرابت والون، یتیمون اور غریبون کے لئے،

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں، ارشاد ہوا،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ	اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشایش
وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ	والے ہوں وہ قرابت مندوں اور
وَالْمَسَاكِينَ، (نور-۳)	محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھائیں

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا	اور اللہ کی عبادت کرو، اور کسی
بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا	چیز کو اس کا ساتھی نہ بناؤ، اور
وَبِذِي الْقُرْبَىٰ،	ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ
(نساء-۶)	نیکی کرنا،

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں ان کو پیش آئیں اور اپنے اُس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم، اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا، بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی اُمت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا	کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی،	بجز اس کے کوئی مزدوری نہین مانگتا
(شوریٰ - ۳)	کہ ناتے مین محبت اور پیار کرو،

عربی زبان مین قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہین، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہین، کہ رحم مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے، کسی امر مین دو انسانون کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و امانت کی اصلی گرہ ہے، یہ اشتراک کہین ہم عمری کہین ہم درسی کہین ہم سائگی کہین ہم مذاقی کہین ہم پیشگی، کہین ہم وطنی، کہین ہم قومی کی مختلف صورتون مین نمایان ہوتا ہے، اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لئے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائگی واجب ہے، لیکن ان تمام بندہ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکون سے بڑھکر وہ اشتراک ہے جس کا وطن، رحمِ مادر ہے، یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے، جو متفرق انسانی ہستیون کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے، اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لئے اُس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانون پر سب سے زیادہ ضروری ہے، ان لوگون کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کرین، وحیِ محمدی نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے،

وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ	اس سے وہ انھی کو گمراہ کرتا ہے جو
الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ	حکم نہین مانتے، جو خدا کا عہد باندھکر

مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ (بقرہ ۳)

توڑتے ہین، اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا اُس کو کاٹتے ہین،

ایک حدیث مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارے کے ان الفاظ مین فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ جس نے تجھ کو ملایا، اس کو مین نے ملایا! جس نے تجھ کو کاٹا اُس کو مین نے کاٹا۔[1] اسی مفہوم کو استعارے کے اور گہرے رنگ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یون ادا فرمایا کہ رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے، جو مجھے ملائے، اُس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اُس کو خدا کاٹے۔[2] ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حُسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا، ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل مین حقوہ ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا، جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا، کیا تو اس سے خوش نہین کہ جو تجھ کو ملائے اس کو مین اپنے سے ملاؤن، جو تجھ کو کاٹے اس کو مین اپنے سے کاٹون۔[3] یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفون کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے، اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے، جو اسلام کی نظر مین اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت مین بھی اشارہ ہے سورہ نساء

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البر والصلۃ [2] صحیح بخاری ومسلم کتاب البر والصلۃ [3] ایضاً،

ین فرمایا،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ	اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ،	دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس
(نساء-۱)	کا اور رشتوں کا خیال رکھو،

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو،[1]

جبیر بن مطعم صحابیؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[2] (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا، جب تک اُس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا، یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)

ابوہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اُس کو چاہئے کہ صلۂ رحمی کرے،[3] اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے، کیونکہ صلۂ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں ایک

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم [2] ایضاً باب اثم القاطع [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم۔

یہ کہ ضرورتمند رشتہ دارون کی مالی مدد کی جائے، دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر مین سے کچھ حصہ اُن کی خدمت مین صرف کیا جائے، پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر مین برکت اور زیادتی کی صورت مین ملتا ہے،

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے، انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اُس کے لئے اضمحلال، تکدر، اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہین، لیکن جو لوگ اپنے خاندان والون کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلۂ رحم، اور خوش خلقی سے پیش آتے ہین، اُن کی زندگی مین خانگی مسرت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہی، جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونون مین برکت اور زیادتی ہوتی ہے، ترمذی مین یہ حدیث ان لفظون مین ہی، صلۂ رحم سے قرابت والون مین محبت، مال مین کثرت اور عمر مین برکت ہوتی ہے "

احادیث مین اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہین ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے، بلکہ یہ ہی کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے، اُس کے ساتھ صلۂ رحم[1] کیا جائے یعنی جو قرابت کا حق ادا نہین کرتے ہین، ان کا حق ادا کیا جائے،

---

[1] صحیح بخاری باب لیس الوصل بالکافی،

ہمسائے کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہین، جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہین، انسانیت اور اُس کے تمدّن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون، اور موالات پر قائم ہے، اس دنیا مین ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے، اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے مین سے اُس کو بھی کھلائے، اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آجے، تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے، اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانون کی مجموعی آبادی، باہمی محبت، اور حقوق کی ذمہ داریون کی گرہ مین بندھ کر ایک ہو جائے، ہر انسان بظاہر جسمانی، اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علٰحدہ اور بجائے خود مستقل ہے، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہوا، اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو، اسی لئے ہر مذہب نے ان دونون انسانون پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہون، آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے، کہ وہی وقت پر اورون سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہین،

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اُسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے،

جوایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہین، اس لئے اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچّے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے، تاکہ برائیون کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو، اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کرکے گھر سے باہر نکلے، اور گھر مین قدم رکھے،

اسلام نے انہی اصولون کو سامنے رکھ کر ہمسائگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہین، عربون مین دوسری قومون سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائگی کے حقوق نہایت اہم تھے، بلکہ وہ عزت اور افتخار کا موجب تھے، اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے، تو وہ دوسرے پڑوسی کے لئے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا، اور اس لئے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو .... وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا، اسلام نے آکر عربون کے اس احساس کو چند ترمیمون اور اصلاحون کے ساتھ اور زیادہ قوی کردیا،

دینِ محمدیؐ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے، جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہین کہتے، مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک، کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائگی ہے، اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے، ان سب قسمون کے ہمسایون مین تقدم اُس کو حاصل ہے، جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوسرا تعلق بھی ہو، قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے، ارشاد ہے،

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ، (نساء - ۶)

اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنون مین اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے، ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار و عزیز، اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہین، دوسرے کی راے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہین، اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہین، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[۱] لیکن حقیقت مین یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیون اور ہمسایون مین اُن کو ترجیح دیجائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسایگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو، وہ خواہ قرابت اور عزیزداری کا ہو، یا ہم مذہبی کا ہو، یا کسی اور قسم کی رفاقت کا ہو، بہرحال حق کے ساتھ دوسرے تعلقات کو اگر تعلق پر ترجیح حاصل ہے، اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقون سے فرمائی ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا، ایک دن صحابہ کے مجمع مین آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دلنشین انداز سے فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا"، جان نثارون نے پوچھا کون یا رسول اللہ! فرمایا "وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتون سے محفوظ نہیں"[۲] ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا، "جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے"[۳] ایک اور حدیث

---

[۱] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [۲] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لایامن جارہ بوائقہ [۳] صحیح بخاری کتاب الادب،

مین ہو کر آپنے فرمایا "جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے"[۱]

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا، ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیون مین بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہے، اور پڑوسیون مین بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے"[۲] ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے اُن سے فرمایا کہ "جبریل نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ مین سمجھا کہ کہین اُن کو وراثت کا حق نہ دلا دین"[۳] حقیقت مین یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایون کا تعلق رشتہ دارون کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے،

پڑوسیون مین محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیون اور تحفون کا تبادلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویون کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہین، تو مین اُن مین سے کس کے پاس بھیجون" فرمایا "جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو"[۴]

اس ہدیہ اور تحفہ کے لئے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہین، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزین بھی اس کے لئے کافی ہین، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو، اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیون نہ ہو، اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے ہمسایون کی خبر گیری کرتے رہو"[۵]

ان تحفون کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتون کو پیش آتا ہے، اس لئے آپنے خصوصیت

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب [۲] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجار [۳] صحیح بخاری کتاب الادب [۴] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب [۵] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی حق الجوار،

کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھری کیوں نہ ہو۔"[۱] یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لئے ہے، یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے، اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھکر اُس کی حقارت کرے،

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروانہ کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اُس کے پہلو میں بھوکا رہے"[۲]

بُرائی بُرائی ہے جہاں بھی ہو، اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو، لیکن اگر وہ اس جگہ ہو، جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہئے تھی، تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور بُرائی کا درجہ عام گناہوں اور بُرائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے، بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کرسکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ پڑوسی کے مکان میں چوری کرنا کتنا بُرا ہے، بدکاری ہر جگہ اُس سے ممکن ہے، اگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد ورفت ہے، اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے، اسی لئے توراۃ میں حکم تھا،

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے، تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر، تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام . . . . اور اس کی لونڈی، اور اس کے بیل اُ"

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا [۲] مشکوٰۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری باب لایشبع دون جارہ،

اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ نہ کر۔" (خروج ۲۰-۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔" (احبار ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی جن میں توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے، بلکہ اس کو دس گنا زیادہ بڑا کرکے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا،

زنا حرام ہے، خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام ہے، خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے۔[ل]

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں، مگر زبان کی تیز تھیں، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں، لوگوں نے ان کا حال آپ سے عرض کیا تو فرمایا، اُن میں کوئی نیکی نہیں، اُن کو دوزخ کی سزا ملے گی، پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا، جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں، اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں، فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی۔[۲]

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا،

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو، (مرقس ۱۲-۳۰)

[ل] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار [۲] ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے، اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے،

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لئے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کے لئے پیار رکھتا ہے۔" [۱]

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا،

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔" [۲]

اسی لئے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہونگے، جو پڑوسی ہوں گے [۳]، انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا، فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو، اور جب برا کہتے سنو، تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔ [۴]

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے، تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو، مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو، یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا، چنانچہ ایک

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان [۲] مشکوٰۃ از بیہقی [۳] احمد بن حنبل مسند عقبہ بن عامر [۴] سنن ابن ماجہ ص ۳۲۵

دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے، فرمایا جاؤ صبر کرو، اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے، پھر یہی نصیحت کی، وہ پھر آئے، اور یہی عرض کی، فرمایا جاکر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو، (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) اُن صحابی نے یہی کیا، آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے، انھوں نے حقیقتِ حال بتائی، سب نے اُن کے پڑوسی کو برا بھلا کہا، یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا، اور وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نہ ستائے گا، [1]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گذار بن گیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا، تو ایک درم کا گوشت خرید لایا ہے فرمایا اے جابر! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت [2] یاد نہیں،

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى	جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے
النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي	(اُن سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے
حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ	اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے، اور
بِهَا، (احقاف - ۲)	اس سے فائدہ اٹھا چکے،

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا ابھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو، وہ دنیا

---

[1] ادب المفرد بخاری، باب شکایۃ الجار، وابوداؤد کتاب الادب باب حق الجوار [2] موطا امام مالک باب ما جاء فی اکل اللحم،

کی کردہ لذت قرار پاتی ہے، جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے،

ہمسایون مین دوست دشمن اور مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، اُن کے پڑوس مین ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھون نے گھر کے لوگون سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا، کیونکہ مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ مین سمجھا کہ وہ اُس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دین گے،[1]

[1] ابوداؤد کتاب الادب، باب فی حق الجار،

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال واسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اُس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے، اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا، عرب میں روزانہ کے قتل وغارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کہ چاہیئے، اُن کو غور و پرداخت کا سامان نہ تھا، وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے، کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے[1]، اور نہ سنگ دل عربوں میں عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا، قرآن پاک میں اُن کی اس نسل کی کا ذکر بار بار آیا ہے،

[1] تفسیر ابن جریر طبری سورۂ نساء ج ۴ ص ۱۷۰

اَرَأَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ	کیا تونے اس کو دیکھا جو انصاف کو
بِالدِّیْنِ، فَذٰلِکَ الَّذِیْ	جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو
یَدُعُّ الْیَتِیْمَ، (ماعون)	دھکے دیتا ہے،

ایک اور آیت مین اُن متولیون کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو یتیمون کے جوان ہوجانے کے ڈر سے اُن کے باپون کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھاکر ہضم کرجانا چاہتے ہین،

کَلَّا بَلْ لَّا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ	نہین یہ بات نہین، بلکہ تم یتیم کی عزت
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ	نہین کرتے، اور نہ ایک دوسرے کو
الْمِسْکِیْنِ، وَتَاْکُلُوْنَ	مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو،
التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا، وَّتُحِبُّوْنَ	اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا
الْمَالَ حُبًّا جَمًّا،	جاتے ہو، اور دنیا کے مال و دولت
(الفجر-۱)	پر جی بھر کے ریجھتے ہو،

اسلام سے پہلے کے مذاہب مین اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور اُن کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے، توراۃ مین عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین مین دوسرے لوگون کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہون وہ آئین اور کھائین اور سیر ہون " (استثنار ۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲) انجیل نے اُن بیچارون کی کوئی دادرسی نہین کی ہے، اور نہ کسی تعلیم مین اُون کا ذکر کیا ہے، اس مظلوم فرقہ کی اصلی دادرسی کا وقت اُس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لیکر

دنیا میں آیا، وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کرکے یاد دلادیا،

اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ٥..... کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہین پایا، تو اُس

...... فَاَمَّا الۡیَتِیۡمَ نے پناہ دی .... تو

فَلَا تَقۡهَرۡ ، (الضُّحٰی) یتیم کو نہ دبا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ مین بے بسی کے عالم مین رہے، یتیمون کے متعلق اخلاقی ہدایتین فرماتے رہے، اور قریش کے جفا پیشہ رئیسون کو اس بیکس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے، چنانچہ مکی آیتون مین یہ تعلیمات وحی ہوتی رہین، دولت مندون کو غریبون کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ مین فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے، اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کرسکتے ہو؟ ظلم و ستم کے گرفتارون کی گردنون کو چھڑا کر، بھوکون کو کھلا کر اور یتیمون کی خدمت کرکے،

اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَةٍ یا بھوک والے دن مین کسی رشتہ دار

یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ، (بلد-۱) یتیم کو کھلانا،

نیکون اور نیک بختون کی تعریف مین فرمایا کہ یہ وہ ہین جو

وَیُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ اور اُس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی

مِسۡکِیۡنًا وَّیَتِیۡمًا ٥ (دھر-۱) غریب اور یتیم کو کھلاتے ہین،

مدینہ مین آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتون نے قانون کی صورت اختیار کی، سورۂ نساء مین اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، اُن کو وراثت کا حق دلایا گیا، اور حتوق جو جاہلیت

مین طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے، اُن سے کہا گیا،

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا	اور یتیمون کو اُن کے وارثون کا چھوڑا
تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَ	ہوا مال دے دو، اور اُن کے اچھے مال
لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ	کو اپنے بُرے مال سے بدلا نہ کرو، اور
اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ہ	اپنے مال کے ساتھ ملا کر اُن کا مال کھا
(نسآء-۱)	جاؤ، یہ بڑے گناہ کی بات ہے،

دولتمند یتیم لڑکیون کو اُن کی جائداد پر قبضہ کرلینے کی غرض سے متولّی اپنے نکاح مین لے آتے تھے، اور بے والی ووارث جان کر اُن کو ستاتے تھے، اس پر حکم آیا،

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیون کے حق
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ	مین انصاف نہ کرسکو گے تو (اُن کو چھوڑ کر)
(نسآء-۱)	عورتون سے جو تمھین پسند ہو نکاح کرلو،

یتیم بچون کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کردینا چاہئے، اور نہ جب تک اُن کو پورا شعور آئے، وہ اُن کے سپرد کیا جائے، بلکہ اُن کے سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کی جائے، فرمایا،

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ	اور بے وقوفون کو اپنے مال جن کو خدا نے
الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا	تمھارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو،
وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَ	اور اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو، اور اُن سے

قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَابْتَلُوا	معقول بات کہو، اور یتیموں کو جانچتے رہو جب
الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ	وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو اُن
اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا	میں اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال
اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ج (نساء-۱)	اُن کے حوالہ کردو،

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے، غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے، وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے، کہ "تم اپنا مال اُن کو نہ دو"، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے، وہاں اُس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی کہ "تم اُن کا مال اُن کو واپس کر دو"، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اُس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہئے جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے، تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چُن کر واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں،

متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کر کے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کریں، اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی،

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا	اور اڑا کر اور جلدی کر کے اُن کا مال نہ
اَنْ يَّكْبَرُوْا (نساء-۱)	کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں،

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو اُن کے لئے ان یتیموں کی جائداد

کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہون تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی،

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ج	اور جو (متولی) بے نیاز ہے، اس کو چاہئے
وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ	کہ بچتا رہے، اور جو محتاج ہو، تو منصفانہ
(نساء-۱)	دستور کے مطابق کھائے،

اور آخر مین یہ جامع تعلیم دی گئی،

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (نساء-۱۹) اور یہ کہ یتیمون کے لئے انصاف پر قائم رہو"

سورۂ انعام مین یہودیون کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانورون کی حلّت وحرمت مین بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہون سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی واخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی، اُن مین ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا	اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ	کے پاس نہ جاؤ، یہان تک کہ وہ اپنی
(انعام-۱۹)	طاقت کی عمر کو پہنچے،

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول مین سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائداد یتیمون کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہئے اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہئے، (سورۂ اسراء-۴)

یہ تو صاحبِ جائداد یتیمون کی نسبت تعلیم ہے، جو یتیم غریب ومفلس ہون، اُن کی مناسب

پرورش اور امدادِ عام مسلمانوں کا فرض ہے، چنانچہ قرآنِ پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار بار اُن کی پرورش اور اُن کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی، وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے،

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے وائی و وارث اُمت کے سرپرست (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اُمت کے اُن نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب[1] ہوں گے"، یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے، اور اس کو کھلائے پلائے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اُس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشش کے لائق نہ ہو"[2]، نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گروہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہے، اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو"[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتوان یتیموں کے لئے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے، اُن میں ہر ایک اُس کی پرورش اور کفالت کے لئے اپنے آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا،[4] بدر کے یتیموں کے

---

[1] صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیماً و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم [2] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ ص ۱۳۲، و ص ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح) [3] ایضاً بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیماً [4] صحیح بخاری با عمدۃ القضاۃ،

مقابلہ مین جگر گوشۂ رسول فاطمۂ بتول اپنے دعوی کو اٹھا لیتی ہین[1]، حضرت عائشۂ صدیقہ اپنے خاندان[2] اور انصار وغیرہ[3] کی یتیم لڑکیون کو اپنے گھر لیجاکر دل وجان سے پالتی ہین، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لئے بغیر کبھی کھانا نہین کھاتے تھے[4]،

صحابہ نے صرف یہی نہین کیا کہ یتیمون کو اُن کا حصہ دینے اور اُن کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی مین دیانتداری برتنے لگے، بلکہ اُن کی جائدادون کی حفاظت مین فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت مین ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعوی پیش کیا، مگر وہ دعوی ثابت نہ ہوسکا، اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلادیا، وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپ کو رحم آیا، اور اُس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دیدو، خدا تم کو اُس کے بدلے جنت دے گا، وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا، ابو الدحداح صحابی حاضر تھے، انھون نے اُس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلان باغ سے بدلتے ہو؟ اُس نے آمادگی ظاہر کی، انھون نے فوراً بدل دیا، اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کردیا[5]،

آج دنیا کے شہر شہر مین یتیم خانے قائم ہین، مگر اگر یہ سوال کیا جائے کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا، تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی مین ملے گا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی، عرب پہلی سرزمین ہے

---

[1] ابو داؤد باب مواضع قسم الخمس [2] موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ وزکوٰۃ اموال الیتیم وزکوٰۃ الحلی وکتاب الطلاق

[3] مسند احمد جلد ۶ ص ۲۲۹ [4] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ ص ۳۲ [5] ادب المفرد امام بخاری باب فضل من یعول یتیماً [6] استیعاب ابن عبد البر تذکرۂ ابو الدحداحؓ

جہان کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی، اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا، اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہان جہان مسلمانون نے اپنی حکومتون کی بنیادین ڈالین، ساتھ ساتھ ان مظلومون کے لئے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کئے، مکتب قائم کئے، جائدادین وقف کین[1]، اور دنیا مین ایک مستقل انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی، اور قانوناً اپنے قاضیون کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی وسرپرست یتیمون کے سرپرست ہون، اُن کی جائدادون کی نگرانی، اُن کے معاملات کی دیکھ بھال، اور اُن کی شادی بیاہ کا انتظام کرین[2]، اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکون مین کیجاتی ہے، اور لندن کے لارڈ میر یا آرفنس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیون کے ان فرائض کی نقل کررہے ہین

[1] تاریخ اسلام مین یہ واقعات مذکور ہین، [2] حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابون مین قاضیون کے یہ فرائض لکھے ہین، قاضیون کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے، اُن مین بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی ۱۲؎

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک

یتیمون کے بعد اصنافِ انسانی مین سب سے ناچار و ناتوان گروہ صنفِ لطیف کے اُن افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہرون کے سایہ سے محروم کر دیا ہے، اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہین، نہ اُن کے کھانے پینے کا کہین سہارا ہے، اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے، اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے، عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا، اور اُس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی، اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے، اب غم والم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھکر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے، بلکہ اُس کے روحانی، اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہین، اور موقع کی تاک مین رہتے ہین، دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعین کافی سے زیادہ ثبوت ہین،

یہودی مذہب مین بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا تھا، اس سے معاملہ کر سکتا تھا، عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق مین کوئی دخل نہ تھا، عیسوی مذہب مین یہ جبری قانون تو جاتا رہا، مگر وہ کوئی دوسرا

ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا، ہندوؤن مین اب اس کی زندگی کی ضرورت نہین سمجھی جاتی تھی، اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہئے اور اگر زندہ رہے تو اُس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشون اور لذتون سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ مین گذار دے، عربون مین رواج یہ تھا کہ وہ شوہرون کے وارثون کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اُس کے ساتھ کرسکتے تھے، اُس کو تکلیفین دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے، اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہین شادی نہین کرنے دیتے تھے،

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریادرسی ہوئی، اُس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ اُن کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کردیا، اور صرف اتنی مدت تک کے لئے رکھا جس مین تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہوسکے، اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اُس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہین اس کیلئے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی، اور اس کا نام عدت گنا یعنی شمار کے دن" اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اُس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی، اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا، ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ مین سب سے اول ضروری ٹھہرایا، پھر اس ترکہ مین سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھوان حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلادیا، عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیورون اور شوہر کے دوسرے عزیزون کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کردیا، اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق، بلکہ اسلام کے قانون کا جزء بنادیا،

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جب سوسائٹی سے اُس کو

اوروں نے نکال دیا ہے، اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے، اور کسی شریف شریکِ زندگی کی سیت کا شرف اُس کو دوبارہ بخشا جائے، اور جس ضرو عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے، وہ اس کو پھر عطا کیا جائے، قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کی، بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا،

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ۔ (نور - ۴) — اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کردو،

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں، اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے، آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی، اور پچیس برس تک اس طرح اُس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، اُن کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کئے، جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، ام سلمہؓ، جویریہؓ، اُم حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں، جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا، اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لئے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بتادیا،

یہ تو آپ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا

جا سکتا ہے، وہ اس فرقہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا بآسانی کرسکتا ہو فرمایا:-

الساعی علی الارملۃ	بیوہ اور مسکین کے لئے دوڑ دھوپ کرنے
والمسکین کالساعی فی	والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے
سبیل اللہ واحسبہ قال	والا، (اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا
کالقائم لا یفتر، وکالصائم	ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا
لا یفطر[1]	وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا، اور وہ
	روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا،

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:-

الساعی علی الارملۃ والمسکین	بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے
کالمجاھد فی سبیل اللہ و	والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے،
کالذی یصوم النھار ویقوم	اور اس کے برابر ہے، جو دن بھر روزہ
اللیل، (کتاب الآداب)	اور رات بھر نماز پڑھا کرے،

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں، اور اس لئے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں، جب تک وہ بڑے ہو کر اُن سے علیحدہ نہ ہو جائیں، اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا ہے اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جاتی

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق،

بیوی قیامت کے دن مرتبہ مین ان دُو انگلیون کی طرح قریب ہون گے وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچون کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے یہان تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائین یا مر جائین[1]" اسی مقصد کو ابویعلیٰ کی مسند مین ہے کہ آپؐ نے اس طرح ایک واقعہ کی صورت مین بھی بیان فرمایا، کہ قیامت کے دن مین سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولون گا، تو دیکھون گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے، مین پوچھونگا تو کون ہے تو وہ کہے گی کہ مین ایک بیوہ ہون جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے[2]"

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیما [2] حاشیہ سنن ابی داؤد، بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ بن نور الدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع، لکھنؤ،

حاجتمندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اُس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے، اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے، اس لئے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے، اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے، اور نہ یہ سمجھے کہ اُس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑیگی،

قرآن پاک میں ۲ دو موقعوں پر خدا سے فرق سے ایک آیت ہے :-

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ	جن مسلمانوں، کے مالوں میں مانگنے والوں
(ذاریات - ۱)	اور محروم کے لئے حق ہے،
فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ	جن مسلمانوں، کے مالوں میں مانگنے والے
وَالْمَحْرُوْمِ (معارج)	اور محروم کے لئے مقررہ حق ہے،

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے، جو تم سے کسی مالی مدد

کا خواستگار ہو، محروم کی تشریح مین اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے، بعض اس کو محروم کہتے ہین، جس کا مال غنیمت مین کوئی حصہ نہین، کسی نے اُس کے ظاہر معنی لیے ہین کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے، لیکن صحیح یہ ہو کہ اُن سے مراد وہ مصیبت زدہ ہی جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی اُفتاد پڑ گئی ہو، اور اب وہ دوسرون کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو، اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآنِ پاک[1] سے ہوتی ہے،

دوسری بحث یہ ہو کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے، یا عام صدقہ، مفسرین دونون آیتون مین دونون طرف گئے ہین، مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات مین جس مین مطلق "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے، اور معارج مین جس مین مطلق "حق" کا نہین بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہی "زکوٰۃ" مراد ہو، کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہین، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے، نتیجہ نکلا کہ ایسے حاجت مندون کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو، دونون طرح سے مدد مسلمانون کے حقوق مین سے ایک حق ہے،

قرآنِ پاک مین دوسرے موقع پر ہے،

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ - ۱)　　　　اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر،

یہان سوال کرنے والے کے معنی اغنیٰ کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہین، مگر لفظ کا عموم، وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورتمند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و مختار، اور تفسیر ابن جریر مین سورۂ ذاریات و معارج کی آیتِ مذکورہ، اور سورۂ قلم مین اصحاب الجنۃ کے قصہ مین محرومون اور سورۂ واقعہ مین بل محرومون کے معنی،

خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو[1]، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا اگر تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو، بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو، اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو،

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ	جو نیک بات کی سفارش کرے گا، تو
لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ	اُس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہوگا،
شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ	اور جو بُری بات کی سفارش کرے گا
مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ	تو اُس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائیگا،
مُّقِيْتًا، (نساء-۱۱)	اور اللہ ہے ہر چیز کا نگہبان،

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم ونسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے، اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے، حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا

---

[1] طبری میں ہو کہ آیت کا مطلب یہ ہو کہ واما من سائلک من ذی حاجۃ فلا تنھر، زمخشری نے کشاف میں لکھا ہو کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے،

ایسا ہی بُرے کام کی جد وجہد مین حصہ لینا اس کے گناہ مین شریک ہونا ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے،

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ	اور نیکی اور پرہیز گاری کے کامون مین
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَ	ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، اور گناہ
الْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ	زیادتی کے کامون مین ایک دوسرے کے
اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ،	مددگار نہ ہو، اور ڈرو اللہ سے، بیشک
(مائدہ ۔۱)	اللہ سخت سزا دینے والا ہے)

غرض یہ ہے کہ حاجت مندون کی حاجت برآری ضرورت مندون کی ضرورت کو پورا کرنا، جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمھاری طاقت مین ہو تو وہ اُس کو دینا، ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے،

من کان فی حاجۃ اخیہ کان	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے
اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن	مین لگا رہیگا، تو خدا اس کی ضرورت پوری
مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ	کرنے مین لگا رہیگا، اور جو کسی مسلمان کی کسی
کربۃ من کربات یوم القیامۃ	مصیبت کو دور کریگا، تو اللہ قیامت کی مصیبتون
	مین سے کسی مصیبت کو اس سے دور
(صحیحین)	فرمائے گا،

ایک دوسری روایت مین ہے کہ فرمایا:۔

وَ اللہ فی عون عبدہ ما کان	اللہ اپنے بندہ کی مدد مین اس وقت
العبد فی عون اخیہ (ترمذی باب	تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی
ماجاء فی الستر علی المسلمین)	کی مدد مین رہتا ہے،

صحیح بخاری مین ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ "تم سفارش کرو تو تمھین بھی ثواب ملے گا"[1] ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو[2] یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے[3] یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلنے مین کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اِس کام کی قدر کرتا ہے، اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے[4]،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المؤمنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ [2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ
[3] ترمذی کتاب البر و الصلۃ، [4] ایضاً،

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے، بیماروں اور مریضوں کا ہے، جو عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبرگیری اور خدمت آپ نہیں کرسکتے، ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے، اور اس فرض کا نام عربی میں "عیادت"[1] ہے،

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں، یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں، اور اس کی تیمارداری، غمخواری اور خدمت گذاری کے بھی ہیں، بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادۃ کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمارداری اور خدمت گذاری کرے، عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا، کہتا ہے،

ذهب الرقاد فما يحس رقاد　　　مما شجاك ونامت العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی، اور عیادت کرنے والے سو گئے،

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیماردار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں، لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے، تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے، اور وہ سو جاتے ہیں، اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا، اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور

ان بیمارون کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہین یا جن کے ادا کرنے سے اُن کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہو اُن کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے، اور قرآن نے اس کے لئے ایک کلی اصول بنا دیا ہے،

وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ، (نور ۔ ۸)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے،
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد مین
عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى	شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور
الْمَرِيْضِ حَرَجٌ، (فتح ۔ ۲)	نہ بیمار پر،
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى	نہ کمزورون پر اور نہ بیمارون پر جہاد
الْمَرْضٰى ۥ (توبہ ۔ ۱۲)	کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)

بیمارون کے لئے وضو معاف ہے، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) (مائدہ ۲) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازین معاف ہین، عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (خدا کو معلوم تھا کہ تم مین کچھ بیمار بھی ہون گے) (مزمل ۔ ۲) اسی طرح حج کے احکام مین بھی بیمار کے لئے رعایت فرمائی گئی، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا (تو تم مین جو بیمار ہو) (بقرہ ۔ ۲۴) روزہ توڑنے کی اُس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۶) اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہون تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا،

نماز کی رخصت دی گئی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے اُن سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندون کو کس حد تک اُن سے اپنے اخلاقی مطالبہ مین کمی کر دینی چاہیے،

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت مین غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے،

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا مین جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اُس کے گناہون کا کفارہ بن جاتی ہے، اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفون کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لئے وہ اُس کے گناہون کا معاوضہ بن جاتی ہین، اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیمارون کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے، اس کے آداب تعلیم کئے ہین، اس کی دعائین سکھائی ہین، اور اس کا ثواب بتایا ہے، فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا، خدا اُس کے غم کو ہلکا کرے گا[2]، اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہین جن مین ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے[3]، صحابہؓ کہتے ہین کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتون کا حکم دیا تھا جن مین سے ایک بیمار کی عیادت ہے[4]، ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اُس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہین اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے[5]

---

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد، اول کتاب الجنائز [2] ابوداؤد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] ایضاً [5] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز،

اس کی مغفرت کے لئے بارگاہ الٰہی مین دعا کرتے ہین[۱]، یہ بھی آیا ہے کہ جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[۲]، فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو اُس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے، اور اُس کو تسلی اور دلاسا دے اور اُس کو شفا پانے کے لئے خدا سے دعا کرے[۳]،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیمارون کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اُس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ مین مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی، آپ نے یہودیون کی عیادت فرمائی ہے[۴]، منافقون کی عیادت کو تشریف لے گئے ہین[۵]، اور اسی سے علماء نے غیر مسلمون کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[۶]،

حضرت سعد بن معاذ جب زخمی ہوئے تو آپ نے اُن کا خیمہ مسجد مین نصب فرمایا تاکہ بار بار اُن کی عیادت کی جا سکے[۷]، رفیدہ ایک صحابیہ تھین جو ثواب کی خاطر زخمیون کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھین، اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد مین رہتا تھا، تاکہ لڑائیون کے مسلمان زخمیون کی تیمار داری اور مرہم پٹی کرین[۸]، غزوات اور لڑائیون مین بھی بعض ایسی بیبیان فوج کے ساتھ رہتی تھین جو بیمارون کی خدمت اور زخمیون کی مرہم پٹی کرتی تھین[۹]،

آپ نے اپنے پیروون کو عمومیت کیساتھ حکم دیا ہے کہ بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو[۱۰]،

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز [۲] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفہ [۳] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز [۴] صحیح بخاری کتاب الجنائز [۵] ایضاً [۶] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ [۷] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز [۸] سیرۃ ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ وادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و اصابہ ابن حجر وغیرہ مین حضرت رفیدہ کا حال پڑھیے [۹] صحیح مسلم، غزوۃ النساء [۱۰] مسند احمد صفحہ ۳۹۴ ج ۴،

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا مین ظاہر فرمائی کہ قیامت مین اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ "اے آدم کا بیٹا! مین بیمار پڑا تو میری عیادت تونے نہ کی"۔ وہ کہے گا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہان کا پروردگار تھا مین تیری عیادت کیونکر کرتا، فرمائے گا" کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تونے اُس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اُس کے پاس[1] پاتا"۔

تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرسی، بیمارون کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے، اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا اپنی مہربانیون سے اسے نوازتا رہتا ہے، اور اس کے درجون اور رتبون کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہین جو ان بیمارون کی خدمت کرکے خدا کا قرب پاتے ہین،

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

غلامون کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتوان طبقون مین غلامون کی بھی ایک جماعت ہے، ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے، یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قومون نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیرون مین جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کئے، اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لئے، ہندوؤن مین اچھوت قومین اسی کی یادگار ہین، مصریون مین قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیون مین غیر رومی اسی غلامی و مشقت و محنت کے کامون مین مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربون مین بھی اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا، بلکہ عربون مین قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیون کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا، کیونکہ اُس کو اپنی حفاظت کے لئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی، چنانچہ اسلام کے آغاز مین ظالم قریشیون نے جن لوگون پر سب زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے،

اسلام زیردستون کی مدد اور کمزورون کی حمایت مین اٹھا تھا، نبوت سے پہلے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاہدۂ فضول مین شرکت کی تھی، اور جس کو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیر دستون کی حفاظت اور حمایت کی جائے، اسی لئے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسون سے پہلے قریش کے غلامون اور کنیزون نے لبیک کہا، چنانچہ زید ابن حارثہؓ خبابؓ بن الارت، بلال حبشیؓ یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابوفکیہہؓ، عامر بن فہیرہؓ، اور سالمؓ غلامون مین اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیون مین سب سے پہلے اسلام کے آغوش مین آئین، اور زید بن حارثہؓ کے سوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ مین پرورش پا رہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت مین سخت سے سخت کڑیان جھیلین، اور بعض نے اسی راہ مین اپنی جانین بھی دین،

اسلام نے غلامون کی آزادی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزء بنا لیا تھا، غلامون کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا، سورۂ بلد مین جو مکہ مین نازل ہوئی تھی، جن کامون کو گھاٹی بتایا گیا ہے، ان مین ایک فَكُّ رَقَبَةٍ گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا بھی ہے، چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی مین بھی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانون نے بہت سے غلامون کو کافرون سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا،

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا، تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ یعنی گردن کو آزاد کرنا، بہت سی فروگذاشتون کا کفارہ قرار پایا، اور غلامون کے آزاد کرنے کے لئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا، صحابہؓ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا، اور چند روز مین غلامون کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی، حضرت حکیم بن حزامؓ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہین، اسلام کے بعد سو غلام آزاد کئے، حضرت

عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس[1] غلام آزاد کئے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تیس[2] ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی،

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اُس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سرِ فہرست جن لوگوں کے نام ہیں، اُن میں یہ مظلوم فرقہ بھی ذکر فرمایا،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا	اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی
بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ	نہ بناؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی
اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى	کرو، اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ	کے ساتھ، اور عزیز پڑوسی اور
الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ	بے گانہ پڑوسی کے ساتھ، اور پہلو
الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ	کے رفیق کے ساتھ، اور مسافر کے
وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ	ساتھ، اور اس کے ساتھ جس کے
اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں، اور
مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۙ	اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند
(نساء - ۶)	نہیں کرتا،

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اس کی بھی

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرة [2] یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں،

ممانعت کردی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے، بلکہ فتای میرا جوان کہے، اور اسی طرح غلامون کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤن کو رب نہ کہین، بلکہ مولیٰ کہین[۱]، اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا، اور فرمایا کہ "یہ جن کو تم غلام کہتے ہو، یہ بھی تمھارے بھائی ہین، جن کو خدا نے تمھارے تحت مین کر دیا ہے، پس جس کو خدا نے تمھارے تحت مین کر دیا ہے، تو اُس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو، اور اس کو اتنا کام نہ دے دو، جو اُس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام مین خود بھی شریک ہو کر اُس کی مدد کرے[۲]"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ اُن کے غلامون اور آقاؤن کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی[۳]، اُن بے خانماں افراد کو اُن کے آقاؤن کے گھرون کا غلام بنا کر نہین، بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا، کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا، وہ اسی کے علاقہ مندون (موالی) مین شمار ہو گا[۴]، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ مین اپنے فوجی افسرون کو حکم دیا تھا، کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہون، اُن کو اُن کے قدیم آقاؤن کے خاندانون مین شمار کرو، جو اُون کا حق ہو، وہ ان کا ہو، اور اگر یہ غلام چاہین، تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العتق [۲] صحیح بخاری جلد دوم، کتاب الآداب باب ما ینھی عن السباب [۳] صحیح بخاری جلد دوم، کتاب الآداب باب ما ینھی عن السباب، [۴] حدیث مین آیا ہے انما الولاء لمن اعتق، ولا، کا حق اسی کو ہے، جو آزاد کرے، دوسری حدیث مین ادانتمیٰ الی غیر مو الیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے، تو اس پر خدا کی لعنت، امام نووی شرح مین لکھتے ہین، بل ھو

بنائیں،[۱] ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں، بلکہ اسلام کا سردار اور ملکوں کا بادشاہ بنادیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آیندہ جلدمین اپنے مناسب موقع پر آئے گی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۴) لحمۃ کلحمۃ النسب، یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے، (صحیح مسلم کتاب العتق)

[۱] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۲۵،

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدّن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے، مگر گذشتہ نظامِ تمدّن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی، اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدّن کے خمیر میں داخل ہے، اور مغربی تمدّن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے، ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے، اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے، آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے، تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا، گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہلِ عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا، مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا، اسلام آیا تو اس نے اِس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا،

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے،

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ إِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا، قَالَ سَلٰمٌ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ، فَرَاغَ إِلٰى أَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ، فَقَرَّبَهٗ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُوْنَ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ

(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے، کہ جب (یہ لوگ) اُن کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیکم کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا، (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، پھر جلدی سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کیلئے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو (انھوں نے تناول کیا، (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انھوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے، انھوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں، اور اُن کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔

(ذاریات-۲)

اس حکایت سے آدابِ مہمانداری کے متعلق حسبِ ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں،

(۱) مہمان اور میزبان مین کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے،

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے، کیونکہ روغان کے معنی سرعت کے ہین

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہون سے دیکھنے کے بھی ہین، اس لئے مہمانون کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے، کیونکہ اگر مہمانون کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لئے کچھ سامان کیا جا رہا ہے، تو وہ اندازِ تکلف اوس کو روکین گے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل وعیال سے یہ نہین کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو، بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے،

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لئے مہمانون سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے مین تکلیف نہ ہو، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لئے اُن سے الگ ہو گئے،

(۵) مہمانون کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے، اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا،

(۶) کھانا مہمانون کے سامنے پیش کرنا چاہیے، اُن کو کھانے کا حکم نہین دینا چاہیے اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیون نہین کھاتے یہ نہین کہا کہ آپ لوگ کھائیے

(۷) مہمانون کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے، کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہین، وہ کھانا تو مہمانون کے سامنے پیش کر دیتے ہین، لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے، یا کم کھائے، تاکہ وہ کھانا اُن کے اور اُن کے اہل وعیال کے کام آئے، اسی لئے جب

اُن لوگون نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو ناپسند کیا، اور اُن کے دل مین خطرہ پیدہ ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہین آئے ہین،

(۸) نہ کھانے کی حالت مین مہمان کو عمدہ الفاظ مین عذر کرنا چاہئے، اسی لئے ان فرشتون نے کہا کہ اگر ہم نہین کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ ہم لوگ کھا ہی نہین سکتے، بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لئے آئے ہین،

سورۂ حجر مین حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتون کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت امیز برتاؤ کرنا چاہے، تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے، کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے، اسی لئے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتون کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوطؑ علیہ السلام نے،

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا	کہا یہ میرے مہمان ہین تو ان کے بارے
تَفْضَحُوْنِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا	مین مجھ کو فضیحت نہ کرو، اور خدا سے
تُخْزُوْنِ (حجر-۵)	ڈرو، اور مجھے رسوا نہ کرو،

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق مین مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا، اور فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے ہمسایہ کی عزت کرے

اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کے ساتھ دے" کہا گیا کہ یا رسول اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے، اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1]، نیز فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے، اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہئے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے"[2]

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو، اور دن کو روزہ رکھتے ہو،؟ انھوں نے کہا بیشک، فرمایا ایسا نہ کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو، کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے"[3]

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے، چاہے چھوڑ دے"[4]

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لئے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے، اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے، اس لئے ضرورت بھی

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراھیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف [4] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف،

کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے، چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کردی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے، کیونکہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی، اور اس پر بار پڑے گا[1]، اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی، جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ،

مسلمانون کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا، ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتون تک جا کر لیتے تھے، اس طرح خاندانون مین لڑائیون کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطرون مین گھرا ہوا پاتا تھا، اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اُس پر حملہ نہ کر بیٹھے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے، اور وہ دین کا رشتہ تھا، جس نے مدت کے بچھڑے ہوؤن کو ملا دیا، دشمنون کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی اور قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی اُن کے اندر پیدا کر دی، جس نے اس طرح اُن کی ہر قسم کی عداوتون کا خاتمہ کر دیا، اور باہمی دشمنیون کو اُن کے دلون سے ایسا بھلا دیا کہ وہ درحقیقت بھائی بھائی ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ — اے مسلمانو! خدا سے ڈرو، جیسا کہ

حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا	اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور نہ تم
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاعْتَصِمُوْا	مرو لیکن مسلمان، اور خدا کی رسّی
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو،
وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے
اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ	اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ	تھے، تو اللہ نے تمہارے دلون کو جوڑ دیا،
اِخْوَانًا ○ (ال عمران - ۱۱)	پھر تم بھائی بھائی ہو گئے "

مسلمانون کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنون کو باہم ملا کر ایک نہین کر سکتا تھا،

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ	اور خدا نے مسلمانون کے دل ملا دیے،
اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا	اگر تو زمین مین جو کچھ ہے سب خرچ
مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ	کر دیتا، تب بھی تو ان کے دلون کو ملا
لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ	نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا، بیشک وہ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○	(ہر شکل پر) غالب آنے والا اور مصلحت
(انفال - ۸)	جاننے والا ہے،

تو اب مسلمانون کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں، اور سب مل کر خدا کے

دین کی رسّی کو جو اُن کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے، مضبوط پکڑے رہین، اور باہم اختلاف پیدا کرکے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوجائین، کیونکہ اس رسّی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مِل کر اُس کو پکڑے رہین، فرمایا،

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ، (انفال - ۶)	اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور آپس مین جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہوگا تو) ہمّت ہار دوگے، اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی،

یہی باہمی اتفاق واتحاد، ملّتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے، اور مسلمانون کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمانون مین باہم الفت ومحبت ہو، اب اگر اتفاق سے اُن مین اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہو کہ دونون خدا ورسول کے حکم کی طرف رجوع کرین،

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ٥ (نساء - ۸)	تو اگر تم (مسلمانون) مین کسی بات مین جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو،

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانون کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مِل کر اس سے لڑین اور اس کو صلح پر مجبور کرین، اور جب وہ راضی ہوجائے تو عدل وانصاف سے اُن میں صلح کرادین،

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اگر مسلمانون کے دوگروہ لڑ پڑین تو
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا	اون مین صلح کرادو، پھر اگر ایک
فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى	دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	والے سے لڑو، یہان تک کہ وہ
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ	خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو
فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ	اگر وہ رجوع کرے، تو اُن مین عدل
وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	کے ساتھ صلح کرادو، اور انصاف
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا	کرو، خدا منصفون کو دوست رکھتا
بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ	ہے، مومن تو آپس مین بھائی ہی ہین
	تو اپنے دونون بھائیون کے درمیان
(حجرات - ۱)	صلح کرادو،

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانون مین بھائی بھائی کا رشتہ ہے، یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہین کٹتا، انہی آیتون کے تحت مین وہ حدیث ہے جس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا	تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ
(بخاری۔ مظالم)	ظالم ہو یا مظلوم،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو، تو اس کی مدد کی جا سکتی ہے،

لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا اس طرح کہ اُس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے،

کیسا ہی بڑا سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا، اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا، وہ دفعۃً ہمارا مذہبی بھائی ہو گیا، خدا نے فرمایا،

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کر لیں
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي	اور نماز کھڑی کریں، اور زکوٰۃ دیں
الدِّيْنِ ط (توبہ - ۲)	تو وہ تمھارے مذہبی بھائی ہیں،

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے، تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو گیا، اگر اس کے باپ کا نام و نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا :-

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ	تو اگر تم اُن کے باپوں کے نام نہ جانو
فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ،	تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں، اور
(احزاب - ۱)	علاقہ مند،

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے وارثوں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اُس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ	تو اگر قاتل کو اُس کے بھائی کی طرف سے

شَیْءٌ ۝ (بقرۃ - ۲۲) کچھ معاف کر دیا جائے،

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے کیونکہ

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے

اَخِيْهِ مَيْتًا ۝ (حجرات - ۲) مردہ بھائی کا گوشت کھائے،

یتیمون کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا، متولیون کا فرض ہے اور اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جزء بنا لین، اور ملا جُلا کر خرچ کرین تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہین، جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہے، فرمایا:-

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ اور اگر تم اُن کو اپنے مین ملا لو تو یہ بھی جائز

(بقرۃ - ۲۷) ہے کیونکہ وہ تمھارے بھائی ہین،

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق مین دعائے خیر کرین، وہ یون کہتے ہین،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے

الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ۝ اُن بھائیون کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے

(حشر - ۱) معاف کر،

ایک مسلمان کے دل مین دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی برائی ہے جس کے دور کرنے کے لئے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہئے، اور کہنا چاہیئے،

وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (حشر-۱)

اور ہمارے دلون مین مسلمانون کی طرف سے کینہ مت رہنے دے، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے،

مسلمانون کی یہ صفت ہو کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش آتے ہین، خدا نے مدح فرمائی،

رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ۝ (فتح-۴)

وہ (مسلمان) آپس مین رحم وشفقت رکھتے ہین،

مسلمان کی یہ صفت ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے، اور نرمی کا برتاؤ کرے،

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (مائدہ-۸)

مسلمانون سے جھکنے اور نرمی کرنے والے،

مسلمانون کی اس باہمی اخوت محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یون فرمائی ہے "مسلمانون کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے مین جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو مین بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضا، بخار اور بے خوابی مین مبتلا ہو جاتے ہین[۱] (صحیح مسلم)

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۰ کتاب الادب وصحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹ کتاب البر والصلۃ والاداب، مصر،

کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا: سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں، کہ اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو، تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے[۱] مقصود یہ ہے کہ اُمّت مسلمہ ایک جسم ہے، اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضاء ہیں، بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف ہو یا دکھ درد ہو تو سارے اعضاء اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں، اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہئے کہ اُن میں سے ایک کو بھی تکلیف پہونچے، تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے،

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں، جیسے دیوار، کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے[۲] بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے، اس تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے، اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے، یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے، جب تک اُس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے، جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی،

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۹ مصر کتاب البر والصلۃ والآداب [۲] صحیح بخاری کتاب الآداب ج ۲ ص ۸۹۰ وصحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ ص ۳۰۹ مصر،

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اُس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اُس کی تحقیر کرے،........ انسان کے لئے یہ بُرائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے، مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اُس کا خون، اُس کا مال اور اُس کی آبرو"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اُس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے، جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا، تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اُس کے بدلہ قیامت میں اُس کی تنگی کو دُور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا"[2]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا، اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا، تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا، اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اُس کا پردہ رکھے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے"[3]

[1] صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۰۲ مصر [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۰ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ ص ۱۹۲

فرمایا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۱؎ یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے، دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ فرمایا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۲؎ یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے،

جریر بن عبداللہ بجلیؓ جو ایک مشہور صحابی تھے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۳؎ کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے، اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے۴؎ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے، اب جو اس کے خلاف کرتا ہے، وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے، چنانچہ اسی لئے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لئے مخصوص ہے، فرمایا کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے، الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا	کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے،

۱؎ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶، ۲؎ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶، و صحیح مسلم کتاب الایمان جلد ۱ ص ۳۶ مصر ۳؎ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳،

۴؎ صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ و جلد ۲ ص ۹۳،

وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ	اس مین پڑا رہے گا، اور خدا اس پر
وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا۔	خفا ہوا اور لعنت کی، اور اس کے لئے
(نساء-۱۳)	بڑا عذاب تیار کیا،

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ مین آپ نے پہلے لوگون کو چپ کرایا، پھر فرمایا، "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو"[1] ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو ہم (مسلمانون) پر ہاتھ اٹھائے وہ ہم مین سے نہین[2]"

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے[3]" اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ مین گرفتار ہو جس مین اُس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا، جس مین اُس کی عزت پر حرف آتا ہو، اور اس کی آبرو جاتی ہو، تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا، تو خدا بھی اوس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا[4]"

اگر دو مسلمانون مین کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہوجائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہین

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ص ۲۳ [2] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۰،
[3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۰۹ [4] ایضاً،

کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ اُدھر مُنہ پھیر لے اور یہ اودھر منہ پھیر لے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتدا کرے[۱]، ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا آپس میں کینہ نہ رکھو حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، اور کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے[۲]۔

ایک مسلمان کے لئے اُس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہے، قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لئے سلام کرے تو اُس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ	اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی
السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ؕ	کا کلمہ ڈالے، یہ نہ کہو کہ تو مومن
(نساء - ۱۳)	نہیں،

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے، کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پاکر حملہ کیا، اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا، مگر اس پر بھی اُن صحابی نے اُس کو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچی، آپ نے اُن کو بُلا کر دریافت کیا، انھوں نے عرض کی، یا رسول اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپ نے کس بلیغ انداز میں

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱، وسنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲ [۲] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۶،

فرمایا، تم اس کے لاالہ الا اللہ کے ساتھ کیا کروگے؟ ایک روایت مین ہو کہ فرمایا، کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا[1]

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا، اس کے قتل کے برابر ہے[2] یہ بھی فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دونوں مین سے ایک پر لوٹے گا[3] یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا، اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے،

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لئے دوزخ واجب، اور جنت حرام کرے گا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیون نہ ہو[4]

فرمایا، ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں اسلام کا جواب دینا، اس کے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا، اور مرجائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا[5] یعنی یہ کم سے کم حقوق ہین جن سے دو مسلمانون کے

---

[1] پہلی روایت صحیح بخاری غزوۂ حرقات اور کتاب الدیات مین ہے، دوسری روایت کے لئے دیکھو ابو داؤد کتاب الدیات شرح حدیث مذکور [2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۳ [3] ایضاً ص ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۴۳ مصر [4] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۵ مصر،

[5] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۰۲

درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، ارشاد ہوا کہ جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے، تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[۱] حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے، اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے، جن میں سے ہر رتی اُحد کے پہاڑ برابر ہوگی[۲] یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی، بلکہ یہ اس پیمانہ پر ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے،

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا، اُس برادرانہ الفت و محبت کے فروع ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے[۳] الغرض ملت اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے، اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان[۴] مسلمان کا آئینہ ہے، اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اُس کے نقصان کو دور کرتا ہے، اور اس کے

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۰۸ کتاب البر والصلۃ

[۲] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲

[۳] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶

پیچھے مین اس کی حفاظت کرتا ہے[1]؟

دیکھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادون پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتون پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیوارین ایسی شکستہ نہ رہین، جیسی آج ہین، ہر جماعت ان ہی اصولون پر دنیا میں بنی ہے، اور آیندہ بھی بنے گی،

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۲، تیسرے فقرہ کے مطلب مین شارحین کا اختلاف ہی،

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے، اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسانوں کو آگاہ اور باخبر کرے، اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے،

قرآن پاک نے توراۃ کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا، (بقرہ۔۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو،

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اسی لئے ارشاد ہوا :-

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر

عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ	آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی،	نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں)
(مائدہ-۲)	کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے،

ہر قسم کا برا سلوک اور بیرحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ آیت پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے، ابوہریرہؓ اور انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا	آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو،
وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ	ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے
اِخْوَانًا ؕ	سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے
(بخاری ۲)	اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ،

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں،

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا	ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک
وَلَا تَدَابَرُوْا وَكَانُوْا عِبَادَ اللّٰهِ	دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے
اِخْوَانًا	سے منہ پھیرو اور اے خدا کے بندو آپس
(بخاری)	میں بھائی بھائی بن جاؤ،

اس حدیث پاک مین انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے، فرمایا من لا یرحم لا یرحم (بخاری) "جو رحم نہین کرتا، اس پر رحم نہین کیا جاتا" جو بندون پر رحم نہین کرتا، اس پر خدا رحم نہین کرتا، یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہین کرتا، دوسرا بھی اس پر رحم نہین کرے گا" مستدرک حاکم مین ہو کہ آپ نے فرمایا اگر تم زمین والون پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا[1] یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا، اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا،" (بخاری) اس فیض کے عموم مین انسانیت کی قید بھی نہین ہے، ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانورون کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین بھی ثواب ہو، فرمایا؛ ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے مین ثواب ہے، یعنی ہر اس ہستی کے ساتھ جس مین زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے مین ثواب ہے[2] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ مین ہر وہ ہستی شریک ہے، جو زندگی سے بہرہ ور ہو

جامع ترمذی مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا؛ "جہان بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دوگے، اور لوگون کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ" (باب ماجاء فی معاشرۃ الناس ص ۳۳) ابوہریرہؓ کہتے ہین، کہ ایک دفعہ حضور نے

[1] مستدرک حاکم کتاب البر والصلہ جلد ۴ ص ۱۵۹ [2] یہ حدیثین صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب مین ہین،

پانچ باتین گنائین جن مین سے ایک یہ تھی، کہ واحبّ للناس ما تحبّ لنفسك" یعنی تم لوگون (ناس) کے لئے وہی چاہو، جو تم اپنے لئے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے"، الناس کا لفظ عام ہے جس مین تمام انسان داخل ہین، اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانون کی بھلائی کا جذبہ دل مین نہ ہو، انسان پورا مسلمان نہین بنتا،

کیونکہ دوسرون کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہو، اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے، ایک اور حدیث مین یہ تعلیم ان لفظون مین ہے، کہ تم اپنے بھائی کے لئے وہی چاہو، جو اپنے لئے چاہتے ہو" بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظون مین ہے کہ تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو" اسلام مین پڑوسیون کے حقوق کا بیان علٰحدہ باب مین گذر چکا ہے، اس پر بیان ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی مین یہودی اور عیسائی پڑوسیون کا حق بھی مسلمان پڑوسیون ہی کی طرح مانا ہے،

صدقہ و خیرات کے باب مین گو فقرا اور مساکین مین مسلمانون کی ترجیح ایک قدرتی باب ہے، تاہم حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ مین نامسلمان ذمی مسکینون کے حق کو بھی تسلیم کیا، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اُس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت

ے ترمذی ابواب الزہد غریب،

پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہون، حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے، اور اپنے گھر سے اُس کو کچھ دیا، پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا، اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگون کو دیکھو خدا کی قسم ہم انصاف نہین کرین گے، اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائین اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دین، قرآن مین صدقہ کی اجازت فقرار اور مساکین کے لئے ہے، فقرار تو وہی ہین جو مسلمان ہین، اور یہ لوگ مساکین اہلِ کتاب مین ہین اُن سے جزیہ نہ لیا جائے[۱]،

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلمانون کو دیئے جا سکتے ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ دارون کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا، ابن جریج محدث کہتے ہین کہ قرآن[۲] نے اسیر کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ مین مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے، ابو میسرہ اور عمرو بن میمون اور عمرو ابن شرحبیل صدقۂ فطر سے عیسائی راہبون کی مدد کیا کرتے تھے[۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا[۴]، اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضون کو اُن کے مشرک والدین کے ساتھ صلۂ رحمی کی اجازت دی[۵]،

تفسیر کی روایتون مین ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکون کی مدد سے

---

۱ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۲، مصر ۲ سورۂ دہر ۳ کتاب الاموال امام ابو عبیدہ ص ۶۱۳ و ۱۴، ۱ مصر،
۴ بخاری کتاب الجمعہ ۵ مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین،

کنارہ کرنے لگے، تو یہ آیت اُتری،[1]

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ (بقرہ)	اُن کو راہ پرلے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پرلے آتا ہے اور جو بھلائی خرچ کرو، وہ تمہارے ہی لئے ہے،

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا،

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا،

لا یومن احد کم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء لا یحبہ الا اللہ عزوجل، (جلد ۳ صفحہ ۲۷۲)	تم میں سے کوئی اس وقت پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی نہ پسند کرے، جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے،

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کردی گئی ہے،

---

[1] طبری،

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا، اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے، اُس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے، اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھا جاؤ، اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے، دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا، جو رُک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے، یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی، ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے، ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اُس کی قبر پر باندھتے تھے، اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے، اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مر جاتا، ایسے جانور کو بلیّۃ کہتے تھے، اسلام آیا تو اُس نے اس سنگدلی کو مٹا دیا، عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اُس پر نشانہ لگاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا

کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے،[1] ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا، اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لیکر اسکے خاندان مین آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہو، اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے، جو لوگ ایسا کرتے ہین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے،[2] اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ مین آکر یہ حالت دیکھی، تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانورون کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے، وہ مردار ہے،[3] یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانورون کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی،[4]

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا،[5] ایک حدیث مین ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا، تو خدا اُس کے متعلق اس سے بازپرس کرے گا، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے پھینک دے،[6] اس حدیث سے معلوم

[1] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ ص ۲۵۵، [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فہو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۱۸۲، [6] مشکوٰۃ الصید والذبائح ص ۳۵۰،

ہوتا ہے کہ جن جانورون کا گوشت کھایا نہین جاتا، اور وہ درندہ بھی نہین اُن کا مارنا جائز نہین،
سنن نسائی مین ہو کہ جو شخص گنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہان فریاد
کرے گی کہ فلان نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے، اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[۱] جو جانور کوئی نقصان
نہین پہنچاتے، یا اُن سے انسانون کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، اُن کا مارنا بھی جائز نہین، چنانچہ آپنے
خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہی[۲]

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کئے جاتے ہین، اُن کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح
کی نرمی کرنے کا حکم دیا، ایک حدیث مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ خدانے ہر چیز پر احسان کرنا فرض
کیا ہی، اس لئے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو، اور جب ذبح کرو تو اچھے
طریقہ سے ذبح کرو، تم میں ہر شخص اپنے چھری کو تیز کرلے، اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[۳]
ایک حدیث مین ہو کہ ایک صحابی نے کہا کہ یارسول اللہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس
پر رحم آتا ہی، یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم
پر رحم کرے گا[۴] یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانورون کے ذبح
کرنے کی ممانعت فرمائی[۵]، کیونکہ اس سے جانورون کو تکلیف ہوتی ہے کنکر، پتھر یا غلیل چلانے
کی بھی ممانعت فرمائی، اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا، البتہ اس سے
دانت ٹوٹ سکتا ہے، اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[۶] مطلب یہ کہ بلاضرورت جانورون اور پرندون کو جسمانی

---

[۱] نسائی کتاب الضحایا ص ۹، [۲] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح ص ۳۶۲ [۳] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ [۴] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۶ [۵] نسائی ص ۴۰ [۶] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقۃ،

صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانورون کے ساتھ جو بے رحمیان کی جاتی تھین، ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانورون کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانون کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانورون کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے،

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپنے فرمایا کہ اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ دیا، اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا، اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مرگئی[۱] بلکہ لوگ چونکہ انسانون کی بہ نسبت جانورون کو زیادہ ستاتے ہین، اس لئے وہ اس معاملہ مین بہت زیادہ گنہگار ہین، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ جانورون کے ساتھ جو بدسلوکیان کرتے ہو، اگر خدا اُن کو معاف کردے تو سمجھو کہ اس نے تمھارے بکثرت گناہ معاف کردیئے[۲]،

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ مین تھے، آپ ضرورت سے کہین تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے، جہان زمین مین یا درخت پر چیونٹیون کا سوراخ تھا، یہ دیکھ کر آپنے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے، اُن صاحب نے کہا یا رسول اللہ! یہ مین نے کیا ہے، آپ نے فرمایا بجھاؤ بجھاؤ[۳] (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیون کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائین)،

ایک حدیث مین ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو اُن کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا،

---

[۱] بخاری کتاب الانبیاء ص ۴۹۵، [۲] مسند ابن حنبل جلد ۲ ص ۱۴۴، [۳] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبد اللہ ابن مسعودؓ،

انھون نے پہلے اپنا سامان اُس جگہ سے ہٹایا، پھر تمام چیونٹیون کو آگ سے جلا دیا، اس پر خدا نے انکو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیون نہین جلایا[1] یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا، تمام چیونٹیون کا قصور نہ تھا، ایک حدیث مین ہے کہ سفر جہاد مین صحابۂ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے، چڑیا فرط محبت سے اُن کے گرد منڈلانے لگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضاے حاجت کے لئے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچون کو پکڑ کر کس نے اُس کو بے قرار کیا ہے، اس کے بچون کو چھوڑ دو، صحابۂ کرام نے چیونٹیون کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا، دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا، تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے،[2]

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانون کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہٖ اسی طرح جانورون اور پرندون کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے، اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ مین نے خاص اپنے اونٹون کے لئے پانی کے جو حوض بنائے ہین، اُن پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہین، اگر مین اُن کو پانی پلا دون تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[3]

ایک حدیث مین ہے کہ ایک شخص راستہ مین جارہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی، اتفاق سے اس کو ایک کنوان مل گیا، اور اُس نے کنوئین مین اُتر کر پانی پی لیا، کنوئین سے نکلا تو دیکھا کہ ایک

---

[1] بخاری جلد اول کتاب بدء الخلق ص ۴۶۰ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار [3] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء

کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے، اور کیچڑ چاٹ رہا ہے، اُس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کر کے اُس پر ترس کھایا، اور کنوئین مین اتر کر پانی لایا، اور اُس کو پلایا، خدا کے نزدیک اس کا عمل مقبول ہوا اور خدا نے اُس کو بخش دیا، صحابۂ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یارسول اللہ! کیا جانورون کے ساتھ سلوک کرنے مین بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے[1]، صرف جاندارون ہی تک نہین، بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا، اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے، اور اُس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے، تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے[2]

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانورون کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اُس سے وہی کام لینا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ مین اس کے لئے نہین پیدا کیا گیا ہون، صرف کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہون[3]، نیز فرمایا کہ اپنے جانورون کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے اُن کو تمھارا فرمانبردار صرف اس لئے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات مین پہنچا دین، جہان تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے، تمھارے لئے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتین اسی

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمة الناس والبہائم۔ [2] بخاری ابواب الحرث و المزارعة باب فضل الزرع و الغرس اذا اکل منہ،

[3] بخاری ابواب الحرث و المزارعة باب استعمال البقر للحراثة،

پوری کرو[1]، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلاضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہین کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت مین اس پر سوار ہونا چاہئے،

(۲) جانورون کے آرام وآسایش کا خیال رکھنا چاہئے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ مین سفر کرو تو اونٹون کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانہ مین سفر کرو تو اُس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ[2]، تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ مین ہوتی ہے، اس سے وہ جلد نجات پائے،

ایک بار آپ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بے زبان جانورون کے معاملہ مین خدا سے ڈرو، اُن پر سوار ہو، تو اُن کو اچھی حالت مین رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت مین رکھ کر کھاؤ[3]،

ایک بار آپ ایک انصاری کے باغ مین رفع حاجت کے لئے گئے، اس مین ایک اونٹ تھا، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ کر بلبلایا، اور آب دیدہ ہوگیا، آپ اس کے پاس گئے، اور اُس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق، [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب البہائم،

نوجوان نے آکر کہا کہ میرا یا رسول اللہ" ! فرمایا اس جانور کے بارہ مین جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہین ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو، اور اس پر جبر کرتے ہو،[۵۱]

(۳) جانورون کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی، اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا،[۵۲]

(۴) جانورون کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا،[۵۳] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہین،

پچھلے صفحون پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ مین جو دل ہے، وہ کتنا نرم ہے، اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے،

۵۱ ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم ۵۲ ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدو[اب]
۵۳ ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم،

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہین کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکماے اخلاق نے اُن کی دو قسمین کی ہین، ایک اُمّہاتِ اخلاق، اور دوسری فروعِ اخلاق، اُمّہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہین، جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہین، اور جن کی کمی وبیشی سے اخلاق کی مختلف قسمین پیدا ہوتی ہین، اور جن کے اعتدال سے فضائلِ اخلاق کا وجود ہوتا ہے،

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتین ہین، قوتِ علمیہ، قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضبیہ، قوتِ علمیہ کے اعتدال کا نام **حکمت**، قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کا **عفت** اور قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا **شجاعت** ہے، اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہین، پھر ان دونون قسمون کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور مین آتے ہین،

یہ تقسیمین محض فلسفیانہ ہین، یا یون کہیے کہ علمی اور نظری ہین لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہین، بلکہ عملی ہے، کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہین

بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا، اور رذائلِ اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لئے اُس کو اس سے بحث نہیں کہ فلان خلق کی اصلیت کیا ہے، اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہین، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا، اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لئے اپنی تعلیم مین اُس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہین کیا ہے، اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے،

اسلام کی ہر شے مین خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور وہ بُرا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہو کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے، اُس مین عقلی خوبیان اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے، اُس مین عقلی بُرائیان اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمین ہین، وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے، یہ فضائل کہلاتے ہین، اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہین، ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان مین وہ آیتین لکھدی ہین جن مین اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے،

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے، اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح مین فضائل کا نام دیا ہے، یہ فضائل بہت سے ہین، اور قرآنِ پاک اور احادیثِ شریفہ مین جا بجا اُن کی تصریح ہے لیکن اُن کے بیان مین اخلاقِ شرعی کے مصنفون نے کوئی خاص ترتیب نہین رکھی ہے، اسی لئے اُن کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہین مقرر ہوئے،

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو، اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانوں کو اُس سے متصف ہونے پر کتاب الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو، اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو،

گو اس معیار کو سامنے رکھکر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے، اور غور و فکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے، لیکن جہاں تک میری تلاش اور جستجو کو دخل ہے، اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا،

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا اُن اوصاف والوں کے لئے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی میں جابجا اُن کی تفصیل ہے جیسے :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ	ایمان والے مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ	نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بیکار
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ	باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے،
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ	جو زکوٰۃ دیتے، اور اپنی شرمگاہوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن اپنی
حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں

أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ
غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغَى وَرَآءَ
ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝
وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ
صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ
الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

(مومنون - ١)

سے کہ اُن پر کوئی الزام نہین، تو جو
اس کے سوا کے خواہان ہون تو وہی
حد سے بڑھنے والے ہین، اور وہ جو
اپنی امانتون اور اپنے عہد کا لحاظ
رکھتے ہین، اور جو اپنی نمازون کے
پابند ہین، یہی اصلی وارث ہین جو
فردوس کے وارث ہون گے، اور
وہ اس مین ہمیشہ رہین گے،

ان آیتون مین جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہین، نکمّی اور بے کار باتون سے کنارہ کشی، عصمت اور پاکدامنی، امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے،

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَ
الْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى
الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ
السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ

اور لیکن اصلی نیکی اس کی ہے جو اللہ پر
اور آخرت پر اور فرشتون پر اور کتاب الٰہی
پر اور پیغمبرون پر ایمان لایا، اور اپنا مال
اس کی محبت کے ساتھ رشتہ دارون کو
اور یتیمون کو اور غریبون کو اور مسافرون کو اور
مانگنے والون کو اور گردنون کے چھڑانے
مین دیا، اور نماز کھڑی کی، اور زکوٰۃ دی، اور

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	اپنے قول کو جب انھون نے اقرار کیا
عَاهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي	پورا کرنے والے، اور مصیبت مین اور
الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ	تکلیف مین اور لڑائی کے چل چل کے
الْبَاْسِ ۭ (بقرہ ۲۲)	وقت ثابت قدم رہنے والے،

ان آیتون مین جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہین، وہ یہ ہین، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا اور مشکلون مین ثابت قدمی،

سورۂ آل عمران مین ہے،

الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَ	ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے
الْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ ۝	والے اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے
(آل عمران ۲)	والے، اور (خدا کی راہ مین) خرچ کرنیوالے

اس آیت مین ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ مین ان متقیون کا حال ہے، جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہون گے،

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ	جو خوشحالی اور تنگ دستی دونون حالتون
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ	مین (خدا کے نام) خرچ کرتے ہین، اور
وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ	غصہ کو روکنے، اور لوگون کو معاف کرتے
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝	ہین، اور اللہ نیکی کرنے والون کو دوست
(آل عمران ۱۴)	رکھتا ہے،

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے سورۂ معارج میں ہے؛

وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ	اور جن کے مال میں مانگنے والے، اور
مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَ	مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو
الَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ	روز جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے
وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ	رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ
مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ	اُن کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز
غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ	نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى	کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی
اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ	باندیوں سے، کہ اس میں اُن پر کوئی
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى	ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں،
الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ	جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝	پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ (معارج-۱)	پر قائم رہتے ہیں،

ان آیتوں میں سخاوت نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو
کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے، جو اُس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں؛
سورۂ احزاب میں اُن مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشش

اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے،

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیان
وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ	صبر کرنے والے، اور صبر کرنے والیان
وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ	اور عاجزی کرنیوالے اور عاجزی کرنیوالیان
وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ	اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیان
وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	اور روزہ رکھنے والے، اور روزہ رکھنے
وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ	والیان، اور اپنی شرمگاہون کی
وَالْحٰفِظٰتِ ہ	حفاظت کرنے والے، اور حفاظت
(احزاب - ۵)	کرنے والیان،

ان مین سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے،

سورۂ فرقان مین خدا کے اچھے بندون کی پہچان یہ بتائی گئی ہے،

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ	(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ
يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا	ہین جو زمین پر ہولے چلتے ہین، اور
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	جاہل جب اُن سے (جہالت کی) باتین
قَالُوْا سَلٰمًا (ع - ۶)	کرین تو وہ کہین سلامت رہئے،[لہ]
(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ	(۲) اور جب وہ خرچ کرین تو نہ تو

لہ یا سلام کہیں،

يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ — فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور

بَيْنَ ذَالِكَ قَوَامًا (فرقان ۶) — دونوں کے بیچ کی راہ ہو،

(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ — (۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان

حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (۳) — نہیں لیتے، اور نہ بدکاری کرتے ہیں

(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ — (۴) اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے،

الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا — اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے

كِرَامًا (۳) — گذریں تو شریفانہ وضع سے گذر جائیں،

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی، تیسری میں عدم ظلم اور عفت، اور چوتھی میں سچائی، اور متانت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی،

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ — جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں

وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَ — اور قول کو توڑتے نہیں، اور جس کے

الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ — جوڑنے کو خدا نے کہا ہے، اس کو

بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ — جوڑے رکھتے ہیں، اور اپنے مالک

رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ — سے ڈرتے ہیں، اور بری طرح حساب

الْحِسَابِ ہ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا — ہونے سے سہمے رہتے ہیں، اور جنہوں نے

ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا — اپنے مالک کی خوشی کے لئے صبر کیا،

الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ	نماز کھڑی کی، اور ہم نے جو ان کو دیا، اس سے
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ	چھپے اور کھلے، اچھے کاموں میں خرچ
بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ	کیا، اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے
عُقْبَى الدَّارِ (رعد-۳)	ہیں، انہی کے لئے پچھلا گھر ہے،

اس ایفائے عہد سے وہ بھی مراد ہو سکتا ہے، جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے، اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے، جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہلِ قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں، ان دو کے سوا ان آیتوں میں انکی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلائی کرکے برائی کو دھو دیتے ہیں،

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لئے کریں گے
لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي	جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں
الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ	چاہتے، اور آخر انجام پرہیزگاروں
لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (قصص-۹)	کے لئے ہے،

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے،

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ	اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی
وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ	کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب
يَغْفِرُوْنَ ۝ (شوریٰ-۱۰)	بنھیں غصہ آتا ہے، تو معاف کردیتے ہیں

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے، اور معاف کر دیتے ہیں،

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ) — بیشک اللہ انصاف والون کو پیار کرتا ہے،

عدل وانصاف کی فضیلت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے،

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (بقرہ - ۲۴) — بے شک اللہ نیک کام کرنے والون کو پیار کرتا ہے،

اس پیار اور محبت کے استحقاق مین ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے،

حدیثون مین جن اخلاقی فضیلتون کا بیان ہے، وہ متفرق طور سے پچھلے صفحون مین گذر چکی ہین، اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئین گی،

———— ۰ ————

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیون کے سرفہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال مین سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتین آجاتی ہین،

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کے لئے اس کا دل اور اُس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہون، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہین اُس کا دل ہر بُرائی کا گھر ہو سکتا ہے، اور جو سچا ہے، اس کے لئے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے، کہتے ہین کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ مجھ مین چار بُری خصلتین ہین، ایک یہ کہ بدکار ہون، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہون، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہون، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہون، اُن مین سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دون، ارشاد ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اُس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا، اور پھر بدکاری

کے لئے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھین گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی ؟ تو کیا جواب دون گا، اگر ہان کہون گا تو شراب اور زنا کی سزا دیجائے گی، اگر نہین کی تو عہد کے خلاف ہو گا، یہ سوچ کر ان دونون سے باز رہا، جب رات زیادہ گذری، اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لئے گھر سے نکلنا چاہا، تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہون گا، ہان کرون گا تو ہاتھ کٹے گا، اور نہین کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی مین حاضر ہوا، اور عرض کی، یا رسول اللہ جھوٹ نہ بولنے سے میری چارون بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئین، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے،[1]

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی بُرائیون سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ بُرائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایماندار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل مین نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اوس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگون کو اس کے قول فعل پر اعتبار

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی مین سورۂ ن مین کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہین معلوم ہوا،

ہوگا، جو کہے گا، کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی،

صدق، صفاتِ ربانی میں سب سے بڑی صفت ہے، خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے، قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے،

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ٥ (نساء-۱۱) اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں،

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے،

وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ	وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ
مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ٥ (نساء-۱۸)	سے زیادہ سچا بات میں،

خدا سچا ہے، اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا:

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ٥ (انعام-۱۸)	اور ہم ہیں سچے،
قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ	کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو
اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ٥ (آل عمران-۱۰)	ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو،
وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ	اور جو سچائی کو لے کر آیا، اور
صَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ	اس سچائی کو سچ مانا، وہی تو پرہیزگار
الْمُتَّقُوْنَ (زمر-۴)	ہیں،

اس آخری آیت میں سچائی سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے، مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ

ہوتے ہین، ہرسچی بات کو قبول کرتے ہین، اور اپنے ہر قول اور عمل مین سچائی کو پیش کرتے ہیں،

اہلِ ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولون کے وعدون کو سچا ہوتے اپنی آنکھون سے دیکھتے ہین تو پکار اٹھتے ہین،

وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (احزاب)　　اور خدا اور اُس کے رسول نے سچ کہا،

چونکہ رسول، خدا سے علم پاتے ہین، اس لئے وہ بھی سچے ہوتے ہین،

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰسٓ-۴)　　اور پیغمبرون نے سچ کہا،

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبرون کا سب سے پہلا وصف ہے، کیونکہ اُن کی ساری باتین، دعوے، دلیلین اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہون تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبرون کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملتِ حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم ۳)　　اور کتاب مین ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس سے نامزد کیا ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (مریم-۴)　　اور کتاب مین ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے،

حضرت مریمؑ جنھون نے اللہ کی باتون کے سچ ماننے مین ذرا بھی پس وپیش نہین کیا،
اس وصف سے ممتاز ہوئین، فرمایا گیا،

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ، (مائدہ-۱۰) اور اُن (عیسیٰ) کی ماں بڑی سچی تھین،

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر مین ایسے سچے نکلے، بندون کی زبان سے
صدیق کہلائے،

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف) یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر وشکو کا جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا تو
خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ اور کتاب مین اسماعیل کا ذکر کر،
كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ بے شبہ وہ وعدہ کا سچا، اور بھیجا
رَسُوْلًا نَّبِيًّا (مریم-۴) ہوا نبی تھا،

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگون کو ملے گی، اُن مین وہ بھی ہون گے، جو دنیا
مین دوسری صفتون کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے،

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ (آلِ عمران ۲) صبر کرنے والے اور سچے،

خدا نے جن لوگون کے لئے اپنی مغفرت اور اجر عظیم کے وعدے کئے ہین، اُن مین
اسلام وایمان اور خدا کی فرمان برداری کے بعد پہلا درجہ سچون اور راست بازون کا
ہے، فرمایا:-

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ	بے شک اسلام قبول کرنے والے
وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے
وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَ	مرد اور عورتیں، اور فرمانبردار مرد
الصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	اور عورتیں، اور سچے، مرد اور سچی
الآیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	عورتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا	خدا نے اُن کے لئے مغفرت اور بڑی
عَظِيْمًا ۝ (احزاب۔ ۵)	مزدوری رکھی ہے،

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا، اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے،

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو اُن کا
صِدْقُهُمْ، (مائدہ۔ ۱۶)	سچ کام آئے گا،

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچے اُترنے والوں کو اُنکی
بِصِدْقِهِمْ ۝ (احزاب۔ ۳)	سچائی کا عوض دے،

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنیکا حکم پر حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی

جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو، اور ان ہی کی صحبت مین رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعب بن مالک، اور اُن کے دو ساتھیون نے جو تبوک کے سفر مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکے تھے، ہر قسم کی تکلیفین سہکر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اُس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے،

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ — اے ایمان لانے والو، خدا سے ڈرو، اور

وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (توبہ ۱۵) — سچون کے ساتھ ہو،

اہل تفسیر کے نزدیک یہان ان سچون سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہین جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانون کو سچون کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے،

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہین، مگر اسلام کی نگاہ مین اس کے بڑے وسیع معنی ہین، جس کے لحاظ سے اُس کے اندر اکیلے قول ہی نہین، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم مین بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمین کی ہین، اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہین، بات مین سچائی، ارادہ اور نیت مین سچائی، عزم مین سچائی، عزم کو پورا کرنے مین سچائی، عمل مین سچائی، اور دینداری کے مقامات اور مراتب مین سچائی، لیکن ذرا معنی مین وسعت دیکھئے تو اُس کی تین ہی قسمون مین ساری سچائیان آجاتی ہین، یعنی زبان کی سچائی،

دل کی سچائی اور عمل کی سچائی،

زبان کی سچائی | یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے، اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے، اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ	تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض
وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ	دے، اور منافقوں کو سزا دے، اگر
(ع-۳)	چاہے.....

اس آیتِ پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے ؟ فرمایا ہو سکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے؟ جواب دیا ہو سکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، فرمایا نہیں[۱]، کئی صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے، لیکن خیانت کاری

---

[۱] موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب،

اور جھوٹ پر[1] (نہیں) مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر بُرائی ہوسکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہوسکتی ہے، کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو[2] ان روایتوں کی معنوی تائید اُس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ جس میں چار باتیں ہوں، وہ پکا منافق ہے، اور جس میں اُن میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جب تک وہ اُس کو نہ چھوڑ دے، جب امانت اُس کے سپرد کی جائے، تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے، تو پورا نہ کرے، اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے[3]" یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ منافق کی علامتیں تین ہیں، جب کہے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے، تو بے ایمانی کرے[4] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے"

---

[1] عن ابی امامۃ عند احمد، وعن سعد بن ابی وقاص عند البزاز وابی یعلیٰ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعاً وموقوفاً [2] مسند احمد عن ابی ہریرۃؓ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلیٰ عن عمر بن الخطابؓ یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب وترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں، [3] صحیح بخاری کتاب الایمان، صحیح مسلم وابو داود وترمذی ونسائی [4] صحیح بخاری کتاب الایمان و کتاب الادب وصحیح مسلم،

اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو۔[1]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے، اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے، اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہانتک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔"[2]

دل کی سچائی صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپکی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار اُن کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

وَاللّٰہُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ، (مُنٰفِقُوْن-۱)	اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں،

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری، کتاب الادب،

یعنی اپنی شہادت مین جھوٹے ہین، زبان سے تو یہ کہتے ہین کہ ہم اقرار کرتے ہین کہ آپ خدا کے رسول ہین لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہین، اُن کے دل مین کچھ ہے، اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے، جس کی بُرائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو، اور ظاہر کچھ اور کیا جائے، تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم ایک شہید اور ایک دولتمند پیش ہون گے، ان در ہر ایک اپنے علم و دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا، لیکن ان کارنامون کو سُن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو، اور فرشتے بھی یہی کہیں گے[1]، یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کئے گئے تھے، تاہم چونکہ اُن مین اخلاص نہ تھا، اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھوٹ کہا کہ اُن کے کارنامون کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی، بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہان کوئی معاوضہ نہین،

عمل کی سچائی عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، یا یون کہیئے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہون، مثلاً ایک شخص نماز مین خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمایش ہے، تو یہ شخص ظاہر کر

[1] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعۃ،

کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھکر بدیک ہے، ایک شخص نمایش کے لئے ایسا نہین کرتا تاہم ظاہری طور پر اُس کی نماز سے جو خشوع و خضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن مین وہ خشوع وخضوع نہین ہے، اس لئے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہین کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال مین صادق نہین اس لئے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لئے جن مسلمانون نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ مین جان و مال سے جہاد کیا، وہ خداتعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مسلمان تو وہی ہین جو اللہ اور اس کے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	رسول پر ایمان لائے، پھر (کسی طرح
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	کا) شک (وشبہہ) نہین کیا، اور
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ	اللہ کے رستے مین اپنی جان و مال سے
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (حجرات-۲)	جہاد کیا یہی سچے لوگ ہین؛

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کردی،

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہین، ایک یہ بھی ہے، کہ جو ارادہ کیا جائے اُس مین کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو، مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن جب اُس کی آزمایش کا وقت آتا ہے، تو اُس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہوتا ہے، اس لئے

ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو، منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے، کیونکہ عدم یقین کی کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا
نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ
سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ
فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ
اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ
مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ
طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ
فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا
اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ،

(محمد ۲۰)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے
ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت
نازل ہو، پھر جب کوئی سورۃ اترتی
ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو
(اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں
(نفاق کا) روگ ہے، تم اُن کو دیکھتے ہو
کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوفزدہ)
دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی پر موت کی
بیہوشی طاری ہو، تو اُن پر تف ہو،
(رسول کی) فرمانبرداری چاہیے، اور
صاف و صحیح جواب دینا چاہیے، اور جب
بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے
رہیں تو یہ اُن کے حق میں بہتر ہے،

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و

قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے، اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرلے، اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اُس میں ضعف ظاہر ہو، اس لئے صحابۂ کرام مین جن لوگون نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، خدا نے اُن کو سچا کہا ہی،

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر مین شرکت کا موقع نہین ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انھون نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ مین شرکت کا موقع ملا، تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤن گا، چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد مین شریک ہوئے اور نیزے تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفاے عزم کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان مین یہ آیت نازل فرمائی،[1]

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	مسلمانون مین کچھ لوگ ایسے ہین کہ
مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ	خدا کے ساتھ انھون نے (جان نثاری
فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ، وَ	کا) جو عہد کیا تھا، اس مین سچے اترے
مِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا	سو (بعض تو) اُن مین سے ایسے تھے
بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا، لِیَجْزِیَ	جو اپنی پوری کر گئے، (یعنی شہید ہوئے)
اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِھِمْ	اور بعض ان مین سے ایسے ہین جو

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب،

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

(احزاب - ۳)

(شہادت کے) منتظر ہیں اور انھوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی توڑ جوڑ نہیں کیا، تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض دے، اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن کو معاف کرے،[1] بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

صدق عمل کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں، آپ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لئے رات کو جاگا کرتا ہوں، (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ)، گویا میں علانیہ عرش الٰہی کو دیکھ رہا ہوں گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں" ارشاد ہوا کہ تم نے جان لیا اسی پر قائم رہو،[2]

---

[1] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرما دے گا۔ [2] اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک،

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبتون مین اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے، انھون نے پوچھا حنظلہ کیا بات ہے؟ بولے میں منافق ہوگیا، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین ہوتے ہین، اور آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہین، تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہین لیکن جب پلٹ کر بال بچون، اور دنیوی کاروبار مین مشغول ہوجاتے ہین تو سب بھول جاتے ہین، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونون بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آئے، اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمھاری مجلسون مین مصافحہ کرتے، یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے۔[۱]

قرآن پاک کی اس آیت مین گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے فرمایا،

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ (تکاثر)

ہرگز نہین اگر تم کو یقینی علم ہوتا تو تم سے غفلت نہ ہوتی،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہین ہوسکتے،

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتون مین ہے،

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

نیکی یہی نہین کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی تو ان کی ہے،

۱ؔ ترمذی ابواب الزہد،

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ	جو اللہ اور روزِ آخرت اور فرشتون
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	اور (آسمانی) کتابون اور پیغمبرون
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى	پر ایمان لائے، اور مال اللہ کی
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى	حُب پر رشتہ دارون اور یتیمون
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	اور محتاجون اور مسافرون اور
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي	مانگنے والون کو دیا، اور (غلامی
الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ	وغیرہ کی قید سے لوگون کی) گردنون
اٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	(کے چھڑانے) مین (دیا) اور نماز
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا	پڑھے اور زکوٰۃ دیتے رہے، اور جب
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ	(کسی بات کا) اقرار کرلیا، تو اپنے
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ	قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا	مین اور ہل چل کے وقت مین ثابت
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ،	قدم رہے، یہی لوگ ہین جو سچے نکلے
(بقرہ ع ۔ ۲۲)	اور یہی ہین پرہیزگار،

ان آیتون مین جن کو صادق کہا گیا ہے اُن کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہین، اول اُن کے ایمان کا کمال، دوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ مین اُن کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ علم اور عمل کے اِن تمام فضائل کے درجۂ کمال

کو پہنچ جاتے ہیں، اُن کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہیں۔[1] جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمسری کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے،

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ	تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول بندوں)
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ	کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَ	کئے یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور
حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا	(دوسرے) نیک بندے اور یہ لوگ
(نساء-۹)	(کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں،

سورۂ حدید میں ایمان کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (حدید)	لائے وہی صدیق ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اُس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے، جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہو سکتا، یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ انسان سچ

[1] الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل، (مجمع البحار مختصر)	صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو،

بولتے بولتے صدیق ہو جاتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے،

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو، تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے، سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہین، اور اس کی بہت سی صورتیں ہین، اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کئے بغیر کسی دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لئے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ مین ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ مین ڈال دینا، دوسرون کو بچانے کے لئے یا حق کی حمایت مین اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہین جن کے امتیاز کے لئے الگ الگ نام رکھے گئے ہین،

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنون کو گھیرے، اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمون کو محیط ہے، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسرون کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر بنیادی کامون کی بنیاد ہے،

سورۂ بقرہ کے شروع مین اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندون کے کچھ اوصاف بتائے

ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے،

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ — اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں"

(بقرہ - ۱)

بعض اہل تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں[1]، بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دیگئی پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے، اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا، یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو ملا ہے، اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں، یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے، اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے،

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے، اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا، اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور،

جذبہ نہ ہوگا، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کرکے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے،
سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایثار (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے، سورۂ
بقرہ میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید آئی ہے، اور کہیں کہیں
اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ	سے کچھ خرچ کرو، جو ہم نے تم کو دیا ہے
یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ	اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں
وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ	نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (بقرہ - ۳۴)	ہے اور کافر ہی ہیں ظالم،

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روز جزا کے فائدہ کا خیال نہ کرکے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا، وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے، جو خدا کی روزی کی نعمت پاکر اس کے شکرانہ میں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے، کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ

میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کرکے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو، کہ اُس دن یہی کام آنے والا ہے،

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اُس میں خلوصِ نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو، اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، (مدثر-۱) اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ زیادہ بدلہ چاہے۔ اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا، اور قیامت کے غم وملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے،

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي	جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ
سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا	کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کرکے پیچھے
أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ	نہ تو احسان دھرتے ہیں، اور نہ الاہنا
أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	دیتے ہیں، ان کی مزدوری ان کے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ،	پروردگار کے پاس دھری ہے، اور
(بقرہ-۳۶)	نہ ان کو ڈر ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہونگے،

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا	اے وہ لوگو جو ایمان لائے اس میں
مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا	سے جو تم نے کمایا، اور اس میں سے

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ	جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا
لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ	اچھی چیزیں خرچ کرو، اس میں سے
تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ	بُری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو، کہ
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ط	تم دیتے ہو؛ حالانکہ تم اب اس کو لینے
(بقرہ - ۳۷)	والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اُس کے لینے میں میچ لو،

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ویسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا، صاف فرمایا :-

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا	ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے، جب تک
تُحِبُّوْنَ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ	تم اُس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ.	پسند ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو خدا
(آل عمران - ۱۰)	جانتا ہے،

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے، اور اسی لئے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے، اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد، اور

محتاجون کی مدد مین جو کچھ دیتے ہو، اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو، اور دین مین تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کریگا، فرمایا:

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (بقرہ ۔ ۳۷)	اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمھارے ہی لئے ہے، اور تم نہین خرچ کرتے، مگر اللہ کے لئے، اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دیا جائے گا، اور تمھارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی،

اور اسی لئے کہ دنیا مین جو کچھ دے گا، وہ آخرت مین اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے، اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً (بقرہ ۔ ۳۲)	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے،
مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ (حدید ۔ ۲)	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تو وہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے اور ہو اس کے لئے عزت کی مزدوری،

آگے چل کر فرمایا،

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ	بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات
وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ
يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ	کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا
(حدید - ۲۰)	اور ان کے لئے عزت والی مزدوری ہے

کہیں حکم کی صورت میں ہے،

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا (مزمل - ۲)	اور اللہ کو اچھا قرض دو،

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لئے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے، اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا، اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے،

اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے،

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اور اگر (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض
(مائدہ - ۲)	دیتے رہے،

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا،

لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ	تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتار دونگا
وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	اور تم کو ان باغوں میں داخل کردوں گا

مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (مائدہ۔۳) — جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے، اور خوشی نیتی کے ساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے تھے، خدا نے اُن کی تعریف فرمائی،

وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ (توبہ۔۱۲)

اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں، اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ سے نزدیک ہونا، اور رسول کی دعا لینا،

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی،

اَلَاۤ اِنَّهَا قُرۡبَةٌ لَّهُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (توبہ۔۱۲)

ہاں! وہ اُن کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

متقی سخیوں کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے، اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے،

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ

وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ	آسمان اور زمین تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ	کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں
الضَّرَّآءِ الآیۃ (آل عمران ۱۴)	حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں .....

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گونا کیونکر ہوگا، دور ہو جاتا ہے فرمایا،

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ	میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی
اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ	سی ہے جس سے سات بالیں اُگتی
كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط	ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ	اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھا
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ۳۶)	دیتا ہے، اور اللہ گنجایش والا ہے

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، خدا گنجایش اور کشایش والا ہے، اس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے، اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے دیا ہے، اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خدا کی خوشنودی کے لئے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے،

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	خوشنودی چاہنے کے لئے اور اپنے
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ	کو پکا کرنے کو دیتے ہین ایک باغ
اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا	کی سی ہے، جو کسی ٹیلہ پر ہو اس
ضِعْفَيْنِ، فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ	پر مینھ پڑا تو اُس نے اپنا پھل دونا
فَطَلٌّ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	دیا، اور اگر مینھ نہین پڑا تو اوس
بَصِيْرٌ ہ	ہی پڑی، اور اللہ تمھارے کام
(بقرہ ۔ ۳۶)	دیکھتا ہے،

اس مثال مین ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین مین پانی سے اور وہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے، ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ مین جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ مین سّتو ہو جاتا ہے، اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے اس لئے ہماری نیتون کے بھید سے بھی آگاہ ہے،

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل مین بیان کیا گیا ہے،

۱۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَ	تو جس نے (راہِ خدا مین) دیا، اُ
صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ	پرہیز کیا، اور اچھی بات کو مانا

لِلْيُسْرٰى، (ليل - ۱)

تو ہم اس کے لئے نیکی کی اسی بات کا راستہ آسان کرین گے،

۲ - وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (ليل - ۱)

۲ - اور اس (دوزخ کی آگ) سے وُہ پرہیزگار بچا یا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے، اور اس پر کسی کا احسان نہین جس کا بدلہ دیا جائے، بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لئے اور وہ خوش ہو جائیگا،

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا مین دینے کی عادت، اطاعت وعبادت، یا نیک کامون کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو دادو دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جُود و سخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو، بلکہ مقصود صرف خدا ہو، اور یہ ہو کہ مال ودولت کے میل سے اُس کا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو خدا فرماتا ہے، تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت مین یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل مین پاکیزگی آتی ہے،

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے، جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لئے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلون کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی بر ملا تعریف، اور جمع مال، حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروون کے دلون سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لئے جاتی رہے،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝	پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب
الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ	کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی
يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝	کی، اور اس کو گن گن کر رکھا سمجھتا ہو
(همزہ ۱-۷)	کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی

ایک اور آیت مین مال کی محبت پر کافرون کو طعنہ دیا ہے،

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝	اور تم مال و دولت سے بہت ہی
(الفجر-۱)	محبت رکھتے ہو،

یہی محبت، سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر مین نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا، اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ مین دینا) کے سلسلہ

مین ان لفظون مین ادا کیا ہے،

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے
یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ	اور تمہین بے حیائی کی بات (بخل)
یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ	کو کہتا ہے، اور خدا تم سے اپنی طرف
فَضْلًا ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ	سے گناہون کی بخشایش اور فضل وکرم
	کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ کشایش
(بقرہ ۔ ۳۷)	والا ہے، جانتا ہے،

قرآن کی اصطلاح مین دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے، یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھُل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اس وقت تک کسی کو نہین ملتا جب تک اُس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لئے اللہ تعالی نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا،

یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ	وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے،
یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ	اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اسکو
خَیْرًا کَثِیْرًا ط (بقرہ ۔ ۳۷)	بڑی دولت ملی،

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہوجائین گے اُس کا سراسر دھوکا ہے، اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اُس کے فضل وکرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے،

ایک اور آیت مین ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمایش ہے، اس آزمایش مین پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لئے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے، جس کے پاؤن اس بازی مین ٹھہر گئے، وہی بامراد ہوا، اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا،

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ	تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ
فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ	ہے، اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری
عَظِيمٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ	ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہوسکے اور
وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا	(اس کی باتون کو) سنو اور مانو، اور
لِأَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ	(راہ خدا مین) خرچ کرو، اپنے لئے
نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ	بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے
إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا	بچا لیا گیا، وہی کامیاب ہین، اگر اللہ
يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ	کو قرض دو اچھا قرض، تو وہ اس کو
شَكُورٌ حَلِيمٌ	تمہارے لئے دونا کریگا، اور تمہارے گناہ
	معاف فرمائیگا، اور اللہ نیکی کی قدر
(تغابن - ۲)	پہچانتا ہی اور برائی کا بدلہ لینے مین) ۲

ان آیتون مین انفاق اور کار خیر مین دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، تو مون کی ترقی کا مدار بہت

کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کامون مین لگاتی اور افراد مین بانٹتی رہین یعنی جماعت کے کامون اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد مین اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہین، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی، اور تمول کی برائیون سے لوگ بچے رہین گے، اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کامون کے کرنے سے ہچکچایا نہ کرین گے، اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے،

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہین،

۱- میری چیز ہے مین دوسرون کو کیون دون،

۲- دوسرون کو دونگا تو میری کمی ہو جائے گی جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہو گی،

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونون وسوسون کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے پیروؤن کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت مین میرا تیرا کسی کا نہین وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے، اور اس کی راہ مین دی جانی چاہیے،

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ مین
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ	خرچ نہین کرتے، اور آسمانون اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حدید)	زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے،

بخل کی برائی مین کہا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس مین بخل
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	کرتے ہین جس کو اللہ نے اپنے فضل
هُوَخَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَشَرٌّ	سے انھین دیا ہے کہ یہ اُن کے حق
لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْابِهٖ	مین بہتر ہے بلکہ یہ اُن کے حق مین بڑا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ	ہے قیامت کے دن اُن کے گلے مین
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط	اس کا طوق ڈالا جائے گا جس کا بخل
(آل عمران-۱۰)	کیا تھا اور آسمانون کی اور زمین کی

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک مین بیسیون جگہ یہ آیت ہے،

وَلِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَ	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانون
الْاَرْضِ ہ	مین اور زمین مین ہے،

اسی طرح بیسیون مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ	آسمانون اور زمین کی ملکیت (یا
الْاَرْضِ،	بادشاہی) اسی کی ہے،

منافقون نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کرین تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہین، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائین اللہ تعالیٰ نے منافقون کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی، اور ساتھ ہی منافقون کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہوگا، تردید کی، فرمایا،

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا	وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کے
عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ	رسول کے پاس جو لوگ ہیں، اُن پر
حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ	خرچ نہ کرو، تاکہ وہ چھوڑ کر الگ ہوجائیں[1]
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ	اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں
الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ،	کے اور زمین کے، اور لیکن منافقین
(منافقون - ۱)	سمجھتے نہیں ہیں ،

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہے، اُن کے بل بوتے سے ہے، خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے، جو چاہے وے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا،

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ	زمین کی کنجیاں پھیلا دیتا ہے روزی
وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ	جس کے لئے چاہے، اور ناپ دیتا
عَلِيْمٌ (شوریٰ - ۲)	ہے وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے،

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار، اور جذبہ شکر

---

[1] (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہوجائیں ،

کا امتحان ہے، تو دوسرے مین انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی اور جذبہ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا،

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ
رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ
رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا
ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا
(فجر)

سو آدمی جو ہے جب اس کا مالک
اُس کو جانچے، پھر اس کو عزت دے
اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ
میرے مالک نے مجھے عزت دی
اور جب اوس کو جانچے تو اس کی روزی
اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے
مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہین

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونون خدا کے کام ہین، اور مصلحت سے ہین دولتمند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی مین کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی، یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چارون طرف سمٹی آرہی ہے، مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لئے کافی ہے، مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہین، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظون مین کھینچکر اس کی غلطی بتائی ہے،

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا
ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ

سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے،
تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف سے

إِنَّمَآ أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ	ہے اس کو کوئی نعمت دین تو کہے کہ
بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ	یہ تو مجھے علم پر ملا ہے[1] (خدا فرماتا ہے) بلکہ
لَا يَعْلَمُونَ ، قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ	یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں
مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ	سمجھتے یہی بات اُن کے پہلوں نے کہی
مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ فَأَصَابَهُمْ	تھی[2]، تو اُن کو اُن کی یہ کمائی کام نہ
سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ، وَالَّذِيْنَ	آئی، اور جو کمایا تھا، اس کی بُرائیان
ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ	اُن پر پڑین، اور جو اُن مین سے گنہگار
سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ، وَمَا هُمْ	ہین، اُن پر بھی اُن کی کمائی کی بُرائیان
بِمُعْجِزِيْنَ أَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا	پڑنے والی ہین، وہ تھکا نہیں سکتے،
أَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ	کیا اُن کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی
يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ، إِنَّ فِيْ	جس کے لئے چاہتا ہے پھیلا تا ہے اور
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ،	(جس کو چاہتا ہی) ناپ کر دیتا ہی اس مین

[1] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہو کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا، دوسرا یہ ہو کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا، اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص مین قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے' (دیکھو روح المعانی جلد ۲۴ ص ۱۱ مصری)

[2] چنانچہ قارون کو جب راہ خدا مین خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی ہو تو اس نے بھی یہی کہا تھا،

قَالَ إِنَّمَآ أُوْتِيْتُهُ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص - ۸)	قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے'

ایمان والون کے لئے البتہ نشانیان ہین، (زمر - ۵)

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اُس کے لئے آسان ہوجائے، اسلام نے انسانون کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا،

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ	اور کوئی چلنے والا نہین زمین مین مگر
اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ	یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ جانتا
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ	ہے، جہان اس کو ٹھہرنا ہے (یعنی
فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝	دوزخ یا بہشت) اور جہان اس کو
	سونپا جاتا ہے، (یعنی قبر) سب (علم
(ھود - ۱)	الٰہی) کی کھلی کتاب مین موجود ہی،

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی مین سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اُسی کا حصہ تھا، اس لئے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہین، اسلام نے اپنے پیروؤن کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لئے اُن یقینیات کو مسلمانون کے ریشہ ریشہ مین رچا دینا چاہا ہی، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے، خدا تعالیٰ پوچھتا ہے،

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ	اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان
وَالْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط	سے اور زمین سے، اللہ کے ساتھ کوئی
(نمل - ۵)	اور خدا بھی ہے،

روزی دینا اسی کا کام ہے،

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝ (ذاریٰت - ۳)

بے شبہہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور مضبوط،

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح کے پُر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے، فرمایا "تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا"[1] یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کر دو گے، اور دوسروں کو نہ دو گے، تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کرے گا، اور تم کو نہیں دے گا" ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے"؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہو، فرمایا تو اُس کا مال تو وہی ہے جس کو اُس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے[2] ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی، أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہو کہ میرا مال میرا مال، اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا، اور آگے چلایا، یا کھا لیا تو اس کو فنا کر چکا، اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا،[3]

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اُحد پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے

---

[1] صحیح مسلم ۲ باب الحث علی الانفاق [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ما قدم من مالہ فہو لہ [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی الزہادة فی الدنیا، حدیث حسن صحیح،

دن تک اُس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو" پھر فرمایا "ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو"[۱]

فرمایا "رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اُس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے، تو وہ ہاتھوں سے اُس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اُس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے مطابق بتا رہا ہے، اور سکھا رہا ہے"[۲]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اُس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے، اور اس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے بڑھ گیا ہو، اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے، اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی،

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے، اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے، اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے، تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پُراثر انداز میں کھینچا ہے؟[۳]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب رقاق باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔ [۲] صحیح بخاری کتاب العلم

اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں
مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ	سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم میں سے
الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ	کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ
اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ	اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت
فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ	اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا، اور نیکوں
الصّٰلِحِيْنَ ○ (منافقون ۲)	میں ہو جاتا،

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:-

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ (منافقون ۲)	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دیگا جب
اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○	اس کا وقت آجائیگا اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو،

اس لئے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہئے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے، فرمایا "یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلان کو اتنا دو، اور فلان کو اتنا دو، حالانکہ وہ تو اب (تمھارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا"[1] فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دنیا تیرے لئے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لئے برا ہے"[2]

---

[1] صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۰۱ مصر باب بیان افضل الصدقہ [2] ایضاً باب الید العلیا،

عِفّت وپاکبازی

عفت وپاکبازی اُن ساری اخلاقی خوبیون کی جان ہے جن کا لگاؤ عزت اور آبرو سے ہے، اسی لئے اسلام نے اس کو اُن اخلاقی محاسن مین گنایا ہے، جو مسلمانون کے چہرہ کا نور ہین، چنانچہ سورۂ مومنون مین مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہین، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے،

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ
حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ
اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ
غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰی
وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ
الْعٰدُوْنَ ہ (مومنون - ۱)

اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہون
کی پاسبانی کرتے ہین، مگر اپنی بیبیون
یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیون) سے
تو اُن پر کچھ الزام نہین، لیکن جو اس کے
علاوہ کے طلبگار ہون، تو وہی لوگ حد
سے باہر نکلے ہوئے ہین،

سورۂ معارج میں مسلمانون کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، اُن مین ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ، (معارج۔۱)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہین،

جن مسلمانون کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے، ان مین وہ بھی ہین جو عفیف اور پاکدامن ہین،

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب۔۵)

اور اپنی شرمگاہون کی پاسبانی کرنیوالے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتین،

ان دونون آیتون سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظِ فروج" ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہین، اور فروج اپنے معنی مین ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہین، جو شرم کے قابل لفظون سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم مین بالکل بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزون کے درمیان خلا کے ہین، اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہین جدھر سے دشمنون کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانون کے اعضا مین سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونون پاؤن کے بیچ مین ہے اور جدھر سے دشمنون کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظون کے اندر پوشیدہ ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے،

عفت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ احصان ہو جو حصن سے بنا ہے جس کے

معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حِصَانٌ، اِحْصَانٌ، مُحْصِنٌ اور مُحْصَنٌ، الفاظ بنائے گئے ہیں، پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا، مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیغہ میں،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم-۲)	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِيْٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا، (انبیاء-۲)	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی،

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اُس کو اپنے نکاح میں لاکر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آکر بدکاری کریں تو اُن کی سزا کیا ہے، فرمایا،

فَإِذَآ أُحْصِنَّ ۔ (نساء-۴)	تو جب وہ نکاح کے قید میں آچکیں

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے،

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ ط (نساء-۴)	حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ط — حفاظت مین آنے والیان نہ مستی نکالنے والیان،

(نساء-۴)

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید مین لایا جائے صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہین، اسی لئے قرآن پاک مین اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت مین رکھی ہوئی بی بیان) دو معنون مین آیا ہے، ایک بیاہی عورتون کے معنی مین، جیسے

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ، — اور بیاہی عورتین (یعنی جو عورتین کسی کے نکاح مین ہین، وہ دوسرے مرد پر حرام ہین)

(نساء-۴)

دوسرے شریف آزاد بی بیون کے معنی مین جیسے

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا — اور جس کو تم مین سے مسلمان شریف
اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ — و آزاد بیویون کے نکاح کا مقدور
(نساء-۴) — نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتون کی عصمت کے بیان مین قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے،

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ (نساء-۶) — پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیان،

یعنی اپنے شوہرون کی غیر حاضری مین اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہین،

اسلام مین عفت اور پاکبازی کا وہ رُتبہ ہے کہ وہ نبوت ورسالت کا لازمی جزء ہے، نبی، نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہلِ بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے، حضرت عیسیٰ کی مان حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا، قرآن نے اس کی تردید کی، اور اُن کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی، اور دو موقعون پر اس شہادت کی تصریح کی،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم-۲)	شرمگاہ کو محفوظ رکھا،
وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ
فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا	کو محفوظ رکھا، تو ہم نے اس میں
(انبیاء-۶)	اپنی روح پھونکی،

حضرت یوسفؑ نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی،

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ	اور مین نے اس کو اس سے چاہا تو
فَاسْتَعْصَمَ (یوسف-۴)	وہ بچا رہا،

خدا نے فرمایا مین نے ایسا اس لئے کیا،

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ	تاکہ ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی
الْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا	کو دور کرین، وہ بے شبہہ ہمارے

الْمُخْلَصِيْنَ۔ (یوسف ۳) چنے ہندون مین تھا،

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتون سے پاک رکھے جاتے ہین،

حضرت یحییٰ کی تعریف مین فرمایا گیا،

وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ	اور سردار ہوگا، اور اپنی قوت شہوانی
الصّٰلِحِیْنَ ۝ (آل عمران ۴)	پر ضبط رکھتا ہوگا، اور نبی ہوگا صالحون

اسلام مین اہلِ بیتِ نبوی کی زندگی جس عفت، عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظون مین دی،

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا	یہ لوگ تہمت سے پاک ہین، ان کے
یَقُوْلُوْنَ ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ	لئے بخشایش ہے اور عزت والی
رِزْقٌ كَرِیْمٌ۔ (نور ۳)	روزی،

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان مین فاحشہ[۱] آیا ہے جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہین، جیسے،

اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ (نساء ۳)	مگر یہ کہ وہ عورتین کھلی برائی کرین
وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ	اور تمھاری عورتون مین سے جو

[۱] اس کا یہ منشا نہین ہے کہ قرآن مین ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی مین آیا ہے، بلکہ وہ لغت کے رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے،

وَسَاءَ كُمْ	کھلی برائی کریں،

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے،

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل ۴)	اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بیشک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے،

نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے، وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ تم زنا نہ کرنا بلکہ یہ کہا کہ تم زنا کے قریب نہ جانا، اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گذرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے، اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بیحیائی کے ارادہ سے دیکھنا تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا، یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی غیرت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے،

اسی لئے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا، مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں،

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

(نور ۳-۴)

اے پیغمبر ایمان والون سے کہدے کہ وہ ذرا اپنی آنکھین نیچی رکھین، اور اپنے ستر کی حفاظت کرین، یہ اُن کے لئے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہین،

عورتون کی ذراسی بے باکی بھی مردون کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لئے اُن پر شرافت کی چند پابندیان عائد کی گئین، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہین نیچی رکھین، غیرون کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائین، اپنے زیورون کی جھنکار کسی کو نہ سنائین، اسی لئے زمین پر ہولے چلین یا جھنکار کے زیور نہ پہنین، سینہ کا پردہ رکھین، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے مین خوشبو نہ ملین، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلین، مرد اور عورت راستہ مین باتین نہ کرین، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھین، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی مین نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتین درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہین، فرمایا،

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا

اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیون سے کہدے کہ اپنی آنکھین ذرا نیچی رکھین اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کرین اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائین

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (نور-۴)

مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے[۱] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں، اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے، یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں یا بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا اپنی عورتوں[۲] یا اپنی لونڈیوں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں، یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے ستر کے بھید سے ابھی آگاہ نہیں، اور مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو چھپائے ہیں، اس کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانو خدا کے آگے توبہ کرو

۲۰۰

اور حسب ذیل ادب، گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے، مگر عام عورتوں کیلئے

---

[۱] جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی، یا انگلیوں کی انگوٹھی، اسی لئے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں [۲] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے، (روح المعانی)۔

اس مین پیروی کا نمونہ ہے،

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ	اے پیغمبر کی بیویو! تم نہین ہو جیسی ہر
مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا	کوئی عورت، اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ	سو تم دب کر بات نہ کرو کہ جس کے
فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا	دل مین روگ ہے، وہ خواہش کرے
مَّعْرُوْفًا، وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ	اور نیک بات کہو، اور اپنے گھرون
وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ	مین وقار سے رہو، اور جیسے نادانی
الْاُوْلٰی،	کے پہلے زمانہ مین دستور تھا، ویسے
(احزاب ۔ ۴)	بناؤ سنگار کرکے دکھاتی نہ پھرو

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! نبی کے گھرون مین
بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ	اس کے بدون کہ تم کو اجازت دیجائے
لَکُمْ، الآیۃ (احزاب ۔ ۷)	(کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہو

گو یہ حکم یہان خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرون کے ساتھ خاص نہین، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ مین سورۂ نور مین اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھرون کی نسبت بھی ہے،

۱؎ یعنی تم سے جرات کرکے تمھارا خواہان ہو ۲؎ التبرج اظہار الزینۃ للناس الاجانب (لسان العرب)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا	اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے
بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا	سوا دوسرے گھرون مین نہ جایا کرو،
وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ	جب تک خبر نہ کرلو، اور اُن گھروالون
خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ،	کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمھارے
(نور - ۴)	حق مین شاید تم یاد رکھو،

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے، تو چاہیئے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہین کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے، چنانچہ کاشانۂ نبوی کے تعلق سے حکم ہوتا ہے،

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا	اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویون سے
فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ	کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ
ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ	کے اوٹ سے، اس مین تمھارے
وَقُلُوبِهِنَّ ط (احزاب - ۷)	اور اُن کے دلون کی بڑی ستھرائی ہے،

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے، مگر اس مین عام مسلمان گھرون کے لئے بھی حسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے،

مسلمان عورتین جب گھر سے باہر نکلین تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لین، تاکہ اُن کی زیبائش و آرایش کا ہر نقش اوچھلتو کی آنکھون سے اوجھل رہے، اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیان ہین، اُن کو چھیڑنا تو کجا اُن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے، فرمایا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ	اے نبی! اپنی بیویون اور اپنی بیٹیون

وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ
يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ
ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا
يُؤْذَيْنَ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ۔ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ
وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ
لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ
فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا،

(احزاب ـ ۸)

اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدے
کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں
نیچی لٹکالیں، اس سے یہ ہوگا کہ وہ
پہچان پڑیں گی، (کہ یہ شریف ہیں)
تو اُن کو ستایا نہ جائے، اللہ بخشنے والا
مہربان ہے، اگر اس پر بھی منافق، اور
جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ
ہے، اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے
نہ رکے، تو ہم تجھے اُن پر بھڑکائیں گے
پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر
میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن،

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں، چھیڑتے تھے اور جب انھیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا، تو کہتے تھے، کہ ہم اُن کو لونڈی سمجھے تھے اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے، شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انھیں کافی سزا دی جائے، بلکہ اُن کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے، اور مسلمان بی بیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے

گھرون سے باہر نکلین تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہون اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتون سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھین، اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگین تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لین جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور، اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائین، اور دیکھنے والون کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانون کی بی بیان ہین جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے،

عرب مین اسلام سے پہلے لونڈیون سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1]، اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے، اور اس کو عیب نہین سمجھتے تھے، مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیون کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ مین وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے عورتین بناؤ سنگار کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھین سینون کی پوشش کا لحاظ نہین کرتی تھین، بدکار عورتین شراب کی محفل مین ساقی گری کرتی تھین، اور گریبان کھلا رکھتی تھین[2] کہ جو چاہے دست درازی کر سکے، ہر نشان کے لئے اپنے گھرون پر جھنڈیان لگاتی تھین، اسلام نے اگر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ اس پر یہ آیت اتری،

---

[1] تفسیر سورۂ طبری، تفسیر سورۂ نور صفحہ ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر [2] سبعہ معلقہ مین طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھیے:- رحیب قطاب الجیب منہا رقیقۃ بجس الندامی بضۃ المتجرد

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ	اور تمھاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی
اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا	ہو کر رہنا چاہیں، تو اُن سے دنیا کی زندگی
عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَنْ	کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی بدکاری
يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ	نہ کرایا کرو، اور جو اُن کو اس پر مجبور کریگا
اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	تو اُن کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا اور رحم
(نور-۴)	فرمانے والا ہے،

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے[1]، اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے، کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی ہیں، ابی داود (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی، وحی الٰہی نے اُن کی اس درخواست کا یہ جواب دیا،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ	بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرکہ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ	عورت سے نکاح کرے گا، اور بدکار
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ	عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (نور-۱)	کریگا، ایمان والوں پر یہ حرام ٹھرایا گیا ہے

[1] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ،

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کیلئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے، اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا،

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ	گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے
لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ	ہوتی ہیں، اور گندے مرد گندی عورتوں
وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ،	کے لئے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کیلئے
(نور-۳)	اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے،

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں، بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے[1] جائز نہیں، اور ان کی دلیل سورۂ نور

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے، اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں، یا انکحوا الایامیٰ منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء سے منسوخ ہے، یا مخصوص ہے لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے، بلکہ اگر زن وشو میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو، تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا، ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن وشو میں کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے، اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے، جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے، (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی وتفسیرات احمدیہ ملاجیون وتفسیر کبیر رازی، و روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ)

کی اوپر والی آیت کے علاوہ اُس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، اور ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہوا اس کی سزا اس کو دی گئی ہو، اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے۔[1]

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے، اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے، چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، اُن کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں: جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور جو بدکاری نہیں کرتے، فرمایا۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ	اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور خدا
إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي	کو نہیں پکارتے، اور کسی ایسی جان کا
حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ	جس کو خدا نے منع کیا ہے، خون نہیں بہاتے،
(فرقان - ۶)	اور بدکاری نہیں کرتے،

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے، جس کا انکار سراسر کفر ہے، اس کے بعد جو دو باتیں ہیں، اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزت و آبرو سے،

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنیٰ

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح،

(بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحین ہین، اُن کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ مین بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب سے معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہین[1]، حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑون مین سامنے آئین، تو فرمایا کہ اے اسماءؓ جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیون کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہین[2]، حکم دیا کہ مخنث زنان خانون مین نہ جانے پائین[3]، فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اُس کے اہلِ خانہ کی بے ستری ہو[4]، فرمایا کہ عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے[5]، سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والون مین تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے[6] تاکہ مردون کی بھیڑ بھاڑ اور دھکون سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی مین اکیلا نہ جائے[7] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہون، یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو، اور کوئی اندر گھس گیا تو اُس کی ذمہ داری خود گھر والون پر ہے[8]؛

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی نظرۃ الفجاءۃ [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأۃ زینتہا، [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت [5] ابوداؤد کتاب الترجل باب فی المرأۃ تتطیب للخروج [6] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [7] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیہا [8] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت

یہ ساری ہدایتین اسی لئے دی گئی ہین کہ مسلمان گھرون کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو،

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتون پر بس نہین کی، بلکہ اُن کے لئے جو سوسائٹی کی عزت وحرمت کو خطرہ مین ڈالین، شرعی ثبوت کے بعد دنیا مین قانونی سزا بھی مقرر کی تاکہ اُس کا خوف لوگون کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے،

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا	بدکاری کرنے والی عورت، اور بدکاری
كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ	کرنے والے مردان مین سے ہر ایک کو سو
(نور - ۱)	کوڑے لگاؤ،

احادیث مین بیاہے[۱] مردون اور عورتون مین سے جو بدکاری مین پکڑا ئین اُن کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے، اس جرم مین عورتون کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے، اس لئے قرآنِ پاک مین ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتون سے جن باتون پر بیعت لیجائے، اُن مین ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت وآبرو کی پوری حفاظت کرین گی، فرمایا،

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ	اور وہ بدکاری نہ کرین گی، اور نہ اپنی اولاد
وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ	کو مار ڈالا کرین گی، اور نہ اپنے ہاتھون اور
أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ (ممتحنہ - ۲)	پاؤن کے بیچ مین بہتان باندھ کر لایا کرینگی،

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے

[۱] یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی،

عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو[۱] یا یہ بات بھی عدمِ قتل کے عموم میں داخل ہو، اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھیں، اس لئے ان سے باز رکھا گیا، اور خاص طور سے اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپ نے قریشی بیویوں سے،[۲] اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا،[۳] بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا، اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر بیعت کی،[۴]

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے، اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسّی کوڑے مارے جائیں گے، اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی، اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے۔ اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے، ورنہ عورت قسم کھائے کہ

۱؎ مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گذرا ہے، ۲؎ صحیح بخاری فتح مکہ ۳؎ تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ ۴؎ صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان،

یہ الزام غلط ہے۔ اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں، تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[۱]،

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہی اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے، اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے، وہ کسی کی عفت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ، حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا، بولے اس کے بعد؟ فرمایا یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گا، بولے اس کے بعد، فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی[۲]،

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	معبود کو نہ پکاریں، اور ناحق (ناروا)
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا	کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس
يَزْنُوْنَ ۝	کو خدا نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا
(فرقان - ۶)	کے مرتکب ہوں،

---

[۱] اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے کہ اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے بخاری باب اللعان [۲] بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ،

حدیث مین اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دونون جرم اپنی نوعیت مین بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہین، کہ جن سے یہ امید نہین ہوسکتی، اُن سے یہ فعل ظہور مین آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا،

ایک حدیث مین ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھون کے سامنے لوٹتا ہے، تو مسلمان نہین رہتا"؟ کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے، اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہین کرتا، اس حالت مین ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی مین گل ہو جاتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے، اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے، تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے،

اسلام مین زانیون کی سزا بعض حالتون مین سو کوڑے مارنا، اور بعض حالتون مین سنگسار کرنا ہی، لیکن اُن کو آخرت مین جو عذاب دیا جائے گا، وہ اس سے بہت زیادہ سخت، اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگون کے اُخروی عذاب کی دردناک صورتین دکھائی گئین، اُن مین بدکارون کے عذاب کی صورت اُن کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا، جس کے اوپر کا حصہ تنگ، اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا، اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی، اور اس مین بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتین تھین، جب اس آگ کے شعلے

سلہ بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شراب الخمر،

بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اُس کے اندر سے نکل آئین گے لیکن جب آگ بجھ جاتی بھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے[1] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا،

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگون کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز مین بیان کئے گئے ہین، ایک حدیث مین ہے کہ قیامت کے دن، جب کہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، خداوند تعالیٰ سات آدمیون کو اپنے سایہ مین لے گا جن مین ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اُس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ مین خدا سے ڈرتا ہون[2]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازون کو آخرت مین حاصل ہوگا، لیکن پاکبازی کی دنیوی برکتین بھی کچھ کم نہین، ایک حدیث مین آپ نے زمانۂ قدیم کے تین آدمیون کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعۃً پانی برسنے لگا، تینون نے پانی سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار مین پناہ لی، سو اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منھ بند ہوگیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کی برکت سے خدا سے دعا کرین، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان مین پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی،

" خداوندا میرے ایک چچازاد بہن تھی، جس سے مین بڑی محبت رکھتا تھا، مین نے اس سے

---

[1] بخاری کتاب الجنائز [2] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش،

اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اُس کو سو دینار نہ دیدوں وہ راضی نہ ہوئی میں نے سو دینار کما کر جمع کیے، اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی لیکن اُس نے کہا کہ خدا سے ڈرو، میں فوراً رُک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہو کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہو تو اس پتھر کو ہٹا دے، چنانچہ وہ سرک گیا"[1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو اُن اعمال میں شمار کرتی ہے جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ،

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو، اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو، اُس کو پوری دیانت سے رتّی رتّی دیدے، اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جب اس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے،

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى	ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ	زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو
فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ	انھوں نے اُس کے اٹھانے سے انکار
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ	کیا، اور اس سے ڈرے اور انسان
كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝	نے اس کو اٹھا لیا، بے شبہہ وہ ظالم
(احزاب - ۹)	اور نادان ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں تو خائن ٹھہریں گے،

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندوں کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لئے قرآن میں اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (شعراء-۱۱)	اس پیام کو لے کر امانت والی روح اتری،
مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ (تکویر-۱)	اس کا کہا مانا جاتا ہو وہاں امانت دار ہے،

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انھوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ○ (شعراء-۱۰)	میں تمہارے لئے امانت دار قاصد ہوں،

یعنی خدا سے جو پیام مجھے ملا ہے، وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں، اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے،

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا، کیونکہ آپ اپنے کاروبار میں دیانتدار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے، وہ آپ جوں کا توں ان کو واپس کرتے تھے،

نیک عمل مسلمانون کی صفت یہ بتائی گئی،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون - ۱)

اور جو اپنی امانتون اور وعدہ کا پاس رکھتے ہین،

بعض روایتون مین ہے کہ خانۂ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی، فتح مکہ کے وقت وہ اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی، اس پر یہ آیت اُتری،

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (نساء - ۸)

بے شبہہ تم کو اللہ حکم دیتا ہو کہ امانتون کو اُن کے مالکون کے حوالہ کر دیا کرو،

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی، انھون نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے، وہ اُس وقت تک مسلمان نہین ہوئے تھے، اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہوگئے[1]، بہر حال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے، ورنہ معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اُس کا اطلاق یکسان ہوگا، اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت مین وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے، جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیف شرعی ہے[2]، اور وہ امانت بھی داخل ہو جس کا نام عدل و انصاف ہے، اور جو حاکمون کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[3]، اور وہ تمام امانتین بھی اس مین داخل ہین جن کو رعایا کے مالکون کے سپرد کرنا ضروری ہے،

[1] تفسیر کشاف زمخشری، [2] ایضاً [3] تفسیر ابن جریر طبری،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں، جیساکہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی، اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے، تو اس کے مانگنے پر یا یون بھی اس کو جون کا تون دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہو تو اسکو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے، تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے، کسی مجلس مین آپ ہون، اور کچھ باتین آپ دوسرون سے متعلق وہان سن لین، تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا، اور دوسرون تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے کسی نجی کے کام مین مشورہ مانگا، تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا، اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے، تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے، اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے، یا بے سبب سستی کرتا ہے، یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلے جاتا ہے، تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے،

قرآن پاک اور حدیثون مین ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے،

اُن مسلمانون مین جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوشخبری سنائی ہے، وہ بھی ہین،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول
عَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (مومنون - ۱)	و قرار کی پاسبانی کرتے ہین،

پھر جن مسلمانون کو جنت مین عزت کی جگہ دی جانے والی ہے ان مین بھی وہ داخل ہین،

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ	اور جو اپنی امانتون اور اپنے قول و
عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (معارج)	قرار کی پاسبانی کرتے ہین،

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی، یا سفر مین گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی،

فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ	تو جو امین بنایا گیا، اس کو چاہیے کہ
وَلْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ	اپنی امانت ادا کر دے، اور چاہیے کہ اپنے
(بقرہ ع - ۳۹)	پروردگار اللہ سے ڈرے،

یعنی لے کر مکر نہ جائے یا دینے مین حیلے حوالے نہ کرے، یا اس مین بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کرکے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزون کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے،

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ	اور اپنی امانتون مین جان بوجھ کر خیانت
تَعْلَمُوْنَ ○ (انفال - ۳)	نہ کرو،

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر مین دو لڑکیون کی بکریون کے پینے کے لئے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری اُن سے نہین مانگی، اور اُن لڑکیون مین سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ اُن کو نوکر رکھ لیجئے،

تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے،

يَاأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ، إِنَّ خَيْرَ مَنِ	اے میرے باپ، اس کو نوکر رکھ لیجیے،
اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ،	سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں،
(قصص۔ ۳)	وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو،

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اُس کو رکھا جائے اُس میں اُس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو، اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، آپ نے یہ اصول بنا کر جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اُس کی اہلیت کا ثبوت دے، اور اُس کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپ چوری بے کار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے، مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں، تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے،

حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو الگ الگ کر کے گنایا گیا ہے، اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے، امانت کے خلاف بتایا گیا ہے، اور کوئی غور ہی دیکھے، تو اخلاق کے رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں،

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے

اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ مین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتین سنی تھین، ایک کو تو آنکھون سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگون کے دلون کی جڑ مین اتری ہے، (یعنی اُن کی فطرت ہوتی ہے) پھر انھون نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنّت سے سیکھا، (یعنی فطری امانت کے جوہر مین کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت حذیفہؓ کہتے ہین کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا، اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی، اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا، اور پھر سوے گا، تو امانت چلی جائے گی، اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا، جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہین ہوتا، لوگ ایسے ہوجائین گے کہ لین دین کرین گے لیکن کوئی امانتداری نہین کرے گا اس وقت امانتداری کی مثال ایسی کمیاب ہوجائے گی، کہ لوگ مثال کے طور پر کہین گے کہ فلان قوم مین ایک امانت دار شخص ہے آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل مین رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمانداری نہ ہوگی،[1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے مین انسانون مین ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے، اور بتایا گیا ہے،

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ وکتاب الفتن والرقاق وصحیح مسلم ومسند احمد وترمذی وابن ماجہ،

آخر زمانہ مین وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جاے،

طبرانی کبیر مین ہے کہ آپ نے فرمایا جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہین، اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ مین محمّد کی جان ہے، کسی بندہ کا اُس وقت تک دین درست نہ ہوگا، جب تک اُس کی زبان درست نہ ہو، اور اس کی زبان درست نہ ہوگی، جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا، اور اس مین سے خرچ کرے گا، تو اس کو اس مین برکت نہیں دیجائے گی، اور اگر اُس مین سے خیرات کرے گا تو قبول نہین ہوگی، اور جو اس مین سے بچ رہے گا، وہ اُس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بُری چیز بُری چیز کا کفارہ نہین بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے[1]،

حدیث کی کئی کتابون مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جس مین امانت نہین، اس مین ایمان نہین"[2] اور یہ ظاہر ہے کہ کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دھوکا دے سکتا ہے،

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اُس کو چاہئے کہ اپنی راے ایمانداری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے، اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے"[3] اس لئے آپ نے فرمایا کہ مجلس مین

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۵ احیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از طبرانی اوسط وطبرانی کبیر، وابن عدی فی الکامل وبیہقی فی شعب الایمان [3] ادب المفرد بخاری باب لمستشار مؤتمن،

جو باتین ہون وہ امانت ہین یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بنا چاہیئے، الاّ یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہون، مگر تین موقعون پر کہین کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبرو ریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو، تو متعلقہ لوگون کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیئے،[1]

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میان بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتین ہوتی ہین، وہ بھی ایسے راز ہین جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے،[2] راز کے یہی معنی نہین ہین کہ جس کو کہنے والا راز کہکر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہین چاہتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کرے، اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے،[3] امانت مین خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے،[4]

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لیتا ہے، تو خدا کی مقررہ کی ہوئی شرطون کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت مین لے کر اُس کے حقوق ادا کرنے مین کمی کرتا ہے، یا اُس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

---

[1] ابوداؤد باب فی نقل الحدیث [2] ابوداؤد کتاب الادب [3] ایضاً [4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق،

امانت میں خیانت کرتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ عورتون کے باب مین خدا سے ڈرو؛ فرمایا کیونکہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت[1] مین لیا ہے؛

قیامت کی نشانیون مین آیا ہے کہ سب سے پہلے اس امت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا، اور سب سے آخر مین جو چیز رہ جائے گی، وہ نماز ہوگی، اور کتنے نمازی ہین جن کی نمازون کا کوئی حصہ خدا کے ہان نہین[2]؛ فرمایا "میری اُمت اُس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال، اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہین سمجھے گی[3] یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی؛ اس کو آمدنی اور کار خیر مین دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہین سمجھین گے، اُن کی فطری صلاحیت باقی رہے گی،

---

[1] صحیح مسلم، حجۃ الوداع [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس [3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵، از سنن سعید بن منصور،

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروّت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے، اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے، لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے، جو اس کی ذات اقدس کے لائق ہیں، مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں، اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اُس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے، تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے"[1]، ایک دفعہ تین صاحب مجلس نبویؐ میں آئے، آپ کے اردگرد

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء والصفات الٰہ آباد ص ۴۴۰۔

صحابہ کا حلقہ تھا، ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی، اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے، تیسرے صاحب چلے گئے، آپ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آکر بیٹھا، وہ خدا کی پناہ میں آیا، تو خدا نے پناہ کی جگہ دی، اور جو پیچھے جا کر بیٹھا وہ شرمایا، خدا نے بھی اس سے شرم کی، (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا، اُس نے خدا سے منھ پھیرا[1]، تو خدا نے بھی اس سے منھ پھیرا،

سورۂ بقرہ میں ہے،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا، (بقرہ ۳-۲)

خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں،

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے، وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، (احزاب ۷) خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا، حدیث میں بھی ہے، إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں[2]، قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے، اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہی، اور اسی لئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے[3]،

---

[1] بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام [2] بخاری کتاب الادب، باب الاستحیی من الحق [3] صحیح مسلم کتاب التوبۃ عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہو مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب ہو جاتے ہیں، غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی،

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر مین دو لڑکیون سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھین، تاہم یہ وصف اُن مین ایسا نمایان تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیون کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے، وہ اپنے مویشیون کو پانی نہین پلاتی تھیں، تاکہ مردون کی کشمکش سے الگ رہین، اور جب اُن کے باپ نے اُن مین سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بُلانے کے لئے بھیجا،

فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي	تو ان دو لڑکیون مین سے ایک شرماتی
عَلَى اسْتِحْيَاءٍ، (قصص-۳)	اُن کے پاس آئی،

اس آیت مین واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح وستایش بھی مقصود ہی،

یہ وصف انسان مین بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے، اور اگر اس کی مناسب تربیت کیجائے، تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہی، اور اگر بُری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگون کا ساتھ نہ رہے، تو جاتا بھی رہتا ہے، اسی لئے اسلام نے اُس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، ستر عورت کا خیال، ننگا پن بچے رکھنا، بے حیائی کی باتون کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہان تک کہ غسل خانہ اور خلوت مین بھی اسکی اجازت نہ دینا، اسی لئے ہے کہ آنکھین شرم سے جھپکتی رہین، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی، تو رفتہ رفتہ انسان بالکل بے حیا بن جائے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بچہ تھے، تو خانۂ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپ اینٹین

اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بیہوشی طاری ہوگئی، ہوش آیا تو زبانِ مبارک پر تھا میرا تہبند، حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا[1]، نبوت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں،

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ
اشد حياء من العذراء في	نشین کواری لڑکی سے بھی زیادہ
خدرها[2]،	شرمیلے تھے،

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے،

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ	تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا
فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ، (احزاب - ۷)	پہنچتی تھی، تو تم سے وہ شرماتا تھا،

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم و حیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لئے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعتِ مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے، اور وہ یہ ہے،

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکۃ و بنیانہا [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء

کہ امرِ حق کے اظہار مین شرم وحیا دامنگیر نہ ہو، لیکن دوسرون کی مروّت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے، جو ایک معنی مین تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیا ایمان سے ہے۔[1]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جزو ہے شرعی حیا ہے یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزون سے روکتی ہے، اس لئے وہ دونون ایک ہی ہین لیکن جن لوگون مین فطرۃً حیاء کا مادہ موجود ہوتا ہے، اُن کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے مین مدد ملتی ہے، اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہین، بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہان تک اظہارِ حق، وعظ وپند، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے، اور شریعت نے ان موقعون پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآن مجید میں جابجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتون کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندون کے فائدہ کی ہے تو اُس کے کہنے سے خدا نہین شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہین

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء،

چھوڑ دیتا، فرمایا،

إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی)
مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا	نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا
(بقرہ ۷-۳)	اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوت ولیمہ میں صحابہ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لئے خداوند تعالیٰ نے فرمایا،

إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ
فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللهُ لَا يَسْتَحْيِي	تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق بات کے
مِنَ الْحَقِّ ۚ (احزاب - ۷)	کہنے میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں،

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں،

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ کہتی ہیں

کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہو؟

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی، اکابر صحابہؓ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے تاہم چونکہ کمسن تھے، اس لئے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا، اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی، اس لئے جب حضرت عمرؓ سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی،[1]

انصار یہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں، اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں،

نعم النساء نساء الانصار	انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں
لم یکن یمنعھن الحیاء ان	کہ دین کا علم حاصل کرنے سے اُن کو
یتفقھن فی الدین،[2]	حیا نہیں روکتی تھی،

ان موقعوں یعنی تبلیغ، دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مالا یستحی من الحق للتفقہ فی الدین [2] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسک فی موضع الدم

اور بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کو ایک ایسا قوی جو ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحیاء لا یاتی الا بخیر[۱] — حیاء سے صرف بھلائی ہی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے، جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی روک نہیں سکتا، اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرک الناس من — لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں

کلام النبوۃ الاولیٰ اذا — پائی ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں

لم تستحی فاصنع ما شئت[۲] — شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو،

امام نووی[۳] نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے، جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو،

قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر، اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے، اسی

[۱] بخاری کتاب الادب باب الحیاء، [۲] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت [۳] فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۴۴،

بناپر حدیث شریف مین آیا ہے کہ ہر دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہی، اور اسلام کا خاص خلق حیا ہے[1]
یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخین ہین، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[2]
فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہان تک کہ تنہائی کی حالت مین بھی شرم وحیا
کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہین چاہئے، یہی وجہ ہو کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ننگے پن سے
بچو، کیونکہ تمھارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہین جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے
الگ ہو جاتے ہین، تو ان سے شرماؤ، اور ان کا خیال رکھو[3]
مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھون سے گرنے نہ پائے،

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجاء فی الحیاء [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع،

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق مین سے ہے۔ دنیا مین ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کئے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہین، اُن کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ مین رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا، جس کے دل مین اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اُس سے دوسرون کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی، اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے، اسی لئے اسلام کی اخلاقی تعلیم مین اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص نامون مین سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے، وہ رحمٰن یعنی "بڑا رحم والا" ہے، اسی کے ساتھ دوسرا نام "رحیم" آتا ہے، یعنی رحم سے بھرا ہوا، قرآن پاک مین پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے، اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے مسلمان کو حکم ہے جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے، ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے، دنیا مین جو کچھ ہے، وہ خدا کی رحمت کے جلوون کے سوا کچھ اور نہیں ہے، خدا کے فرشتے اپنی دعاؤن مین کہتے ہین،

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً   اے ہمارے پروردگار تو نے اپنی رحمت

وَعِلْمًا (مومن-۱) اور علم مین ہر چیز کو سما لیا ہی،

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، بلکہ

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (حشر-۳) وہی رحم والا مہربان ہی،

مسلمانون کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤن مین کہین،

وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ، (مومنون-۶) اور تو سب رحم کرنے والون مین سب سے بہتر رحم کرنے والا ہی،

دنیا مین رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہین وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہین، چنانچہ حدیث مین ہے کہ خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے، جن مین سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لئے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اتارا، اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہین، یہان تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچّے پر پاؤن نہین رکھتا کہ کہین اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے[1]،

بنی نوعِ انسان مین محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبرون کی ذات ہے، اور پیغمبرون مین سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے،

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ (لوگو!) تمھارے پاس تم ہی مین کے ایک رسول آئے ہین، تمھاری تکلیف

---

[1] بخاری کتاب الادب،

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ ، (توبہ - ۱۶)

ان پر شاق گذرتی ہے، (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے، اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں،

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتین ہیں، اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے،

وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً (حدید - ۴)

اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے، ان کے دلوں اور ہم نے ترس، اور رحم ڈالدیا،

اور اس وصف میں اُمتِ محمدیہ بھی ان کی شریک وسہیم ہے،

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (فتح - ۴)

اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں وہ کافرن پر زور آور ہیں، آپس میں رحم دل ہیں،

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے سارے رشتے رحمِ مادری سے پیدا ہوتے ہیں، اور رَحِم رُحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، احادیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا،

الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ[1]

رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی شاخ ہے،

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ،

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور سائی رحمدلیون کے جذبے اس کی شاخین ہین، بچون کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہین کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زانو پر مجھ کو اور دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونون زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونون پر رحم کر کیونکہ مین ان دونون پر رحم کرتا ہون[1]"

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور اُس کو لپٹانے لگا، آپنے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ "تم اس پر رحم کرتے ہو؟" اُس نے کہا "ہان" ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، "وہ سب رحم کرنے والون سے زیادہ رحم کرنے والا ہے[2]"

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن علیہ السلام کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہین، مین نے اُن مین سے کسی کا بوسہ نہین لیا، آپ نے اُن کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "جو شخص رحم نہین کرتا، اس پر رحم نہین کیا جاتا"

ایک اور بدو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچون کو چومتے ہین، لیکن ہم لوگ نہین چومتے، ارشاد ہوا کہ "خدا نے جب تمھارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے[3]"

---

[1] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ [2] ادب المفرد باب رحمۃ العیال [3] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا اُمتِ محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لئے فرمایا کہ جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے[1]۔ اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیردستوں پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے،

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" یعنی وہ لوگ آپس میں رحمدل ہیں، اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحمدلی، باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[2]، جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں، اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضا اور جوارح ہیں، اس لئے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے،

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے، وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اور اس میں تمام بنی نوعِ انسان شامل ہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے، اور فرمایا ہے کہ جو شخص

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان، [2] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم،

انسانون پر رحم نہین کرتا، خدا بھی اُس پر رحم نہین کرے گا، یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنے والون پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا، زمین والون پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا[1]،

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہین ہے بلکہ اس مین بے زبان جانور بھی شامل ہین، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا[2]، ایک شخص نے آپ کی خدمت مین عرض کی کہ مین بکری کو ذبح کرتا ہون تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کرون، آپ نے دو بار فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا[3]،

جانورون کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہوگیا تھا، اور اب بھی جاری ہے، وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا، اس لئے اسلام نے اس تفریحی شغلہ کو ناجائز کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی[4]،

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظون مین دی ہے، جو بلاغت کی جان ہین، فرمایا،

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ[5] — جو رحم نہین کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا

ان دو لفظون کی تشریح دفترون مین نہین سما سکتی، رحم دلی کا ہر منظر، اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی دو لفظون سے اُبھارا جا سکتا ہے، اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسرون

---

[1] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس [2] ادب المفرد باب رحمۃ البہائم [3] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم [5] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم،

پر رحم نہین کرتا، اس پر خدا بھی رحم نہین فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسرون پر رحم نہین کھاتا، تو دوسرے بھی اس پر رحم نہین کھائین گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح مین لکھا ہے کہ اس مین تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لئے اس مین مسلمان، کافر، مملوک اور غیر مملوک جانور سبھی داخل ہین اور انکے کھانے پینے کی نگرانی کرنا ان پر ہلکا بوجھ لادنا، اور ان کو سخت نہ مارنا یہ سب چیزین اسی رحم مین شامل ہین[1] غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری، بیکسون کی تسکین، بیمارون کی تسلی، عزیزون کی امداد، مظلومون کی حمایت، اور زیردستون کی اعانت کرتے ہین اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لئے مبارک ہین وہ جو رحم کرتے ہین کہ ان پر رحم کیا جائے گا،

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۳۶۸ مصر

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں "عدل" کہتے ہیں[1]، اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں، اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی، اور وہی کام کیا جائے، جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا پلہ بھی کچھ کم بھاری نہیں،

عدل سب سے پہلے خود اللہ کی صفت ہے، جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں، ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[2]، قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا،

[1] مفردات راغب اصفہانی [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۱۴۹، الہ آباد

وَاللّٰهُ يَقْضِیْ بِالْحَقِّ ۝ (مومن-۲) اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے،

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے،

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (احزاب-۱) اور اللہ حق بات کہتا ہے،

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں،

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا اور تیرے رب کی بات سچائی اور

وَّعَدْلًا ۝ (انعام-۱۴) انصاف کے ساتھ پوری ہوگئی،

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے،

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی

هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ اور خدا نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں

قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (اٰلِ عمران-۲) نے، وہی خدا انصاف کو لے کر کھڑا ہے،

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں عدل کی ضرورت ہے، اور نظامِ عالم محض عدل ہی کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جس

اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل وانصاف ہی کرنے کا حکم ہے فرمایا؛

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (نحل-۱۳)

بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے،

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لئے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے، جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے، اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے، پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر ان میں عدل وانصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ، (نساء ع-۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی کرنا، یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ میں ہو،

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے بھی عدل وانصاف کی ضرورت ہے، اس لئے فرمایا،

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء-۱۹)

اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف

عام معاملات مین عدل وانصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت مین وزن و پیمانہ مین ہے، اس لئے فرمایا:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ	اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری)
بِالْقِسْطِ (انعام - ۱۹)	ناپ کرو، اور (پوری پوری) تول،

قرآن مجید کی متعدد آیتون مین بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول مین بے انصافی نہ کی جائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے، جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس لئے وزن و پیمانہ مین کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے، وہ نہایت عام و وسیع ہے، اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار مین کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے، اور اس سے روح مین سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے؛

عدل وانصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات مین ہوتی ہے، اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو مین عدل وانصاف کا لحاظ رکھا ہے، تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ	اور تمھارے باہمی قرارداد کو) کوئی
بِالْعَدْلِ، (بقرہ - ۳۹)	لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے؛
فَاِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ	پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا اگر
سَفِيهًا اَوْ ضَعِيفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيعُ	وہ کم عقل ہو یا معذور یا خود اداے
اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ	مطلب نہ کرسکتا ہو، تو (جو) اس کا

بِالْعَدْلِ ۔	مختار کار (ہو وہ) انصاف کے ساتھ
(بقرہ - ۳۹)	(دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو، یا اُس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی،

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ	اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے)
كَانَ ذَا قُرْبٰى ۔	جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا)
	قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف
(انعام - ۱۹)	(کا پاس) کرو،
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	مسلمانو! خدا واسطے انصاف کیساتھ
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ	گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب)
عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ	کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں)
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۔	انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں)
	انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف
(مائدہ - ۲)	پرہیز گاری سے قریب تر ہے،

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمھاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے

اور دوسری آیت مین یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے، اور یہ کہ ہر حال مین عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے،

یہود اور نصاری اسلام کے کھلے ہوے دشمن تھے، اس پر بھی رسول اسلام علیہ السلام کی زبان مبارک سے وحی الٰہی یہ کہلواتی ہے،

اور کہدے کہ مین ہر اس کتاب کو مانتا	وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
ہون جو اللہ نے اتاری، اور مجھے (خدا	مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ
سے) یہ حکم ملا ہے کہ مین تمھارے بیچ	بَيْنَكُمْ ط اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ
مین انصاف کرون، اللہ رب ہے	لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ
ہمارا اور تمھارا، ہم کو ہمارے کامون	لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ
کا بدلہ ملنا ہے، اور تمکو تمھارے	يَجْمَعُ بَيْنَنَا ج وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ
کامون کا، ہم مین تم مین کچھ جھگڑا	
نہین اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے	(شوریٰ - ۲)

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیت پاک مین ہے، اس کے کئی پہلو ہین، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے، اس کو مین برابر برابر تم سب کو پہنچا دون، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمھارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے بلکہ وہ کیا جائے، جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے، اور تیسرا یہ کہ اب تک تم مین مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے، کہ دولتمندون اور عزت والون کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگون کے ساتھ

سختی کا قانون برتا جائے، میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام وخاص، اور امیر وغریب سب کے ساتھ یکسان اور برابری کا سلوک کیا جائے کیونکہ ہمارا تمھارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اُس کے غلام ہین، اس لئے اس کے سب غلامون کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے ہم کو ہمارے اعمال، اور تم کو تمھارے اعمال کا بدلہ ملے گا، اس مین جھگڑنے کی کوئی بات نہین، سب کو قیامت مین اُس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے جس کا کام اُس کو پسند آئے گا، اُس کو ویسا انعام ملے گا، اور اگر بُرا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی،

عدل وانصاف کی راہ مین ان دونون سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ مین بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی مین اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشادِ خداوندی ہوا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! انصاف کی حمایت
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ	مین کھڑے ہو، اللہ کے لئے گواہ ہو،
لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ	اگرچہ تمھارا اپنا اس مین نقصان ہی
وَالْأَقْرَبِينَ إِن يَكُنْ غَنِيًّا	ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ دارون کا،
أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا	اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے تو
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا	اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیرخواہ ہے تو تم

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ	انصاف کرنے مین اپنے نفس کی
کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا،	خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم
	زبان ملوگے، یا کچھ بچاؤ گے تو اللہ
(نسآء ع-۲۰)	تمھارے کام سے واقف ہے،

ان آیتون مین عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات مین عدل وانصاف کی حمایت تمھارا مقصد ہو، جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو، اور خدا واسطے کہو، عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی مین نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ مین آئے نہ عزیزون اور قرابت دارون کا، نہ دولتمند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور گواہی مین کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی مین دولتمند کی خاطر نہ کرو، اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو، جو حق ہو وہ کرو، یا کہو، پھر سچ کہنے مین کوئی توڑ مروڑ نہ کرو، کہ سننے والا شبہہ مین پڑ جائے، یا پوری بات نہ کہو، کچھ چھپا لو، تو یہ سب باتین عدل وانصاف کے خلاف ہین، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ مین رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے، فیصلہ مین ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ مین کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے،

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرف دارانہ گواہی دیتا ہے، وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا، اس لئے نہ گواہوں کو اس لئے طرفداری کرنی چاہئے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہئے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہئے کہ وہی اُن کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھکر ولی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لئے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو اس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ... اُن کی بھلائی ہے، غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کیلئے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لئے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے، کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کرکے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں

صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے، جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے،

اسی لئے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں،

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا	اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں
فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ	کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ،
وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرۃ ۔ ۲۳)	تم جانتے ہو،

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے،[1]

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لئے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے، اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو، اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا،

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس

[1] تفسیر روح المعانی،

اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ، (الحجرات - ۱)

میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، پھر اگر ان میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہو اس سے تم (بھی) لڑو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کو ملحوظ رکھو، بیشک اللہ انصاف کرنیوالوں کو محبوب رکھتا ہے،

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لئے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کیلئے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لئے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو، ارشاد ہوا،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ، (نساء - ۸)

بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ، اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو،

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ اور

منصفانہ حق ہے، جو ایک کا دوسرے پر چاہیے، خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے اور فیصلہ دوست و دشمن، کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل و انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا،

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ	اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے
بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	ساتھ فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ انصاف
(مائدہ - ۶)	کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ خود خدا اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے،

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے، یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لئے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوت نطق سے محروم نہ ہو، صاحب علم ہو، چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ	اور خدا ایک دوسری مثال دیتا ہے
اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى	کہ دو آدمی ہیں، ان میں کا ایک
شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ	گونگا اور گونگا ہونے کے علاوہ بڑا

أَيْنَمَا يُوَجِّهْهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ
هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ
بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيمٍ ۝
(النحل - ۱۰۰)

غلام کہ خود) کچھ نہیں کر سکتا، اور گونگے
ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا بار
خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے
اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا کیا
ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر
ہو سکتے ہیں، جو (لوگوں کو) عدل و
انصاف کی تاکید کرتا ہے، اور وہ خود

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے، اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیے، ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا، اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوِ مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوِ مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا، اور عالم ہونا چاہیے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے، اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت، قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے، تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے، پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحبِ قدرت ہونا چاہیے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اس لئے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے،

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی

شعبہ ایسا نہین ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو،

ان آیات کے رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے تاہم امام و حاکمِ وقت کے لئے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لئے حدیث مین امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا، سات شخصون کو خدا اپنے سایہ مین لے گا جن مین ایک شخص امام عادل ہوگا"[1]

[1] بخاری کتاب المحاربین، باب فضل من ترک الفواحش،

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کر لیا جائے اُس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آل عمران اورعد) بے شبہہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ الْمِیْعَادَ، (زمر-۲) اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ، (آلِ عمران-۲۰) (اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَعْدَ اللّٰہِ ط لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ، (روم-۱) اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا،

وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ (حج-۶) اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ،

فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَہْدَہٗ، (بقرہ-۹) تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا،

وَمَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ (توبہ-۱۴) اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں، اور جو قول و قرار کریں اُس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رُخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے، مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول و قرار کرے، اُس کا پابند نہ رہے،

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی اُن تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے، اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی، اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے، اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے، ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے،

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا، (بقرہ ۲۲)	اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے،

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ (مومنون)	اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس لحاظ رکھتے ہیں،

ایک دوسرے سورہ میں جن سچے مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اُس تصویر

کا ایک رُخ یہ ہے،

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ (معارج-۱)

اور وہ جو اپنی امانتون کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہین،

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم وکاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے، جو عہد کے وسیع معنیٰ مین داخل ہے، اس لئے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا، اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانون کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا، اس کے برعکس ایک آیت مین پہلے عہد کی عام پابندی کا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا،

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۝ وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ۝

(بنی اسرائیل-۴)

اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت مین) عہد کی باز پرس ہوگی، اور جب ناپ کرو، تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریقہ) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے،

قانون یا رسم ورواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لئے تاکیداً پابندی عہد

کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کیلئے زبانی قول وقرار کی ضرورت نہین، بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول و قرار ہین،

تمام عہدون مین سب سے پہلے انسان پر اُس عہد کو پورا کرنا واجب ہے، جو خدا اور اس کے بندون کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے، جو روزِ الست کو بندون نے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا اُن کی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے، جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت مین کیا گیا ہے، اور تیسرا وہ عہد ہے، جو عام طور سے قول وقرار کی شکل مین بندون مین آپس مین ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے، اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے،

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ، (رعد - ۳)	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہین، اور اپنے اقرار کو نہین توڑتے، اور جو خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُن کو جوڑے رکھتے ہین،

اس آیت مین پہلے اس فطری عہد کے ایفا کا ذکر ہے، جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اُس قول وقرار کا جو باہم انسانون مین ہوا کرتا ہے، اس کے بعد اس فطری

عہد کا ہے، جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے،

سورہ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاظر و ناظر بتا کر یا خدا کی قسمین کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا،

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا	اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں
عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا	ایک دوسرے سے قرار کرو تو اس
الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا	کو پورا کرو، اور قسمون کو پکی کر کے
وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ	توڑا نہ کرو، اور اللہ کو تم نے اپنے پر
كَفِيْلًا، (نحل-۱۳)	ضامن ٹھرایا ہے،

اس معاہدہ کے عموم میں صحابۂ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں، جو اسلام لاتے وقت انھون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے، اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کئے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں، جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمین کھا کر آج بھی مسلمان ایک دوسرے سے کرین،

سورہ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے فرمایا،

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ	اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اُس نے
وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ،	تم کو نصیحت کر دی ہے تاکہ تم دھیان
(انعام- ۱۹)	رکھو،

اس عہدِ الٰہی مین خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہین جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے، یا خدا نے تم سے لیا ہو، اسی طرح اُس نذر اور منت کو شامل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے، اور انسانون کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے، جو خدا کی قسمین کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہین،

صلحِ حدیبیہ مین مسلمانون نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی، اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی، اس حالت مین اس معاہدہ کا توڑ دینا کیا مشکل تھا، مگر یہی وہ وقت ہے، جس مین مسلمانون کے مذہبی اخلاق کی آزمایش کی جاسکتی تھی، کہ اپنی قوت اور دشمنون کی کمزوری کے باوجود وہ کہان تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہین، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی، اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال مین اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی، اور مکہ فتح بھی ہوچکا تھا، پھر یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینون کی مہلت دو،

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ	اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے
اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ	اُن مشرکون کو پورا جواب ہے، جن
الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ	سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا	(تم اے مشرکو!) ملک مین چار مہینے

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ (توبہ ۱۰) اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے،

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکون اور مسلمانون کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہین رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکون کے ساتھ ایفاے عہد کی تاکید کی گئی جنھون نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا، فرمایا!

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ، (توبہ ۱)

مگر جن مشرکون سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انھون نے تم سے کچھ کمی نہین کی، اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی تو اُن سے اُن کے عہد کو اُن کی مقررہ مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ کو خوش آتے ہین تقوی والے،

اور ان مشرکون کے ساتھ اس ایفاے عہد کو اللہ تعالی تقوی بتاتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کرین اُن کو متقی فرمایا، اور اُن سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا، آگے بڑھ کر اُن مُشرکون سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھون نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، اللہ تعالی مسلمانون کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش مین ان عہد شکن مشرکون کیساتھ اُن مُشرکون کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے، جنھون نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے،

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ

مشرکون کو کیسے اللہ کے پاس اور اُسکے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ	جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوْا	معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے
لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ	رہیں تم اُن سے سیدھے رہو، بیشک
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۲)	اللہ کو تقوی والے خوش آتے ہیں۔

"سیدھے رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو، اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں، ان کا شمار تقوی والوں میں ہے، جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے، اور تقوی والے اللہ تعالی کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا، اللہ تعالی کی خوشی اور پیار کا موجب ہے، اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے،

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے،

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا	مسلمانو! (اپنے) قراردوں کو
بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۱-۱)	پورا کرو،

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں، اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے، اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :-

"اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ" خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اور اس قول مین تمام عقد مثلاً عقدِ بیع، عقدِ شرکت، عقدِ یمین، عقدِ نذر، عقدِ صلح، اور عقدِ نکاح داخل ہین، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانون کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونون پر اس کا پورا کرنا واجب ہے[1]"

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا، صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہان تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے حسنِ عہد مین داخل ہے، صحیح بخاری مین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہین آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر اُن کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کیا کرتے تھے، اور بکری ذبح کرتے تھے، تو اُس کا گوشت اُن کی سہیلیون کے پاس ہدیۃً بھیجا کرتے تھے[2]" یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی سہیلیون کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا. جو اُن کی زندگی مین جاری تھا، امام بخاری نے کتاب الادب مین ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "حسن العهد من الایمان" اور اس باب کے تحت مین اسی حدیث کا ذکر کیا ہے،

حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین حکم دیا ہے، بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۰۵ [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العہد من الایمان،

ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپ نے اُس سے کہا کہ تم کیسی رہیں تمہارا کیا حال ہے ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اُس نے کہا کہ اچھا حال رہا جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے۔ یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے، اور حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے،

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَہٗ (احمد طبرانی وابن حبان) جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں

یعنی اُس قول وقرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے، یا بندہ بندہ سے کرتا ہے پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے،

احسان

یعنی

بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اور اس لئے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو، اور اس کو آرام پہنچے،

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حد و پایان نہیں، عرش سے فرش تک جو کچھ ہے، وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے،

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ	اور اگر اللہ کے احسان گنو، تو ان کو
لَا تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ	پورا نہ گن سکو گے، بیشک انسان
لَظَلُومٌ كَفَّارٌ، (ابراہیم-۵)	بے انصاف ناشکرا ہے،

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان کا شکر کہ اس نے کسی سی

وسفارش کے بغیر اُن کو قید خانہ سے نجات دی، اور وہ اُن کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا، ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ، (یوسف - ۱۱)

اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا،

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے فرمایا:-

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ ۝ (قصص) تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا،

(حاشیہ ص ۴۷۶) لہ اس موقع پر ایک بات خیال میں رہے، عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں، اُردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں، عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے، تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں اِلیٰ یا ب کے صلہ کے ساتھ ہوگا، قرآن پاک میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ یا مُحْسِنِیْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں، اُن سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لئے جائیں گے، اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، (توبہ - ۱۵)

بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا،

لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (زمر - ۶)

کاش اگر میرے لئے لوٹ کر جانا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (اٰل عمران - ۱۴)

اور اللہ احسان کرنے والوں کو

اس دنیا مین جہان قدم قدم پر اُولا بدلا اور داد وستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے، احسان، حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے، اور قرآن مجید مین جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل مین حکم کی صورت مین ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	اللہ انصاف اور لوگون کے ساتھ
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی،	احسان کرنے کا اور قرابت والون
(نحل - ۱۳)	کو دینے کا حکم دیتا ہے،

انصاف تو کسی کی تکلیف وآرام اور رنج وراحت کی پروا نہین کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے لیکن احسان مین اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی خاص اور متداول صورت یعنی قرابت دارون کی مالی امداد کا ذکر کیا لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہین، بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہین، اور عام لوگون کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر، اور لونڈی غلام اُس کے سب سے زیادہ مستحق ہین، اس لئے خداوند تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت مین (رکوع - ۵) ان لوگون کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے، اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتون مین تاکید کی ہے، (بقرہ - ۹، زخرف - ۷، انعام ۱۲، اسرائیل - ۳،

بہرحال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے، لیکن جن کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے، اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے، اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ	اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان
(قصص-۸)	کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں،

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ	اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور
مِنَ السِّجْنِ،	بھی بڑے بڑے) احسان کئے ہیں کہ
(یوسف-۱۱)	(بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا،

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی سیکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں، جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا جس سے روکا گیا، اور فرمایا گیا کہ کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کردو فرمایا،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ
(بقرہ ع - ۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا
وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں (جو) دو دفعہ
(کر کے دی جائیں) پھر (ان دو طلاقوں
کے بعد) یا تو دستور کے مطابق زوجیت
میں (رکھنا ہے) یا حسنِ سلوک کیساتھ

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو، اور اس کی ادائی میں لیت و لعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو، فرمایا،

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ
فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ
اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ،
(بقرہ ع - ۲۲)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب
قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف
کر دیا جائے، تو (جان کے بدلے خونبہا
وارثِ مقتول کی طرف سے اس کا)
مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق
اور (قاتل کی طرف سے) وارثِ مقتول
کو خوش معاملگی کے ساتھ (خونبہا کا)

قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا، اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے
اللہ تعالی نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے
محبوب بندوں میں ہوں گے،

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ، — اور اللہ ان محسنون (یا نیکی کرنیوالون) کو پیار کرتا ہے،

(آلِ عمران۔۱۴)

احسان کے لئے قرآن کا ایک اور لفظ فَضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کئے بغیر اس کو طلاق دے دے، تو شوہر پر نصف[1] مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا، مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے، اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حُسنِ خُلق ہے، اور یا شوہر پورا ادا کر دے، اور آدھا کاٹے نہیں، تو یہ مرد کا حُسنِ خلق ہے،

اس کے بعد ارشاد ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ — اور آپس[2] مین فضل کو مت بھولو،

اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ، — بے شک، اللہ تمھارے کامون کو دیکھ رہا ہے،

(بقرہ۔۳۱)

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے، تو بھی احسان والون کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں، اور اپنے احسان[3] باز نہ آئین، فرمایا،

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ — اور تم مین جو احسان اور کشایش والے

---

[1] یعنی جس حالت مین کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہین [2] سعید سے روایت ہے "آپس مین فضل کو مت بھولو" یعنی احسان کو مت بھولو"، ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکورہ، بعضون نے یہان "فضل" سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل سے مالی مراد لیا ہے،

مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْآ	ہیں، وہ قرابت دارون، غریبون
اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِيْنَ	اور خدا کی راہ مین ہجرت کرنے والون
وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کو نہ دینے کی قسم نہ کھالین اُن کو چاہیے
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا (نور-۳)	کہ معاف کرین اور درگذر کرین،

احسان کے اسی وسیع معنی مین اسلام نے ایک اور جامع لفظ "معروف" کا استعمال کیا ہی یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف مین داخل ہی قرآن کا حکم ہے کہ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (اعراف-۲۴) اور نیکی کرنے کو کہہ، اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہی کہ

کُلّ معروف صدقۃ	ہر نیکی ثواب کا کام ہی،

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے کہ جس کے لئے غریب و امیر کی تخصیص نہین، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پہ صدقہ فرض ہے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا "کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ "اگر اُس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے" فرمایا! غریب حاجتمند کی اعانت کرے" صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا "نیکی کے کرنے کا حکم دے" صحابہ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرسکے، ارشاد ہوا کہ "بُرائی سے باز رہے کیونکہ یہ اُس کے لئے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث مین آیا ہے کہ "آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے، وہ صدقہ ہے کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا

بھی اسی مین داخل ہے[1]۔

اسی معنی مین قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بِرّ" کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرے مین کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے،

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	جو لوگ تم سے دین کے بارے مین
لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ	نہین لڑے، اور انھون نے تم کو تمھارے
لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	گھرون سے نہین نکالا، اُن کے ساتھ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ	احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ،	سے تو خدا تم کو منع کرتا نہین (کیونکہ)
(ممتحنہ-۲)	اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والون کو دوست

صحابہ مین کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلمون پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہین سمجھتے تھے، اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمھارا نہین، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی، اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا، ارشاد ہوا،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ	تیرا ذمہ نہین ان کو راہ پر لے آنا، لیکن
اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا	اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ	اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ مع فتح الباری ۔ ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ ۴۔ ۳۷)	واسطے اور تم نہین دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر، اور جو دوگے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی، اور تمھارا حق مارا نہ جائے گا،

گویہ احسان کی ایک خاص صورت ہے، مگراس کی وسعت مین ساری دنیا سما گئی

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب وعذاب کا دار مدار ہے، جو نیک کام کرین گے اُن کو خدا کے ہان سے نیک ہی جزا ملے گی ارشاد ہوا

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ، (رحمان ۳۔)	بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی،

گویہ آیتِ پاک اپنے سباق کے لحاظ سے آخرت مین نیک کامون کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظون کے لحاظ سے اُس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونون کو شامل ہے،

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے قرضدارون پر احسان کرنا، ضرورت مندون کو قرض دینا اور تنگدست مقروضون کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہون، اُن کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے،

عرب مین سود خواری نے لوگون کو اس قدر بے رحم اور سنگدل بنا دیا تھا کہ جو لوگ

قرض نہین ادا کر سکتے تھے، وہ غلامون کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے، اور جو قیمت ملتی تھی، اُس سے اُن کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدّن کے زمانہ مین قرض کی زنجیر مقروضون کے لئے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے،

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ	اور اگر (کوئی تنگدست (تمھارا
اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا	مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت
خَيْرٌ لَّكُمْ	(دو) اور اگر سمجھو تو تمھارے حق مین
	یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرض
(بقرہ - ۳۸)	بھی) بخش دو،

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مین خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرمایا کہ قیامت کے دن مین خود تین آدمیون کا فریق ہون گا جن مین ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی[1] اس کو اور بھی موکد کر دیا، اور قرض کے معاملہ مین تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتین بتائین یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری،

یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہوسکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف مین ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہین کرتا تھا، لوگون کو قرض دیتا تھا، اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازمون سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو، شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ مین اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث مین ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتون نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہین، فرشتون نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ مین لوگون کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے مین مین آسانی کرتا تھا، اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا، اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا،[۱]

اس قسم کی بہت سی روایتین ہین، ایک حدیث مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے، یا اس کا قرض معاف کردے،[۲] یہی روایت مسند ابن حنبل مین ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کردے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ مین ہوگا،[۳]

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسرون کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی مین محدود نہین کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی راہ مین وسیع کردیا ہے، زندگی تو زندگی

---

[۱] بخاری کتاب البیوع باب من انظر معسرا، باب من انظر موسرا و صحیح مسلم باب فضل انظار المعسر [۲] مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر، [۳] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۰۰

موت مین بھی اُس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہین کیا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمھین کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اُس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔"[1]

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے، اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہئے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! مین کسی شخص کے پاس سے گذرتا ہون تو وہ میری مہمانی نہین کرتا تو کیا جب اُس کا گذر مجھ پر ہو تو مین بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دون؟ فرمایا نہین تم اُس کی مہمانی کرو،[2]

ایک موقع پر ارشاد ہوا، "ایسے نہ ہو کہ خود تمھاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسرون کی دیکھا دیکھی کام کرو، کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کرین گے تو ہم بھی احسان کرین گے اور اگر وہ ظلم کرین تو ہم بھی کرین گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کرین تو تم احسان کرو ہی گے، اور اگر وہ برائی بھی کرین تو تم ظلم نہ کرو"[3]

لوگ احسان کو غلطی سے دولت وتمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتون کے ساتھ خاص کرتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہین، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگون کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لئے دولت کی نہین دل کی ضرورت ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح [2] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو [3] جامع ترمذی ایضاً

اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا "تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے، تم جانوں کو آزاد کرو، اور گردنوں کو چھڑاؤ" اُس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کیساتھ نیکی کرو اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو، اور بُرائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔"[1]

ایک دفعہ حضرت ابو ذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے، فرمایا "جو روزی خدا نے دی، اس میں سے دوسروں کو دے" عرض کی اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی "اگر اُس کی زبان معذور ہو" فرمایا "مغلوب کی مدد کرے" عرض کی اگر وہ ضعیف ہو، مدد کی قوت نہ ہو، فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے" عرض کی اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو، فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے"[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب [2] مستدرک حاکم کتاب الایمان، ج ۱ ص ۶۳،

عفو و درگذر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لئے بھی آباد نہ رہے، اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ، غَفُورٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا ہے) اس کی شان یہ ہی،

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ	اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ
عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ	قبول کرتا ہے، اور برائیوں کو
السَّيِّاٰتِ، (شوریٰ-۳)	معاف کرتا ہے،

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے اُن کو ایک دم ہلاک کر دے، یا اُن کو معاف کر دے، فرمایا:-

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ	(اگر خدا چاہے تو) گنہگاروں کو اُن
يَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ،	کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے
(شوریٰ-۴)	اور بہتوں کو معاف کر دے،

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کرکے یوں دلاتا ہے:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ	اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس
وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ،	کی بڑی بخشایش کرتا ہوں جو توبہ کرے
(طٰہٰ - ۴)	اور یقین لائے اور نیک کام کرے، پھر

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غَافِرٌ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غَفَّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور سو سے زیادہ آیتوں میں غَفُوْرٌ (بخشنے والا) کہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے، خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے، فرماتا ہے:

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ	یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بیشک
كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ، (نسآء - ۲۱)	ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا،

انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے، اسی طرح ہم کو چاہئے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں[1]۔

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصور داروں کو معاف کرینگے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت مین اس اشارہ کی پوری تصریح ہے، فرمایا،

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا اَلَا	اور چاہیے کہ وہ معاف کردین اُور
تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ	درگذر کرین، کیا تم نہین چاہتے کہ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ،	خدا تم کو معاف کرے، اور اللہ معاف
(نور - ۳)	کرنے والا مہروالا ہے،

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے لوگون کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسرون کو معاف کرو تو خدا تمھین معاف کرے گا، اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابر کرم کی کچھ چھینٹین پڑنی چاہئین، چنانچہ جن مومنون کے لئے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے اُن کی ایک صفت یہ بتائی ہے،

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ	اور جب غصہ آئے تو وہ معاف
(شوریٰ - ۴)	کرتے ہین،

سکون کی حالت مین معاف کرنا اتنا مشکل نہین، جتنا غصہ کی حالت مین، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہین رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن مین یہ جوہر ہوتا ہے، وہ اس حالت مین بھی اپنے آپ کو قابو مین رکھتے ہین اور قصور والون کو معاف کردیتے ہین،

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہو جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے کہ ان احمقون کو اچھی بات بتائی جاتی ہے، اور وہ نہیں مانتے، اُن کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے، مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں، اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہکر دیتے ہین، ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے،

وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ	اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ
لَا يَسْمَعُوا وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ	تو تمھاری ایک نہ سنین اور بظاہر
إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ	وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہین کہ گویا
خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ	وہ تمھاری طرف دیکھ رہے ہین، حالانکہ
أَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ،	وہ دیکھتے نہین، (اے پیغمبر) درگذر
	کا شیوہ اختیار کرو اور (لوگون سے)
(الاعراف - ۲۴)	نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلون

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتین ہوسکتی ہین، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کردیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ مین ان ناگواریون کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ ان ناگواریون کو برداشت کرو، اور نیکی کا حکم دیتے رہو، صرف یہی نہین، بلکہ اس سلسلہ مین برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو،

اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ السَّيِّئَةَ	(اگر کوئی تمھارے ساتھ بدی کرے تو)
نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَصِفُونَ،	بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو

(مومنون - ۶) بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمھاری

نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے

مذہبی جماعت کے لئے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے، جب کچھ لوگ اُن لوگون کو بھی اُن سے الگ کرنا چاہتے ہین، جو اُن کی جماعت مین شامل ہو چکے ہین لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانون کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ — (مسلمانو!) اکثر اہل کتاب باوجودیکہ

لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ — اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی)

كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم — اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہین کہ

مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ — تمھارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ — کافر بنادین، تو معاف کرو، اور درگذر

اللَّهُ بِأَمْرِهِ، — کرو، یہان تک کہ خدا اپنا حکم صادر

(بقرہ - ۱۳) فرمائے،

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہین رکھتے تھے، اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کرین تو ان نادانون کو معاف کر دینا چاہئے کیونکہ وہ اگر نہین تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ تمھارے ساتھ بُرائی کرتے ہین، تو آج نہین تو کل اُس کا بدلا اُن کو مل جائے گا، فرمایا،

قُل لِّلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا — ایمان والون سے کہدے کہ اُن کو

اِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ	جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر
لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ	یقین نہین رکھتے، معاف کر دیا کرین،
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَ	تاکہ لوگون کو اُن کے کامون کا بدلہ ملے
مَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ	جس نے اچھا کیا، اُس نے اپنے بھلے
تُرْجَعُوْنَ،	کے لئے کیا اور جس نے بُرا کیا، اوس نے اپنا
(جاثیہ - ۲)	بُرا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس ؎

اس آیت کے شانِ نزول مین لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی، اس پر بعض مسلمانون کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری اور مسلمانون کو عفو و درگذر کی نصیحت فرمائی۔ (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

لہ اس قسم کی آیتون کے متعلق جن مین کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے، عام مفسرون کا نظریہ یہ ہو کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہو، جہاد نے کفار کے حق مین عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہو، لیکن مفسرون مین کچھ ایسے لوگ بھی ہین جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہین سمجھتے، اور اس لئے ایک دوسرے کو منسوخ نہین جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر مین کئی موقعون پر اس کی تصریح کی ہو، لکھتے ہین :-

"اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ) مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہو کہ جاہلون کی بداخلاقی پر صبر کرین اور اُن کی بیہودہ باتون اور کمینہ حرکتون کا جواب اسی قسم کی باتون اور حرکتون سے نہ دیا جائے، اور اس مین قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہین، کیونکہ جاہلون سے اعراض برتنے اور مشرکون سے قتال مین کوئی تضاد نہین، اور جب دونون باتین ایک ساتھ ہو سکتی ہین، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہین، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتون کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہین۔"

(جلد ۴، ص ۴۹۶)

غم وغصہ کے اظہار کا اصلی وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے، لیکن اس حالت مین بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۹۴) ایک اور آیت (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) کی تفسیر مین لکھتے ہین :-

"کہا گیا ہو کہ یہ آیت منسوخ ہی، اور یہ بھی کہا گیا ہو کہ یہ منسوخ نہین کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال مین آمادہ کیا گیا ہو جب تک اس سے دین اور اخلاق مین کوئی نقصان نہ پیدا ہو" (ج ۹ ص ۳۰۰)

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا کی تفسیر مین فرماتے ہین :-

"کلبی اور ابو العالیہ نے کہا ہو کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہین، کیونکہ احمقون سے چشم پوشی کرنا، اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونون مین مستحسن ہی، اور عزت وآبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہی (جلد ۶ صفحہ ۹۱ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر)

آیت یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جاثیہ) کی تفسیر مین لکھتے ہین :-

"اکثر مفسرون نے کہا ہو کہ یہ آیت منسوخ ہو کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم مین یہ بھی داخل ہوتا ہو کہ اُن سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے اُن سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا فسخ ہو گیا لیکن قریب بہ صحت یہ ہو کہ اس آیت کے یہ معنی ہین کہ چھوٹی چھوٹی باتون پر کافرون سے جھگڑا نہ کیا جائے اور اُن کی تکلیف دہ باتون اور وحشیانہ حرکتون سے درگذر کیا جائے" (جلد ۸ ص ۴۴۸ طبع مذکور)

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانون کو کافرون اور مشرکون اور دوسرے قصور وارون کے اُن ہی قصورون کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہو .... جن کے معاف کرنے کا حق بندون کو ہو، اور وہ حقوق عباد ہین یعنی وہ مسلمانون کا ذاتی قصور کرین تو مسلمان معاف کر دین، اس سے یہ نہین سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الٰہی کے قصورون کی معافی لازم آتی ہو، جن کے معاف کرنے کا حق بندون کو سرے سے حاصل نہین، اور قتال وجہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ مین مشروع ہوا ہو، اس لئے جہاد کی آیتین اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام مین خلل انداز نہین،

در منثور مین ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابی کا ایک واقعہ نقل کیا ہو کہ انھون نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا، اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہو (جلد ۶ ص ۳۵ مصر)

حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، اور وہ اُن کی کفالت کرتے تھے، لیکن جب انھون نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت مین حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے انکی مالی امداد بند کردی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ	اور تم مین سے جو لوگ صاحبِ احسان
وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ	اور کشایش والے ہین، قرابت والون
وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ	اور محتاجون اور اللہ کی راہ مین ہجرت
فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَ	کرنے والون کو (مدد خرچ) نہ دینے
لْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ	کی قسم نہ کھا بیٹھین، بلکہ چاہئے کہ ان
يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ	کے قصور) بخش دین، اور درگذر کرین
رَحِيمٌ ۝	(مسلمانو!) کیا تم نہین چاہتے کہ اللہ
(نور-۳)	تمھارے قصور معاف کردے، اور اللہ بخشنے والا

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسرون کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا،

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر اُن اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہین، اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے، جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے،

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ	اور اپنے پروردگار کی بخشایش، اور

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ	اس جنّت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ
الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ	(اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ	کا پھیلاؤ، سجی سجائی) اُن پرہیزگارون
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ	کے لئے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی
وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ	دونون حالتون مین (خدا کے نام پر)
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ،	خرچ کرتے اور غصّہ کو روکتے اور لوگون
	(کے قصورون) سے درگذر کرتے ہین،"
	(لوگون کے ساتھ) نیکی کرنے والون کو
(اٰلِ عمران - ۱۴)	اللہ دوست رکھتا ہے،

اوپر کی آیت مین متقیون کے دو وصف ایک ہر حال مین راہِ خدا مین دینا، اور دوسرا لوگون کو معاف کرنا، اور درگذر کرنا اور اُن کے لئے دو جزائین، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنّت بیان کی گئی ہین، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال مین خدا کی راہ مین دینے کا معاوضہ تو وہ جنّت ہے جس کی حد و پایان آسمان و زمین ہے، اور غصّہ کو روکنا اور لوگون کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی،" وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کرے گا،

عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم مین اگر قوّت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جائے، اسی لئے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے

درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے ، اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے ، اس کی اصلاح ہو جاتی ہے ، کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے ، جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے ،

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَهُمُ	اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب
الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَ	اُن پر (کسی طرف سے) بےجا زیادتی
جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ	ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لیتے
مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ	ہیں ، اور برائی کا بدلہ ہے ، ویسی ہی
فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا	برائی ، اس پر (بھی) جو معاف
يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝	کر دے ، اور صلح کرے تو اس کا ثواب
	اللہ کے ذمہ ہے ، بیشک وہ ظلم کرنے
(شوریٰ - ۴)	والوں کو پسند نہیں کرتا ،

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے ، اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے ، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بےسبب ظلم کر بیٹھیں ، یا وہ جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں ، خدا کی محبت سے محروم ہیں ،

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگذر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے، اسی لئے فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ	کی خطا) بخش دے، تو بے شک یہ
(شوریٰ - ۴)	بڑی ہمت کے کام ہیں،

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا	اور بھلائی اور برائی برابر نہیں (اگر
السَّيِّئَةُ، اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ	کوئی برائی کرے تو اس کا) جواب
فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ	اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے
عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ	درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائیگا
وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا	گویا دوست ہے ناتے والا، اور یہ بات
وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ	ملتی ہے انہی کو جن کو صبر ہے اور یہ بات
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ	ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے، اور
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ	اگر (اس میں) شیطان کے کونچے سے کوئی
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (حٰمٓ سجدہ - ۵)	کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ،

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہو جاتی ہے، وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہو کہ انھون نے کہا،

"خدا نے اس آیت مین ایمان والوں کو غیظ و غضب مین صبر کا، اور نادانی وجہالت کے وقت حلم و بردباری کا، اور بُرائی کے مقابلہ مین عفو و درگذر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کرینگے، تو خدا اُن کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا[1]"

ابو مسعود صحابیؓ کہتے ہیں کہ مین ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی، جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے، ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ مین نے پھر کسی غلام کو نہین مارا،

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ مین اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کرون، آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر بھی پوچھا، تب آپ نے فرمایا "ہر روز ستر دفعہ[2]" اس سے مقصود نبویؐ تعداد کی تحدید نہین بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے،

---

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الخادم مین یہ دونون حدیثین ہین،

بعض لوگون کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے اُن کے رعب و داب اور وقار مین فرق آجائے گا، لیکن یہ خیال صحیح نہین، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہوجاتی ہی، اور کمزورون پر دھاک بیٹھ جاتی ہے، مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہین پیدا ہوتا، یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہی[1]

وَمَا زَادَ اللّٰہ رجلاً بعفوٍ	اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا
اِلَّا عِزًّا،	ہی نہین بڑھاتا ہی مگر عزت مین،

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التواضع،

حلم وبردباری

حلم وبردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے، اور قصوروار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے، یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے، لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے، اور انتقام نہیں لیتا، اور اسی لئے اُس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کردیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا،

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (بقرہ ۲۸ - مائدہ ۱۴) اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (آل عمران ۱۶) بیشک اللہ ہے بخشنے والا بردبار،

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا، (اسرائیل ۵ ع ۵) بیشک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار،

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت

کا ذکر کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہین، بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے، دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہی، ارشاد ہوتا ہی،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ، (نسآء-۲)	اور اللہ ہے جاننے والا بردبار،
اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ، (حج-۸)	بیشک ہو اللہ جاننے والا بردبار،
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا، (احزاب-۶)	اور ہے اللہ جاننے والا بردبار،

ان آیتون سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانون کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہین کرتا، بلکہ پورے علم، اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغنار کا بھی ذکر فرماتا ہے،

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ، (بقرہ-۳۶)	اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے،

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہی اس لئے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے،

انسانون مین بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ مین حلم، اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لئے کسی کو زیادہ قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہی، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہی کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہی، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے، اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے،

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت مین تعریف کے قابل ہے، لیکن اس کی ایک حیثیت

ایسی ہے کہ اُس سے بعض کم ظرفون کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہو، اور اسی لئے اس کے مقابلہ مین اُن مین سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ اپنے بندون کی اس کمزوری سے واقف تھا، اس لئے اُس نے اپنے حلم اور دار و گیر دونون کو پہلو بہ پہلو جگہ دیا ہے تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندون مین مایوسی اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ	اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو
اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا	تمھارے دلون مین ہو تو اس سے
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝	ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ بخشش
(بقرہ ۔ ۳۰)	والا ہو تحمل والا،

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ مین ہے، یعنی جب تک اُس کی عدت کے دن پورے نہ ہون کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے، اور نکاح نہ کرے، دل مین رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمھارے دل کا ہر بھید معلوم ہے، ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لئے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو، دوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہو اس لئے اس سے پُر اُمید بھی رہنا چاہئے،

نیکی کے کامون مین مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگون کے گناہ معاف کرتا ہو، اس موقع پر اس کا ارشاد ہے،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض
يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ	دیا تو وہ اس کو دونا کر دے گا، اور
اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ،	تمہیں معاف کرے گا، اور اللہ ہے
(تغابن - ۲)	قدردان اور تحمّل والا،

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا، اور تحمّل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا،

اس آیت میں تحمّل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں، اور اس کی خوبیاں نظرانداز ہو جاتی ہیں، اس لئے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے، یا اس میں ایک عیب ہے، مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے،

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی تھی خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے، انھوں نے اس

کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے، اور آخر مجبور ہو کر اس علیحدگی پر مجبور ہوئے پھر بھی اُن کی بردباری اور تحمل کا سر رشتہ اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اور اس وقت تک اُس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے، جب تک اُن کو پوری مایوسی نہیں ہو گئی، اور اُن کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا، کہ وہ خدا کا دشمن ہے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ	اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ	مغفرت کی دعا مانگنا، مگر ایک وعدہ
وَّعَدَهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ	(کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ
لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ	سے کر لیا تھا، پھر اُن کو (بھی) جب
مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ	معلوم ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو باپ
حَلِيْمٌ ۝	سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے بیشک
	ابراہیم بڑے نرم دل (اور) بردبار
	تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود
(توبہ - ۱۴)	خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوطؑ کی بربادی کی خبر پا کر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، اُن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ	بے شک ابراہیم، بردبار، نرم دل،
مُّنِيْبٌ ۝ (ھود - ۷)	اور رجوع کرنے والے تھے،

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف مین حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف مین اوّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لئے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہین لیکن ایک اور آیت مین حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسبت فرمایا ہے،

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ،	تو ہم نے اُن کو (ابراہیم کو) ایک بڑے
	بردبار لڑکے (اسمٰعیل کے پیدا ہونے)
(والصّٰفّٰت ۳۰)	کی خوشخبری دی،

اس کے بعد جب اُن کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انھون نے کہا ہے :۔

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي	اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے
إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ	تأمل) اس کی تعمیل کیجیے، انشاء اللہ آپ
(وَالصّٰفّٰت ۳۰)	مجھ کو بھی صابر ہی پائین گے،

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزء ہے، حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے، چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم مین دو خصلتین ایسی ہین جن کو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا[1] یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ مین کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہئے

ایک شخص نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب التانی فی العجلۃ

آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصہ نہ کرو" اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"[2]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں اُن کے ساتھ ملتا ہوں[3] وہ کاٹتے ہیں، میں بھلائی کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا کہ اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم اُن کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہوگے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی[4]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی کظم الغضب [3] یعنی صلہ رحم کرتا ہوں [4] صحیح مسلم باب صلۃ الرحم والادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم

رفق و لطف

رفق و لطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے، جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے اور جو عطا کیا جائے وہ میٹھے طریقہ سے کہ دلون کو موہ لے، اور پتھر کو بھی موم کر دے،

اللہ تعالیٰ نے کئی آیتون میں اپنے کو "لطیف" فرمایا ہے،[1] اور حدیثون میں اس کا نام

---

[1] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنون میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہین،

"وہ اپنے بندون کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے" (لفظ لطف)

امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہین:-

"خدا کا نام لطیف اس لئے ہو کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہو اور اُن کے لئے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے،....... لطیف اس لئے کہ وہ اپنے بندون کے ساتھ بھلائی فرماتا ہو، اُن کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہو جس کا علم بھی اُن کو نہیں ہوتا، اس طرح اُن کی مصلحتون کا سامان فراہم کرتا ہو جس کا گمان بھی اُن کو نہین ہوتا،..... ابن الاعرابی کا قول ہو لطیف وہ ہو جو تمھاری ضرورت کو تم تک ملاطفت (رفق) سے پہنچا دیتا ہو" (ص ۴۰ الہ آباد)

امام غزالی کہتے ہین:-

"اس صفت کا مستحق وہی ہو جو نازک اور باریک مصلحتون کو جانتا ہو پھر اُن کو نرمی کے طریق سے نہ کہ سختی سے اس تک پہنچاتا ہو جس کے حق میں وہ مفید ہین، جب عمل مین نرمی اور ادراک مین لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہین، اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لئے ہو" (روح المعانی تفسیر سورۂ شوریٰ)

رفیق آیا ہے[1] جس کے معنی یہ ہین کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندون کے ساتھ اُن کی خبرگیری اور رزق کا سامان پہنچانے مین رفق و لطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف مین وہ اُن کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہین کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور اُن کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعون سے مصر لے آیا، اور دشمن بھائیون کو جس طرح اُن کے سامنے نادم و شرمندہ کرکے اُن کے آگے سرنگون کر دیا، اس کو یاد کرکے وہ فرماتے ہین،

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ	بے شک میرا رب لطف کرنے والا
اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ،	ہے جس بات کا چاہے، بیشک وہی
(یوسف-۱۱)	علم والا حکمت والا ہے،

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلین پیش آئین اور پھر وہی مشکلیں جس طرح اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنین، اُن کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی،

ایک دوسری آیت مین اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے،

اَللّٰهُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ	اللہ اپنے بندون پر لطف فرماتا ہے
مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ	جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے اور
(شوریٰ-۲)	وہی قوت والا غالب ہے،

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلة باب فضل الرفق ۱۲۰،

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنون اور کافرون کا ذکر ہے، اور نیچے بھی ان دونون قسمون کا تذکرہ ہے، بیچ مین یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونون کے ساتھ ہے کہ دونون کو یکسان وہ رزق پہنچاتا ہے[1] اور اسی لئے قیامت کو رازِ رکھنا بھی اس کے لطف ہے کہ ان کا ایک نتیجہ ہے،

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق مین جب دعاے مغفرت کے طالب ہوئے، تو بارگاہِ الٰہی مین گو یہ دعا مستجاب[2] نہ ہوئی، مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا،

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ (توبہ) — بیشک ابراہیمؑ نرم دل بردبار تھے،

اسی طرح جب وہ حضرت لوطؑ کی گنہگار قوم کی سفارش کے لئے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ، (ھود - ۷) — بیشک ابراہیمؑ بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے،

اَوَّاہٌ کے معنی مین مفسرون کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائین مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینون باتین پوری اترتی ہون، وہ ہر شخص کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اسلئے جلد پسیج

---

[1] تفسیر روح المعانی مین مقاتل کا یہی قول ہے، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہین [2] حضرت

جاتے تھے اور یہ اسلئے ایسا تھا کہ ملت حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا، چنانچہ آپ

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے آداب سکھائے جاتے ہیں،

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ	سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا
يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ-۲)	شاید وہ نصیحت پائے یا (خدا سے) ڈرے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے، اور اسی لئے دین حنیف کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے،

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ	تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم ان کے
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا	لئے نرم دل ہوئے، اور اگر تم مزاج کے
نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ،	اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے، تو یہ لوگ
(آل عمران-۱۷)	تمھارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے،

اس لئے ایک پیغمبر کے لئے یہ وصف نہایت اہم ہے تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں، اور اسی لئے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱ ۵) ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پاکر اس کے بعد ان سے اپنی علیحدگی ظاہر کردی،

پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا،

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی، اور خوش خلقی، غرض اُن تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے، جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے، اسی طرح رفق و نرمی کی خوبی سے انسان کا اخلاقی حُسن دوچند ہو جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا،

اِنَّ الرِّفقَ لَا یَکُونُ فِی شَیءٍ	نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی
اِلّا زانہ ولا ینزع من شیءٍ	ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اسکو
اِلّا شانہ[1]	بدنما بنا دیتی ہے،

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی، اور سختی بگاڑتی ہے، الّا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو،

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا، نرم خو (رفیق) ہے، اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا[2]، جریر بن عبداللہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا[3]"، اور فرمایا کہ "تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی، خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا، اور اس کو جنت میں داخل کرے گا،

[1] [2] [3] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق،

یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا، اور غلام پر احسان کرنا؛[۱]
اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی،

الا اخبرکم بمن یحرم علی	کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون
النار و بحرم علیہ النار	شخص آگ پر حرام ہے، اور کس پر آگ
علی کل قریب ھین سھل[۲]	حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے
	قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو،

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السام علیکم" یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں، اور انہوں نے جواب میں کہا "وعلیکم السام واللعنۃ" یعنی تم کو موت آئے، اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "عائشہ ٹھہر جاؤ، خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے" بولیں یا رسول اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا۔ فرمایا میں نے بھی تو کہدیا کہ "علیکم" یعنی تم پر،[۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی، مگر اس میں سختی کا نشان نہیں، اور پھر اس طرح سے ہو کہ مخاطب ذرا سوچے، تو خودبخود اس کا دل شرمندہ ہو؛ شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے، اور جماعت کو نقصان

---

[۱] ترمذی ابواب الزہد [۲] ایضاً [۳] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ

پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھین، اور اپنی ضد پر اڑے رہین، بلکہ مسلمانون کو آزار پہنچانے کے درپے ہون، تو اُن کے شر کو روکنے اور اُن کی سازشون کے قلع وقمع کرنے کے لئے اُن پر پوری سختی کی جاسکتی ہو، فرمایا،

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ	اے پیغمبر! کافرون اور دغابازون سے
الْمُنٰفِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (تحریم)	جہاد کرو، اور اُن پر سختی رکھو،

دوسری جگہ فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ	اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافرون
يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا	سے لڑتے جاؤ اور چاہئے کہ وہ تم مین
فِيكُمْ غِلْظَةً، (توبہ ۱۶)	کڑاپن پائین،

اسی طرح شریعت کے گنہگارون کو جب سزا دی جائے تو مسلمانون کو چاہئے کہ اُسکے اجرار مین نرمی نہ برتین مسلمان بدکار مردون اور بدکار عورتون کی سزا کے متعلق فرمایا،

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ	اور اللہ کے حکم چلانے مین تم کو ان دونون
فِي دِينِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ	پر ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، (نور ۱)	پر یقین رکھتے ہو،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہی اُس مین بھی نرمی اور سختی کے مواقع مین یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہی، امّ المومنینؓ فرماتی ہین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ مین کبھی کسی سے بدلہ نہین لیا، البتہ جب احکام الٰہی

کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے[1] امام بخاری نے ایک خاص باب مین اس قسم کی متعدد حدیثین نقل کی ہین جن مین آپنے مسلمانون، بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات مین سختی برتی ہے[2] حافظ ابن حجر اس باب کی شرح مین لکھتے ہین :۔

"گویا امام بخاری اس باب مین یہ اشارہ کرتے ہین کہ جس حدیث مین یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفون پر صبر کرتے تھے، وہ آپکے ذاتی حق سے متعلق ہے، لیکن خدا کے حق مین آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا"

(فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو، سختی نہ کرو"[3] شارحین حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات مین سختی نہ برتی جائے، اور شریعت نے جس حد تک گنجایش اور وسعت رکھی ہو، اس مین تنگی نہ کی جائے، ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ مین ایک شرعی غلطی ہوگئی، انھون نے اپنی قوم کے لوگون سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین لے چلو، ان سبنے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا، تو انھون نے اکیلے ہی خدمتِ نبویؐ مین حاضر ہوکر حقیقتِ حال عرض کی، ارشاد ہوا "ایک غلام کی گردن آزاد کرو" وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہین،" فرمایا "لگاتار دو مہینے روزے رکھو"

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [2] باب یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا،

گذارش کی کہ "یا رسول اللہ! روزہ ہی مین تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھون! فرمایا" ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلاؤ"! عرض پرداز ہوئے کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک مین رات گذاری ہے"! فرمایا کہ صدقہ کے فلان محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو۔ اس سے ساٹھ مسکینون کو کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ" وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم مین آئے اور اپنی روداد بیان کرکے بولے کہ "مین نے تمھارے پاس تنگی اور بُری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی"[1]

---

[1] سنن ابی داؤد باب فی الظہار۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے جس مین کوئی اس کا شریک نہین،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور اسی کو بڑائی ہے، آسمانون مین
الْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ	اور زمین مین اور وہی زبردست ہے
(جاثیہ - ۴)	حکمت والا،

اس لئے بندون کی شان نہین کہ وہ کبریائی کرین، اُن کی بندگی کی شان اس مین ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کرین، اور عاجزی وفروتنی برتین،

تواضع وخاکساری کے بہت سے منظر ہین، قرآن مجید نے اُن مین سے نمایان مظاہر کو لے کر بعض موقعون پر اُن کا حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعون پر اُن کو اپنے خاص بندون کا وصف بتایا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگذر کا پھر مومنون کیساتھ بمحبت تواضع کا حکم دیا ہے،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (حجر-۶)	اور اپنا بازو مومنون کے لئے جھکا دے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	اور اپنا بازو جھکا رکھ اُن کے واسطے جو
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، (شعراء-۱۱)	تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے،

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	اور ماں باپ کے لئے عاجزی کا بازو
مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۳)	مہر و محبت سے جھکا دے،

خَفْضِ جناح یعنی بازو جھکا دینا، تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرند کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے، یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے، اور تکبر اور ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص)
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ	بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا،	کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل اُن
(الفرقان-۶)	سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو

لہ اثل السائر باب نوع التشبیہ و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ صفحہ ۵۰۸ دار الطباعۃ العامرہ،

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندون کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو اُن کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ خدا جب رحمت اور عفو وکرم والا ہے، تو اُس کے بندون مین خلق خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو،

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی،

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور لوگون سے بے رخی نہ کر، اور زمین
وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا،	پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ	والے شیخی خورے کو پسند نہین کرتا، اور
فَخُورٍ، وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ	اپنی رفتار مین میانہ روی (اختیار) کر
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ	اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے
أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ	بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدہون
(لقمان-۲)	کی آواز ہے،

اس آیت مین خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہین، بات کرنے مین لوگون سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال مین غرور کا شائبہ نہ ہو، اور نہ آواز مین غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو،

لیکن یہ خیال مین رہے کہ تواضع وخاکساری اور دنائت وپستی مین بڑا فرق ہے، تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان مین کبر وغرور پیدا نہ ہو، اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے، اور دنائت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لئے انسان اپنی خودداری کو کھو دے، چنانچہ ایسے

موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خود دارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے، صحابہ جب عمرہ کے لئے آئے، تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے اُن کو کمزور کر رکھا تھا، اس لئے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور اُن کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس پر آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ طواف کا تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر اُن کی طاقت کا اظہار ہو۔[1]

قوت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے، اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند۔[2]

بہرحال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے، اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سر و سامانی سے مختلف ہے، ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بلند مرتبہ بنا دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ "جو شخص خدا کے لئے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے"۔[3] ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا، اور اس کو اختیار دے گا

[1] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف و صحیح بخاری عمرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [3] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی التواضع،

کہ ایمان کا جو حُلّہ پسند کرے، اُس کو پہن لے[1]

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لئے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے[2]" اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے، اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے،

---

[1] ترمذی ابواب الزہد [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ،

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتین کرنے مین ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے تاکہ آپس مین خوشگوار تعلقات پیدا ہون اور باہم مروت اور محبت بڑھے، سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائین دینا، اچھی باتین کرنا، اچھی باتین سمجھانا، اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہین، خدائے تعالیٰ نے توریت مین بنی اسرائیل کو لوگون کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن پاک مین بھی دہرادیا ہے،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ-۱۰)　　اور کہو لوگون سے اچھی بات،

اس اچھی بات کہنے مین لوگون کے فائدہ اور کام کی باتون کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتون کی تعلیم و تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت مین یہی حکم دوسرے لفظون مین اس طرح دیا گیا ہو کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندون کی پہچان بن جاتا ہو، ارشاد ہے،

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ　　اور اے پیغمبر! میرے بندون سے

ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ	کہ دے کہ وہ بات کہیں جو سب سے
بَیْنَھُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ	اچھی ہو، بیشک شیطان جھگڑا ڈالتا ہے
لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝	آپس میں، بیشک شیطان انسان کا
(بنی اسرائیل-۶)	کھلا دشمن ہے،

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے، اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے، وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے، اس لئے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں اچھے لہجہ میں کہیں، اور نرمی سے کہیں کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو، اسی لئے تنابز بالالقاب یعنی ایک دوسرے کو بُرے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے، کسی کو یا کافر، یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اُس اچھی بات کے خلاف جو آپ اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، فرمایا،

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا	اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو
بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ	اور نہ چڑ کا نام لیکر پکارو، ایمان کے بعد
بَعْدَ الْاِیْمَانِ ج (حجرات-۲)	گنہگاری بُرا نام ہے،

اسی لئے برائیوں کے تذکروں، اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بری بات کا پکارنا خوش نہیں
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ	آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے
(نساء - ۲۱)	کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے[1]" اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہئے، اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیر خواہی، اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو اللہ اور روز جزا پر یقین رکھتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اچھی بات بولے، ورنہ چپ رہے[2]" اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے: کہ اللہ اور روز جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ کلمہ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے، کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا، وہ بھرے گا اگر تمہیں بھی کوئی برا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل رہے گی، ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا، اور روئے اور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا "دوزخ سے بچو اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو، اگر یہ بھی نہ ہو سکے، تو کوئی اچھی بات سے[3]"

ایک دفعہ آپ نے جنت کا ذکر فرمایا، اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا، ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا

---

[1] صحیح بخاری باب طیب الکلام [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ،

جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے، اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو"[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اچھی بات صدقہ ہے"[2] یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے، اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے، ایک صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ نجات کیونکر ملے؟ فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو"[3]، ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا "اس کا ڈر ہے"[4]۔

---

[1] ترمذی ماجاء فی قول المعروف [2] صحیح بخاری کتاب الصلح [3] ترمذی باب حفظ اللسان [4] ترمذی ایضاً

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے، اس کے معنی یہ ہین کہ دوسرون کی ضرورتون کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے، خود بھوکا رہے، اور دوسرون کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے، اور دوسرون کو آرام پہنچائے،

صحابۂ کرام مین انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا کہ مکہ کے مہاجر جب بے خانمان ہوکر اور اپنا سب کچھ مکہ مین چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے اُن کو ہاتھون ہاتھ لیا، اُن کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتون مین اُن کو شریک[1] کیا، اور خود ہر طرح کی تکلیفین اٹھا کر اُن کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانون کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریون کے سوا باقی ساری زمین مہاجرون کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو اُن کی یہ ادا بہت پسند آئی، اور اُن کی مدح وستایش[2] کی،

وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ ‏ ‏ ‏ ‏ اور اُن کے واسطے جنھون نے ان

---

[1] صحیح بخاری اول مناقب انصار۔ [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری،

مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ	(مہاجرون کی آمد) سے پہلے اس مقام
إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ	(مدینہ) مین اور ایمان مین جگہ کر لی ہے
صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ	محبت رکھتے ہین اس سے جو اپنا گھر چھوڑ
أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ	کر ان کے پاس چلا آیا، اور ان (مہاجرین)
وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّ	کو دیئے جانے سے دل مین کوئی مطلب
مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ	نہین رکھتے، اور اپنے اوپر تنگی ہی کیون
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ،	نہ ہو، (ان مہاجر بھائیون کو) اپنے سے
	مقدم رکھتے ہین، اور جو شخص اپنی طبیعت
(حشر-۱)	کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے
	ہی لوگ فلاح پائین گے،

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ مین اس کو انصار کی جاگیرون مین تقسیم کر دینا چاہتا ہون، ان ایثار کے پیکرون نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیون کو بھی اتنا ہی نہ ملے ہم کو یہ منظور نہین، فرمایا اگر یہ منظور نہین تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لین گے اور تم کو نہین پوچھین گے،[۱]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین پیش کی، آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول

۱؎ صحیح بخاری اول باب مناقب انصار،

کریں، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو، آپ نے اُسی وقت اُتار کر اُن کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے اُن کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاجت تھی، اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے، تم نے کیوں مانگ لی، بولے ہاں میں نے تو برکت کے لئے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے،[1]

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، کاشانۂ نبویؐ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا، خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے، اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں صرف بچوں کا کھانا ہے بچوں کو سُلا دو، اور چراغ کو بجھا دو، ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا، خدا تعالے تمھارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا،[2]

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے، اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف[3] ہے، لیکن قرآنِ پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے، جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے،

---

[1] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء، و باب من استعد الکفن [2] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف و فضل الایثار، و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر [3] ایضاً،

اعتدال و میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس مین وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہو کہ اس کا راستہ اکثر مسئلون مین افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے، قرآن پاک مین مسلمانون کو اُمَّۃً وَّسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے[1]، اس لئے اُس نے اکثر معاملون مین اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات مین بھی اس اصول کو وہ نہین بھولا ہے،

دعا یا نماز مین ہماری آواز کتنی ہو ارشاد ہے،

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا	اور تو نہ پکار اپنی دعا یا نماز مین اور نہ
تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ	چپکے پڑھ اور ڈھونڈھ لے، اس کے
سَبِيلًا (بنی اسرائیل-۱۲)	بیچ مین راہ،

یعنی نہ چلا کر دعا کیجائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے، یا مخالف اس کو سُن کر بُرا بھلا کہے،

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی تفسیر آیہ مذکور (بقرہ)

اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سُن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے

ہماری چال ڈھال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے،

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان-۱) اور چل بیچ کی چال،

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے[1]،

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں، سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے، اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے، اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے، اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آجائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى	اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ	لے، اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا	تو بیٹھ جائے، ملامت کا نشانہ بن کر
(بنی اسرائیل -۳)	تھکا ہارا،

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا	اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں

[1] دیکھو ابن جریر طبری/روح المعانی

وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ	اور نہ بہت تنگی کریں، اور ہو اس کے
قَوَامًا، (فرقان-٦)	درمیان اعتدال سے،

یعنی نہ اسراف ہو نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو،

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اُکْلُفُوا من الاعمال ماتُطِیقُوْنَ	اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو،

عمل کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں[1] مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزار میں حضرت حذیفہ صحابیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،[2]

ما احسن القصد فی الغنی ما	دولت مندی میں درمیانگی کتنی
احسن القصد فی الفقر ما	اچھی ہے، محتاجی میں درمیانگی
احسن القصد فی العبادۃ،	کتنی اچھی ہو عبادت میں درمیانگی کتنی

غرض یہ ہو کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے، نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولتمند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عز وجاہ اور عیش وتنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں،

[1] فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۵۰، [2] بروایت کنز العمال جلد ثانی ص ۲ حیدرآباد دکن،

اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہو جاتے ہین کہ صبر اور خود داری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہین، اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونون حالتون مین اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت مین نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے، نہ محتاجی کی حالت مین اپنی حیثیت سے گرجانا چاہیے،

عبادت سے بڑھکر اسلام مین کوئی نیکی کا کام نہین۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندون کے لائق نہ رہے، اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت مین کئی دفعہ گذر چکا ہو کہ انھون نے جب راتین نمازون اور دن روزون مین بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی، اور فرمایا کہ تمھارے ذمہ اور بھی حق ہین،

خودداری

یا

عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہی، زندگی مین اس کے موقع کثرت سے پیش آتے ہین اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات مین انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ وصف نہ ہوگا، اس مین نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اونچائی، نہ لوگون کی نگاہون مین اس کی عزت ہوگی، نہ اس کی باتون کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کیطرف لوگ متوجہ ہون گے، اور نہ اس کو کسی مجلس مین وقار حاصل ہوگا،

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اُس بلند و برتر ذاتِ الٰہی مین ہے جو ساری عزتون کا مرکز ہی، چنانچہ قرآن پاک مین ۹۲ موقعون پر اللہ تعالیٰ کا نام "عزیز" لیا گیا ہے، عزیز کے معنی

ہیں، عزت[1] والا اور غالب کہیں کہیں عزیز کے ساتھ قوی (قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے،

اس لئے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے، جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو،

اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے، اور اُدھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے ان کی دوستی کے بھی طلب گار تھے

تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا،

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ	کیا یہ اُن کے پاس عزت چاہتے ہیں
فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ه	تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری
(نساء - ۲۰)	خدا کے واسطے ہے،

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے،

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ	جو عزت چاہے تو عزت تو ساری
الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (فاطر - ۲)	اللہ کی ہے،
تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ	(اے خدا) تو جس کو چاہے عزت دے،

---

[1] عزۃ کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عزو شرف اور نخوت، (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے، اس لئے ہر جگہ اس کے وہ معنی لئے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے کہ کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے (دیکھو لسان العرب، و مفردات راغب اصفہانی، و ابن جریر طبری آیات عزۃ و سورۂ بقرہ و نساء و ص و منافقون)

تَشَاءُ ۝ (آل عمران ۔ ۳)	اور جس کو چاہے ذلت دے،

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقون کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگون یعنی مسلمانون کو یا (نعوذ باللہ) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دین گے، اللہ تعالی نے اس کے جواب مین فرمایا

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ	اور عزت تو اللہ کے لئے ہے اور اس
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ	کے رسول کے لئے اور ایمان والون
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (منافقون ۔۱)	کے لئے لیکن منافق نہین جانتے،

اس آیت پاک نے مسلمانون کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی اس لئے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو عزت محسوس کرنا چاہئے، اور اسی لئے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہئے، تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جو کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت صلعم نے منظور فرمالیا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ اُن کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم حق پر اور کافر باطل پر نہین ہین ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے، "عرض کی" تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیون برداشت کرین" ارشاد ہوا مین خدا کا رسول ہون اور اس حکم کے خلاف کچھ نہین کر سکتا، حضرت عمرؓ کی محدود

۱؎ صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد،

نظر جہان تک کام کر رہی تھی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس کے بہت آگے تھی، اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا،

غزوۂ خندق مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کیلئے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ ہر سال دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصار کے سردارون کو بلا کر آپ نے مشورہ کیا تو انھون نے عرض کی،

"یا رسول اللہ جب ہم بتون کی پوجا کرتے تھے، اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہین ہوئی، اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے، اور اس کے اور حضورؐ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہین، ہم ان کو یون اپنا مال دینا منظور کرین گے؟ خدا کی قسم ہمین اس معاہدہ کی ضرورت نہین،"[1]

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ مین قیصر و کسریٰ کے مقابلہ مین صف آرا تھے، اُن کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے دربارون مین بے دھڑک چلا جاتا تھا، اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا مسلمان جب تک مسلمان رہے، یہی خیال اُن کی ہر قسم کی حوصلہ مندیون اور اولوالعزمیون کا باعث تھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت

---

[1] سیرت ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعۂ احزاب، ؔ ابسند،

اور خود داری کا احساس رکھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے، اور ہر وقت اس کے کان مین یہ آواز آتی رہتی ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران - ۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگون (کی سربراہی) کے لئے ظہور مین لائی گئی،

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہین کہ آپ مین غرور ہے، فرمایا غرور نہین خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہین، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہین، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون - ۱) ایک مسلمان صالح بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولین کیا مین مسلمان نہین، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہین، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہین،

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے، کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتون کی پستی مین نہ پڑجائے، اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کرجانے اور اس کو اسکی جگہ سے اوپر لیجانے کو کہتے ہین[1]،

یہ خودداری عین شرافت ہے جس مین یہ خودداری نہین، لوگون کی آنکھون مین اس کا وقار نہین، اس وقار اور خودداری کے لئے اگر ہاتھ مین قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورۂ منافقون کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر مین لکھے ہین،

بہت سی باتون سے اعراض اور در گذر کرنا پڑتا ہے، قرآن مین سچے مسلمانون کے وصف کے سلسلہ مین ہے،

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان - ٦)

اور جب وہ ہو نکلین بیہودہ باتون کی طرف سے تو گذر جائین شریفانہ،

یعنی اس شریفانہ انداز رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گذر جائین کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہون اور نہ ان شریرون کو انھین اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے،

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے، چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو، لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمایش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس مین اپنی بڑائی اور دوسرون کی تحقیر کا جز شامل نہ ہو، یہی چیز ہے جس سے خودداری غرور اور نمایش مین فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل مین ذرہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت مین داخل نہ ہو گا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے، مطلب یہ کہ یہ تو غرور مین داخل نہین، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگون کی تحقیر کی جائے[1]،

اسلام مین صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے، طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی الکبر،

ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے کیونکہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے، تو فرمایا کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا کیا کپڑے دھونے کے لئے اس کو پانی میسر نہ تھا؟ ایک شخص آپ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ اس نے کہا، اونٹ، بکری، گھوڑے، غلام سب کچھ ہیں، ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہئے۔[1]

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لئے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کونسی عبادت ضروری ہو سکتی ہے، اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

إذا سمعتم الاقامة فامشوا	جب تم اقامت سنو تو نماز کے لئے
الى الصلوٰة وعليكم بالسكينة	سکون اور وقار کے ساتھ چلو، جلدی
والوقار ولا تسرعوا،[2]	نہ کرو،

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان [2] بخاری کتاب الصلوٰة باب لا یسعی الی الصلوٰة و لیاتہا بالسکینة والوقار

کاپست کرنا، ادھر ادھر نہ دیکھنا اس وقار مین داخل ہے،

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے، اور اس مین بہت سی چیزین شامل ہین ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار مین یہ حدیث نقل کی ہے،

الھدی الصالح والسمت	نیک طور طریق، نیک انداز، اور
الصالح والاقتصاد جزء من	میانہ روی نبوت کے پچیس اجزاء
خمسة وعشرین جزء من النبوۃ	مین سے ایک جزو ہے،

کیونکہ انہی اخلاقی خوبیون کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے اور وہ خود بھی ان خوبیون کے بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کرکے خود دار بنتا ہے،

صحیح بخاری مین ایک اور لفظ دَلّ کا ہے، اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہین کہ انسان رفتار گفتار شکل وصورت وضع ولباس اور اپنی عام روش مین باوقار رہے، اور نیک مسلمانون کا طور وطریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصال فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل مین نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے ارشاد ہوا "وقار" بولے، خداوند میرے وقار کو اور بڑھا،[۱]

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح مین تعفف اور استعفاف ہے، اور شریعت مین وہ ایک

---

[۱] ادب مفرد باب ختان الکبیر،

قابلِ ستایش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا	(خیرات) توان حاجت مندون کا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	حق ہے جو اللہ کی راہ مین گھرے
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	بیٹھے ہین، ملک مین کسی طرف کو
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	جا نہین سکتے، بے خبر ان کی خودداری
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ	(کی وجہ) سے اُن کو غنی سمجھتا ہے،
النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ	تو ان کو دیکھے تو ان کی صورت
	سے ان کو صاف پہچان جائے کہ
	محتاج ہین، وہ لپٹ کر لوگوں سے
(بقرہ ۔ ۳۷)	نہین مانگتے،

اس آیت مین فقر و فاقہ کی حالت مین خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقرون کی تفسیر سے ہو سکتا ہے، صاحب کشاف نے لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی تفسیر مین لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہین لیکن بجاجت و اصرار کے ساتھ نہین کرتے، بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہین، لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہین کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے، ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ اُن کے حال سے ناواقف ہین، اُن کو دولت مند سمجھتے ہین تو پھر سوال کرنے کے

کیا معنی؟ اصحابِ صفہ صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود اس لئے سوال نہین کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفون مین مبتلا کرکے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے، جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے، تو اس کی یہی خاموشی بلجاجت واصرار کا سوال ہے، کیونکہ حاجت کی علامتون کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے، اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہین، اس لئے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے، تو اس کے دل مین رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اس لئے یہ حالت خود بلجاجت واصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحابِ صفہ لوگون سے بلجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہین کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہین کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہین ہونے دیتے، جو بلجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگون کے سامنے نہایت اچھی حالت مین نمایان ہوتے ہین، اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہین ہونے دیتے،[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے، اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے، ایک حدیث مین ہے کہ جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال مین آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا، یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا مین اس نے اپنی خودداری کو قائم نہین رکھا، اور اپنی عزت وآبرو

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶، ۵۲۷،

گنوادی تھی، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا آپ نے دیدیا، پھر سوال کیا، اور آپ نے پھر دیا، لیکن جب سب مال ختم ہوچکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہوگا مین تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کرون گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے، اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے، اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہین دیا،

فقر و فاقہ کی حالت مین عام آدمیون سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے، اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانون کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کی احتیاج دور نہین ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کردے، خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے"

روزمرہ کے معمولی کامون مین لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا بُرا نہین جانتے، لیکن کمالِ خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتون مین بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھادو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہین معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا نخی سے اس کا انکار کردے تو یقیناً اُس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا، اسی لئے کمالِ خودداری

یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستون سے بھی احتراز کیا جائے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگون سے چند باتون پر بیعت لی جن مین ایک بات یہ تھی،

لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَیْئًا، تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا،

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر اُن کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہین کرتے تھے،

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپنے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہین دی، پھر فرمایا کہ اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کروؓ صالحین کی تخصیص غالبًا اسی لئے کی گئی ہے کہ یہ لوگ با عزت طریق پر سوال پورا کرین گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دین گے،

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لئے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے، جس کے مقابلہ مین ساری نعمتیں اور دولتین ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہین کرتا، وہ کسی کے سامنے نہین جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لئے ہے، اور اس کی عطا سے رسول کے لئے ہے، اور اس کے واسطے سے مسلمانون کے لئے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے، اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ

لہ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف مین یہ کل حدیثین ہین،

چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہین، تو یہ کہہ کر کہ اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہین کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو" گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لئے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہئے،

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہین جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ تزک واحتشام تکلف وتصنع اور جاہ وحشم کی نمایش کا نام نہین، بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اتنا اونچا کردے کہ اگر وہ غریب ومفلس اور کمزور بھی ہو، تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ مین سربلند رہے، اور اگر وہ صاحب امارت حکومت ہو تو اپنے رعب ودبدبہ کے لئے ظاہری نمایشی چیزون کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیون سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جارہے تھے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابوعبیدہؓ کچھ مسلمانون کو لے کر استقبال کو نکلے، جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہان کچھ پانی تھا، تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤن سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لئے، اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی مین گھسے، اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیون کے مقدس شہر مین داخل ہونے کے لئے بڑھا، حضرت ابوعبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہین کہ موزے اتار کر اپنے کاندھے پر ڈال لئے ہین، اونٹنی کی نکیل آپ

کے ہاتھ مین ہے، اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اُس کو پانی مین لے چل رہے ہین، یہ وہ موقع ہے کہ سارا شہر آپکے دیکھنے کو اُمنڈ آیا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوعبیدہؓ! اگر تمھارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو مین اس کو سزا دے کر اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عبرت بناتا، ہم سب ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی، تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے، اُس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہین گے تو خدا ہمین ذلیل کرے گا،[1]

---

[1] مستدرک حاکم جلد اوّل ص ۶۲ کتاب الایمان علی شرط الصحیحین،

شجاعت اور بہادری

قَدِیر (قدرت والا) قَادِر، مُقتَدِر، قَوِی، جَبّار (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قَاہِر (جو ہر کوئی کو دبا دے) غالب اور عزیز اللہ تعالیٰ کے کمالی اوصاف ہیں، جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے،

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیرووں میں شجاعت بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگوں میں یہ خیال پیدا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم وستم اور خونریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لئے مٹانے کے قابل ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے، اس لئے تعلیم محمدی نے بہادری وشجاعت کو سراہا، اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لئے کام میں لانا چاہئے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں، اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد

کامیاب ہو سکے،

اُن مسلمانون کی جو سختیون اور مصیبتون کا بہادرانہ مقابلہ کرین، اور لڑائیون مین داد مردانگی دین، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہی

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی
وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰۗىِٕكَ	کے وقت ثابت قدم رہین، وہی لوگ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰۗىِٕكَ	ہین جو سچے ہوئے، اور وہی متقی
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (بقرہ ۲۲)	ہین،

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اُس مین ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہی، جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے مین مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو، وہ زبان سے کہے یا نہ کہے اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت مین اپنی جان تک کی بازی لگا دے، اور جب وہ ایسا کر گذرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر مین راست باز اور سچا ٹھرتا ہے، اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے، ایک اور موقع پر مسلمانون کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے،

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ	اے ایمان والو جب تم کافرون سے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ	میدان جنگ مین مقابل ہو تو اُن
الْاَدْبَارَ (انفال ۲)	کو پیٹھ مت دو،

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے، تو ایمان والون کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ مین پیٹھ پھیر کر

بزدلی نہ دکھائین، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان مین قدم جمائے ڈٹے رہین، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو "ایمان والے" کہکر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی "ایمان" مسلمانون کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدائے تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا،

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ	اور جو ان کو اس دن پیٹھ دے گا، مگر
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا	یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو، یا کسی
اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ	(مسلمان) دستہ سے جا ملنا ہو، تو وہ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ	اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کا ٹھکانا
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (انفال-۲)	دوزخ ہی، اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہی

یہ تو سلبی تعلیم تھی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ مین پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لئے ایجابی حکم دیتا ہی،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ	اے ایمان والو جب تم کسی دستہ سے
فِئَةً فَاثْبُتُوْا، (انفال-۲)	مقابل ہو تو ثابت قدم رہو،

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم مین سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے،

مسلمانون کی تعریف مین فرمایا کہ وہ کافرون کی قوت کو کبھی خاطر مین نہین لاتے،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح-۴)	وہ کافرون پر زور آور ہین،

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زورآور، زورمند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے،

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور اُن کے لئے تم سے جو ہو سکے، یعنی
مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ	زور و قوّت اور گھوڑے باندھنا تیار
تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ	رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور
عَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ	اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنھیں
لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ	تم نہیں جانتے، اللہ جانتا ہے، مرعوب
(انفال - ۸)	کرو،

"قوّت" کے لفظ کی تفسیر اُس زمانہ کے سامانِ جنگ و قتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی، مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ معنی مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے، اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے[1] غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے، اور اُن کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن اُن کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ ہیں، اور اُن سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمّت نہ کر سکیں،

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی بُرائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ

---

[1] تفسیر طبری آیت مذکور،

کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی، متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحیِ الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا،

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ	گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے
وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ (انفال-۱)	ہیں، اور وہ دیکھ رہے ہیں،

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے،

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ	جب ڈر کا وقت آئے تو اُن کو تو
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ	دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں
اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ	اُن کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے
مِنَ الْمَوْتِ، (احزاب-۲)	کسی پر موت کی غشی آجائے،

سورۂ محمد میں اُن کے دل کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے،

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ	جب اُتری کوئی ثابت سورت اور
وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ	مذکور ہو، اس میں لڑائی تو تو اُن کو
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	جن کے دلوں میں روگ ہے، دیکھے گا
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ	کہ تکتے ہیں تیری طرف جیسے ٹک ٹکی
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ	لگانے، وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے،
(محمد-۳)	سو خرابی ہو اُن کی،

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا،

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ	اور جب تو انھیں دیکھے، تو اُن کے
وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ	بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو
كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ	اُن کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی
يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ	کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں، جو کوئی
(منافقون - ۱)	چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی،

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں تو اُن کے بدن بڑے سجیلے اور گھٹے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرہ کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے، دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں، مگر چونکہ اُن کی جڑیں مضبوط نہیں، اسلئے ذرہ ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آرہتے ہیں،

اسلام اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، گو اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اُس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے، اسی لئے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اُڑایا ہے کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی روح سے خالی ہے، اس لئے اُن میں شجاعت اور بہادری نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر

رکھی ہو جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں،

۱- جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اُس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اس لیے تعداد کی قلت وکثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیے،

۲- ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا،

۳- خدا کی راہ میں مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے، اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا، وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے،

تعداد کی قلت وکثرت

تعداد کی قلت وکثرت پر جدّوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے، کامیابی وناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدّوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر منحصر ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے، اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے،

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی
كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ-۳۳)	فوج پر غالب آگیا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو اُن سے نہیں لڑیں گے، اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۞ (مائدہ-۴) اس میں تو

ایک زبردست قوم بستی ہے،" اس وقت اُن کی اُمّت کے دو مسلمان اُن کو سمجھاتے ہیں،

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس
وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ	جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو، اور اللہ
مُّؤْمِنِيْنَ ○ (مائدہ ۴-۷)	پر بھروسہ کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو"

بدر اور اُحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا،

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا،
شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ	اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان
مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (انفال ۲-)	والوں کے ساتھ ہے،
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ	کر، بیشک، اللہ توکل کرنے والوں
اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ	کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد
لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا	کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا،"
الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ	اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا، تو اس کے بعد
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ	کون تمہاری مدد کرے گا، اور مومنوں کو
(اٰل عمران - ۱۷)	چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں،

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے،

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف
اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ (انفال)	سے، بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ اس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لئے خوشخبری سنا دی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے، ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے،

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ	اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق
عَلَی الْقِتَالِ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ	دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر
عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا	(ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر
مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ	غالب ہوں، اور اگر تم میں سے سو
یَّغْلِبُوْآ اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں
بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ (انفال)	کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے،

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کے شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتا دی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے، اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں،

اس کے بعد اس آزمایش کی سختی میں تھوڑی سی نرمی کر دی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ

کرے، اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں،

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں
يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ	تو دو سو پر غالب ہوں، اور اگر تم
أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ	سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝	غالب ہوں، اور اللہ صابروں کے
(انفال - ۹)	ساتھ ہے،

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین وایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا، اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسا رکھتا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے، جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا	ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا)
الرُّعْبَ ۝ (آل عمران - ۱۶)	رعب ڈال دیں گے،
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا	میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا)
الرُّعْبَ ۝ (انفال - ۲)	رعب ڈال دوں گا،

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا، مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دیے

پر مجبور ہوئے،

وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ	اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب
(احزاب - ۳)	ڈال دیا،
وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الرُّعْبَ	اور اُن کے دلون مین اللہ نے رعب
(حشر - ۱)	ڈال دیا،

اور جب تک مسلمانون مین ایمان کی یہ قوّت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہیگا،

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے، جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے، نہ بلائے آسکتا ہے، اس لئے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہین ہے،

وحیِ محمدی نے مسلمانون کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہان تک کہ یہ چیز مسلمانون کی رگ رگ مین سرایت کر گئی ہے، غزوہ اُحد مین مسلمانون کے پاؤن اکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی، اور اس عقیدہ کو یاد دلایا،

وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ	اور کسی جان کے بس مین نہین کہ اللہ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا	کے حکم کے سوا وہ مر سکے، لکھا ہوا وقت
(اٰلِ عمران - ۱۵)	مقرر ہے،

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیون ہو، اور اس سے بزدلی کیون چھائے، جنگِ احزاب مین جب منافقون کو گھبراہٹ ہوئی تو

خدانے فرمایا،

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ	(اے پیغمبران سے) کہہ کہ اگر تم موت سے
فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ	یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا
(احزاب-۲)	تم کو کام نہ آئے گا،

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی مین شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے؛ جن کی قسمت مین یہان موت لکھی تھی، وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے، فرمایا

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ	(اے پیغمبران سے) کہدے کہ اگر تم
لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ	اپنے گھرون مین ہوتے تو بھی جن کا
الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ	مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے
(آلِ عمران-١٦)	اپنے پڑاو پر آجاتے،

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی مین شریک ہوئے اس لئے مارے گئے، یون بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ مین ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانون سے کہا گیا کہ تم کافرون جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہین،

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا	اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے
وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ	پاس ہوتے تو نہ مرتے، اور نہ مارے
حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط وَاللّٰهُ	جاتے، (اور یہ خیال اس لئے اُن کے
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ط	دل مین آتا ہے) تاکہ اللہ اُن کے اس

(آل عمران - ۱۷) — خیال کو اُن کی دلی حسرت بنائے، (ور واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جِلاتا اور

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اُن کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہوں، تو ٹال لیں،

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ (آل عمران ۱۷)

اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو،

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، اُن کے خطرہ کا ذکر کر کے اُن کی تشفی کی گئی،

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ٥ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ

پھر جب اُن کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں اُن میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگے، جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ ہم کو تھوڑے دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگار کے لئے بہتر ہے، اور تمہارا حق ذرا بھی

فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ (نساء - ۱۱)

وہ پایا نہ جائے گا، جہان تم ہوگے، موت تم کو پالے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعون مین ہو۔

غرض کہین بھی تم جا کر رہو، موت سے چھٹکارا نہین، پھر میدان جنگ سے تم کیون گھبراو، بلکہ اُن مجاہدون کی طرح ہو جن کا ایمان جہاد کا نام سُن کر اور تازہ ہو جاتا ہے،

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ ۔ (آل عمران - ۱۸)

وہ جن سے لوگون نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لئے لوگون نے بڑا سامان کیا ہے، سو تم اُن سے خوف کرو، تو اُس نے اُن کے ایمان کو اور بڑھا دیا اور بول اُٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے، اور وہ کیا اچھا کارساز ہے،

شہادت اور غزا کا رتبہ | میدان جہاد مین شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی، وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع و قمع کر دیا ہے، اسکی تعلیم ہے کہ مجاہدون کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ مین بکا ہوا ہے، اور وہان انکے لئے وہ کچھ مہیا ہے، جس کے سامنے یہان کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ

اللہ نے مسلمانون سے اُن کی جانون کو اور مالون کو اس قیمت پر خرید لیا ہے

الجنة يقاتلون في سبيل
الله فيقتلون ويقتلون،
(توبہ - ۱۴)

کہ اُن کے لئے جنت ہے، اللہ کی راہ
مین لڑتے ہین، پھر مارتے ہین اور
مارے جاتے ہین،

اس سے پہلے سورۂ نسار مین اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لئے دنیا کا سودا کر چکے ہین،
اعلان ہے،

فليقاتل في سبيل الله الذين
يشرون الحيوة الدنيا بالآخرة
ومن يقاتل في سبيل الله
فيقتل او يغلب فسوف نؤتيه
اجرا عظيما ۰ (نساء - ۱۰)

تو جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے
ہین، وہ اللہ کی راہ مین لڑین اور
جو اللہ کی راہ مین لڑے پھر مارا جائے
یا وہ غالب ہو، تو ہم اس کو بڑی مزدوری
دین گے،

اُن کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائین گے،

فالذين هاجروا واخرجوا
من ديارهم واوذوا في
سبيلي وقاتلوا وقتلوا
لاكفرن عنهم سيأتهم
ولادخلنهم جنت الآية (آل عمران - ۲۰)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور
اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور میری
راہ مین ستائے گئے، اور لڑے اور مارے
گئے اُتار دون گا اُن سے اُن کی برائیان
اور داخل کرون گا، اُن کو جنت مین

شہیدون نے اس راہ مین اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ اُن کی زندگی تھی

وہ اُن کو از سر نو اسی وقت دے دی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیالِ باطل کو کہ شہید مر جاتے ہیں، ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور کہہ دیا گیا کہ اُن کو مردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا	اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے اُن کو
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ	مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے
اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ	رب پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ	اُن کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے
فَضْلِهٖ (آل عمران-۱۷)	خوش ہیں،

اُن کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے، پھر بھی اُن کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ	اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں
سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ	اُن کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں لیکن
وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ-۱۹)	تم کو اس کی خبر نہیں،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات اُن ہی کے لیے ہیں جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہوں، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و نیت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک

نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کردی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی، فرمایا،

تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سو اللہ
فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذٰلِكَ	کے پاس بڑا مال غنیمت ہے، تم (اسلام
كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ	سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے تم
عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا، (نساء ۴ - ۱۳)	پر فضل کیا، (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کرو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت کو لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے، تو آپ نے اُن سب کا مشترک جواب دیا،

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کیلئے
اَعْلٰی فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ[1]	لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص سے قیامت کے دن اُس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا، تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا، اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ، سو تم اپنا اجر پا چکے، اور دنیا میں تم کو بہادر

[1] صحیح مسلم وصحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فہو فی سبیل اللہ،
[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار، وجامع ترمذی،

کہا جا چکا" غرض جس شجاعت کا مقصود اصلی ریا و نمایش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے لیکن اگر جہاد میں اعلاے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے[1] کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے،

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اتر آئے[2]" کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے، اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا، اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا "لو میں ابن اکوع ہوں" حافظ ابن حجر اس فقرہ کی شرح میں لکھتے ہیں،

"یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ حالت کا اقتضا یہی تھا، اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے، جو لڑائی میں جائز ہے، اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں[3]"

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا، تو آپ نے عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا،

انا النبی لا کذب انا ابن ... میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں

---

[1] فتح الباری جلد ۶ ص ۲۲، شرح حدیث مذکور [2] ابوداؤد کتاب الجہاد، باب فی الخیلاء فی الحرب

[3] فتح الباری جلد ۶ ص ۱۱۴،

عبد المطلب، عبد المطلب کا بیٹا ہون،

یعنی مین سچا پیغمبر ہون، اس لیے میدان سے نہ بھاگون گا، نہ ہٹون گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیرون کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہین فرمائی،[1]

صحابہ کہتے ہین کہ ہم مین سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا،[2] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بہادر تھے، ایک بار اہلِ مدینہ کے دلون مین کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو اُدھر بڑھا، وہ خود سرورِ کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ تھے، آپ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے، اور واپس آکر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہین"[3] ایک موقع پر جب بدویون نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا، اور بزدل نہ پاؤ گے"[4] بزدلی اسلام مین ایسا سخت اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤن مین جن چیزون سے پناہ مانگی ہے اُن مین بزدلی بھی ہے، چنانچہ روایت مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے، دوسری روایت مین ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد ان چیزون سے پناہ مانگتے تھے،[5] ایک روایت

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین وکتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] صحیح مسلم باب غزوۂ حنین [3] صحیح بخاری کتاب الجہاد وکتاب الحمائل وتعلیق السیف بالعنق [4] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب الجبن [5] بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن،

میں ہو کہ انسان میں سب سے بڑی بد اخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے،[1]

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو[2] اسی خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے

وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ[3]، یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأۃ والجبن [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [3] ایضاً باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف وباب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال ۱۲،

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے" کے ہیں، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں، مخالفین ہوں تنہا ہا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے، اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے کہ

أَنَّمَآ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ	تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اسی
فَاسْتَقِيمُوٓا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ	کی طرف سیدھے رہو، اور اس سے
(حٰمٓ السجدۃ ۔۱)	گناہ بخشواؤ،

یعنی ہماری عبادتیں، اُسی ایک کے لئے ہوں، اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھیوں کو

حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو نہ راہ سے بھکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو،

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا	تجھ کو حکم ہوا، اور جس نے توبہ کی تیرے
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ،	ساتھ، اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ)
(هُوْد - ۱۰)	تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے،

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ہے، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے، اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسولِ اسلام علیہ السلام اور آپکے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق، اور حق پر استقامت کی تاکید پر تاکید ہورہی ہے، ارشاد ہوتا ہے، اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو، اور ثابت قدمی دکھاؤ، اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو،

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ	پس اسی کی طرف بلا، اور قائم رہ جیسا کہ
كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ	تجھے فرمادیا، اور اُن کی خواہشوں کے
اَهْوَآءَهُمْ (شورٰی - ۲)	پیچھے نہ چل،

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے، یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لئے ہے، وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا، اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا،

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (احقاف-۲)

بے شک جنھون نے کہا، ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر اجمے رہے، تو نہ ڈر ہے۔ اُن کو، اور نہ وہ غم کھائین گے،

اُس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہون گے، اُن کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہان حاصل تھا، وہان تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدمون کے کانون مین اُن کی استقامت کی مزدوری مین فرشتون کی بشارت سنائی دے گی،

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (حٰم السجدہ-۴)

بے شک جنھون نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جمے رہے، اُن پر فرشتے اترتے ہین کہ خوف اور غم نہ کھاؤ، اور اس بہشت کی خوشی سنو، جس کا تم سے وعدہ تھا،

ترمذی باب ماجاء فی حفظ اللسان

ان ہی آیتون کی شرح مین اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہین کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے کہ مین اُس سے چمٹ جاؤن، ارشاد ہوا کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ، صحابہؓ نے ان نصیحتون پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کئے، ساڑھے تیرہ سو برس گذر

گئے، مگر اُن پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت اور آفرین کی صدائین بلند ہورہی ہین، خود اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ مین ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہی، فرمایا:

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ (احزاب ۲)

جب کفار کی متحدہ فوجین تمھارے اوپر سے اور تمھارے نیچے سے آئین، اور جب ڈگنے لگین آنکھین اور دل گلے کو آنے لگے، اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہان ایمان والے جانچے گئے، اور خوب جھڑجھڑائے گئے،

اس کے بعد اس موقع پر منافقون نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہو، اس کے بعد ہے:-

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا ۝ (احزاب ۳)

اور جب ایمان والون نے کفار کی ان متحدہ فوجون کو دیکھا، تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا، اللہ اور اس کے رسول نے، اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا، اور اس نے اُن کو یقین اور اطاعت مین اور بڑھا دیا،

اس کے بعد جن مسلمانون نے اس قسم کے خطرون مین اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، اُن کی تعریف فرمائی جاتی ہے،

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والون مین بعض وہ مرد ہین،
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	جنھون نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	اس کو سچ کر دکھایا، تو اُن مین کوئی
يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا	تو اپنا کام پورا کر چکا، اور کوئی ان مین
	وقت کی راہ دیکھ رہا ہے، اور انھون نے
(احزاب - ۳)	ذرا بھی نہین بدلا،

یعنی بعض تو خدا کی راہ مین جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے، اور بعض ابھی زندہ ہین، اُس دن کی راہ تک رہے ہین، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دین گے، اور ان تمام خطرون کے باوجود نہ تو منافقون کی طرح انھون نے اپنے دین وایمان کو بدلا، اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے، اس کو توڑا،

حق کی راہ مین مشکلات کا پیش آنا، اور اس مین مردانِ خدا کی استقامت کی آزمایش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے، اور قائم رہے گا، اور جب تک اس مین کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہین اُترتی کامیابی کا منہ نہین دیکھتی، فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا	کیا تم کو خیال ہے کہ جنت مین چلے جاؤ گے،
الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ	اور ابھی تم پر تم سے پہلون کے احوال

خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ	نہین آئے، اُن کو سختی اور تکلیف
الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا	پہنچتی رہی، اور جھڑ جھڑائے گئے،
حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ	یہان تک کہ رسول اور جو اس کے
اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ	ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۔	کی مدد کب آئے گی، سُن رکھو اللہ
(بقرہ-۲۶)	کی مدد نزدیک ہے،

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا، اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کئے ہین، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے، کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا، اور آخر کامیاب ہوا، اور اس عالم مین اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ	اے ہمارے پروردگار ہم مین ڈالدے
ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤن
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝	اور اس کافر قوم کے مقابلہ مین ہماری
(بقرہ-۳۳)	مدد کر،

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث[1] و سیر مین ہے کہ یمن مین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے، یہودیون نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفین

[1] صحیح مسلم وسیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود،

دین، اور آخر ان کو گڈھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے،

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ،	مارے جائیو کھائیاں کھودنے والے،
النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ، اِذْ هُمْ	آگ بھری ایندھن سے، جب وہ
عَلَيْهَا قُعُوْدٌ، وَّ هُمْ عَلٰى مَا	اس (گڈھے کے منھ) پر بیٹھے تھے،
يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ،	جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ	تھے، دیکھ رہے تھے، اور وہ ان سے
يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔	بدلا نہیں لیتے تھے، مگر اسی کا کہ یہ زبردست
(بروج -۱)	خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے،

اگلوں کی استقامت کے اُن احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا، وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا، اور درخواست کی کہ ہمارے لئے دعا کیجئے، چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ "تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا، اور آرہ سے اُس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا"[1]

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام،

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خباب بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر اُن کو چت لٹا دیا گیا، اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے[1]، حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگدل قریش کے ظلم و ستم کا یہ سکہ اُن کی پیٹھ پر چمک رہا تھا،

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان اُن کے سینہ پر رکھی جاتی گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے، اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اُس وقت بھی اُن کی زبان سے اَحَد اَحَد (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا، حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں، مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی اُن کو اتنی پسند آتی ہے، کہ دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب میں کہا تھا، اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے، فرمایا: چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دیدیں تب بھی میں اس دینِ حق سے باز نہ آؤں گا،

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں

---

[1] ابن سعد جلد ۳ تذکرۂ خبابؓ،

مرجائے یا مارا جائے تو کیا تم اس راستے سے جس پر تم چل رہے ہو، الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں، اس کا ساتھ تم اس لئے دیتے ہو کہ وہ حق ہے،

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ	اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا
أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	اگر وہ مرگیا یا مارا گیا، تو تم الٹے
عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ	پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو الٹے
عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ	پاؤں پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ
شَيْئًا (آل عمران-۱۵)	نہیں بگاڑے گا،

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی، اور صبر وثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے،

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ	اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ
رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا	ہو کر بہت سے خدا والے لوگ
لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں
وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا	کچھ دکھ پڑا تو ہمت نہیں ہارے
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَمَا	اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے
كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا	اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ	کرتا ہے، اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی، اس کو بخش دے، اور ہمارے قدم جمائے رکھ، اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے،
(آل عمران - ۱۵)	

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے، اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے جس کا نام مداومت ہے یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے اُس پر مرتے دم تک مداومت کی جائے اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا :-

إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝	لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں، (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)
(معارج - ۱)	

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے

ہوتی ہے، اسی لئے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کون سا عمل نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے"[1] خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو"[2]

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل،

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدانِ جنگ مین دونون طرف کی مسلح فوجین ایک دوسرے کے مقابل مین ہاتھ پاؤن سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہین، بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے، تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت مین جو آواز بلند کی جاتی ہے، اُسی کا نام حق گوئی ہے،

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستایش سمجھا جاتا ہے جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابلِ ستایش حق گوئی کی تعلیم دی ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے،

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ	پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر
عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ	سنادو، اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو،
الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ	ہم تم کو تمھاری ہنسی اُڑانے والون

مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ، | کے مقابلہ مین جو خدا کے ساتھ دوسرے
(الحجر-۲) | دوسرے معبود قرار دیتے ہین کافی ہین

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گذر گیا، اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آگیا، اس لئے کھُلم کھُلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو، اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائین تو ان کے تمسخر و استہزار کی مطلق پروانہ کرو، بلکہ اُن کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ مین اللہ تعالیٰ بس ہے،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمین ہین، ایک خوف تو تہمت ملامت کا ہے جس کو اس آیت مین بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت مین اس کو مسلمانون کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ، | اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی
(مائدہ-۸) | ملامت سے نہین ڈرین گے،

یعنی اہلِ ایمان حق کے اظہار مین لوگون کے لعن وطعن کی پروانہین کرتے،

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزون کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل مین ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے، ایک حدیث مین ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا "کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہئے کہ انسانون کا خوف مانع نہ ہو" ایک بار آپ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے، صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم مین

کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے مین ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو، اور وہ نہ کہے، ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلان فلان بات کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ کہے گا کہ انسانون کا خوف ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا،

انسانون کے مختلف گروہون مین سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہون کی ہوتی ہے، اس لئے اُن کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا،

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر،	بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے،

دوسری روایت مین "کلمۃ حق" کا لفظ ہے،

اسلام مین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہین، اُن مین دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا، اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سُنّت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا، حالانکہ آج منبر نہین نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہین دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مین نے سُنا ہے کہ تم مین جو شخص بُرائی دیکھے، اور اُس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔[۱]

[۱] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر مین یہ تمام حدیثین مذکور ہین، ۱۲

صحابہ مین حضرت ابوذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی مین بدرجۂ کمال تھا، یہ وہی تھے جنھون نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار قریش کے بھرے مجمع مین حرم مین جاکر توحید کا نعرہ بلند کیا، اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوئے، جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہوگئے، لیکن اُس پر بھی اُن کا نشہ نہین اُترا، اور دوسرے دن پھر جاکر اعلان حق کیا، اور وہی سزا پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی مدح مین فرمایا کہ "آسمان کے نیچے، اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حقگو گوئی نہین[1]" چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین وہ جب شام مین تھے، تو وہان کے مسلمانون مین سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہورہی تھی، اس پر انھون نے بے محابا دار وگیر کی، اور اس مین امیر معاویہ کی پروا انھون نے ذرہ بھی نہین کی،

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس مین فرمایا، "ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے، جو تم کو معلوم ہو" یہ سُن کر حضرت ابو سعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتین دیکھین، اور ہیبت مین آگئے،[2]

[1] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ، [2] ترغیب ترہیب منذری، باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی،

استغناء

استغناء کے معنی بے نیازی کے ہیں، اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے،

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ،	اور جو انکار کرے (یعنی نعمت کی ناشکری کرے، (اور حج کو نہ جائے)
(آلِ عمران - ۱۰)	تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے،

اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے، اور ساری دنیا اُس کی محتاج ہے،

وَاللهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ، (محمد - ۴) اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اُس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو، اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا، اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے،

اوّل یہ کہ جو کچھ ملتا ہے، اُس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے، قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت مین دہراتے ہین، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے،

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، (فاتحہ)	(اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہین، اور تجھی سے مدد مانگتے ہین،

خدانے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر اُن کے مضطرب دلون کو تسکین دی ہے، فرمایا،

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، (آل عمران ۱۸)	اور کیسا اچھا کارساز،
وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (اسرائیل ۷)	اور تیرا رب کارساز بس ہے،
اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا، (اسرائیل)	میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ،
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ٥ (نساء-۱۱)	اور اللہ کارساز بس ہے،

ایک آیت مین اللہ تعالیٰ اپنے بندون سے پوچھتا ہے، اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر) کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں، اس لئے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہین،

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملتا ہے اس پر طمانیت حاصل کی جائے اور نہ زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ	اور جس چیز مین اللہ نے ایک کو دوسرے

بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (نساء۔۵) | پر بڑائی دی، اس کی ہوس مت کرو،

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا | اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو

مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْہُمْ | ہم نے اُن میں سے طرح طرح کے لوگوں

(طٰہٰ۔۸) | کو سامان دیا ہے،

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے اُن کی نیت نہیں بھرتی، اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لئے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولتمند نہیں ہوتا، تاہم خدا نے جو کچھ اس کو دیا ہے، اس پر قانع رہتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لئے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے، اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے،

لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ | دولت مندی مال و اسباب کی کثرت

وَلٰکِنَّ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ، | کا نام نہیں ہے، بلکہ اصلی دولت مندی

(بخاری، رقاق، باب الغنی غنی النفس) | دل کی بے نیازی ہی،

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدی نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے "تونگری بدل است بمال" ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا، حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوذر! تمھارے خیال میں مال کی کثرت

کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا "تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا بے نیازی دل کی بے نیازی ہے، اور محتاجی دل کی محتاجی ہے[1] اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے، یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی، اور اُن سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے، اگر تم اُس پر راضی ہو جاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے[2] ایک بار چند انصار نے آپ سے مال کا سوال کیا، اور آپ نے اُن کا سوال پورا کیا لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے، اور پھر سوال کیا، اور آپ نے پھر اُن کا سوال پورا کیا جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے، خدا اس کو خوددار بناتا ہے، اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے[3] اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپ سے بار بار مال کا سوال کیا، اور آپ نے ہر بار اُن کا سوال پورا کیا، لیکن اخیر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے، خدا اس میں برکت دیتا ہے، اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے، اس میں برکت نہیں ہوتی، اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے، جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا،[4]

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس [2] فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۳۳ [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف،

اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھون نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہین قبول کیا،[۱]

فضالہ بن عبید رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی، اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے، اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے،[۲] حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہین کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانون سے بے نیاز ہو جانا ہے،[۳]

۱؎ ترمذی کتاب الزہد ۲؎ زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ ۳؎ مستدرک حاکم ج ۴ صفحہ ۳۵۲ کتاب الرقاق،

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل یعنی بُری خصلتیں، وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اُس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں جن کی بُرائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے، اور جن کے بدولت انسانی افراد، اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں، اور اُن کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں، تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اُس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود، اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے،

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر اُن کو مُنکَر (ناآشنا) اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فاحشۃ (فحش) سیّئۃ (برا) سُوٓء (برائی) مکروہ (ناپسندیدہ) خطاء (ناصواب یا بھول) اِثمٌ (گناہ) عُدوان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے

متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا،

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ	اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت ما
اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ	ڈالو، ہم ہیں اُن کو اور تم کو روزی پہنچاتے
اِيَّاكُمْ ط اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ	بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے
خِطْاً كَبِيْرًا، وَلَا تَقْرَبُوا	اور زنا کے پاس مت جاؤ، بے شبہ بے
الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ	حیائی اور بری راہ ہے، ....
سَبِيْلًا	....
وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو زمین کو
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ	پھاڑ ڈالے گا، اور نہ لمبائی میں پہاڑ
لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا كُلُّ	کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری
ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ	بات ہے، وہ تیرے پروردگار کے نزدیک
رَبِّكَ مَكْرُوْهًا (بنی اسرائیل ۔۴)	ناپسندیدہ ہے،

رذائل کے لئے قرآنِ پاک کا سب سے عام لفظ مُنکَر ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے اُن کو ایک ہی لفظ مُنکر سے ادا کیا گیا ہے.

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ	وہ ایک دوسرے کو اُس منکر سے

فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ   جو کرتے تھے روکتے نہ تھے، کیا برا کام

(مائدہ ۱۱)   ہے جو وہ کرتے تھے،

ایک بدکار قوم کی برائیاں گنائی جا رہی ہیں، اس سلسلہ میں ہے،

وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ،   اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب

(عنکبوت ۳)   ہوتے ہو،

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے،

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ ۱۴)   اور منکر سے منع کرنے والے،

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران و توبہ)   اور منکر سے منع کرتے ہیں،

اور کہیں فحشاء اور منکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے،

فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، (نور ۳)   وہ فحشاء اور منکر کرنے کو کہتا ہے،

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ، (عنکبوت ۵)   وہ فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے،

فحشاء، منکر اور بغی کہیں آیت میں تینوں لفظ جمع ہیں، فحشاء، منکر اور بغی،

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ   (نحل ۱۳) اللہ انصاف اور احسان

الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِی   کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا

الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ   حکم دیتا ہے، اور فحشاء، اور منکر اور بغی

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ   سے منع فرماتا ہے، تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے

تَذَکَّرُوْنَ ۝ (نحل-۱۳)　　　　　　　　　تاکہ تم خیال رکھو،

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہو کہ
مین پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیا رسے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل مین جگہ
نہین پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل مین جگہ پکڑ لی[۱]،
حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہو کہ قرآن مجید مین خیر وشر کی سبسے زیادہ جامع آیت یہی ہو[۲]،
قتادہ کہتے ہین کہ زمانہ جاہلیت مین جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا، اور وہ پسند کیے جاتے
تھے، اُن مین کوئی خلق ایسا نہین ہے، جس کا خدا نے اس آیت مین حکم نہ دیا ہو، اور کوئی
بداخلاقی ایسی نہین ہے، جس کی اس آیت مین ممانعت نہ کی ہو[۳]،
اس آیت مین منہیات کے سلسلہ مین تین لفظ آئے ہین، فَحْشَاءَ اور مُنکر اور بغی، ان
مین سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہو،

فحشاء کے معنی | ان مین پہلا لفظ فَحْشَاءَ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَۃٌ کی ہے، یہ لفظ
فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہین[۴] اور اس کے دوسرے
لازمی معنی قبح یعنی بُرائی کے ہین، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے،
اُس سے آگے بڑھنا قبح یعنی بُرائی ہے، یا یہ کہ جو بُرائی حد سے زیادہ ہو جائے، وہی
فحشاء کہلاتی ہے، قرآنِ پاک نے گناہ کے معنی مین حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز

---

[۱] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ [۲] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ وابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور،
[۳] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور، [۴] الصحاح للجوہری لفظ فحش، و لسان العرب لفظ فاحش زیر فحش،

کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لئے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے، وہ تعدیِ حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی
حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ	اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انھیں ملامت
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى	نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے
الْعٰدُوْنَ ۝ (مومنون - ۱)	والے ہیں،

اسی لئے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے، اور اس کے معنی ہی امرِ قبیح کے ہو گئے ہیں قرآن نے کہا ہے،

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ	اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ، کیونکہ یہ
فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا ،	"فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بری
(اسرائیل - ۴)	راہ ہے،

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے،

منکر کے معنی دوسرا لفظ "منکر" ہے، اس کے لغوی معنی ناآشنا سا کے ہیں مطلب یہ ہے کہ

جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے، اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لئے اس کو مَعْرُوْف (شناسا) کہتے ہیں، اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے، اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے، وہ مُنْکَر (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں، قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ (حجر و ذاریات) یعنی لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب اُن کے بھائی آئے تو انھوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے، فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف-۷) یعنی یوسف نے تو اُن کو پہچان لیا، مگر وہ اُن کو پہچان نہ سکے،

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے، اور اس کے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی مُنْکَر ہے، فرمایا،

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا	اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی
بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ	ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں
الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ	کے چہروں میں تو مُنکر (بگڑی ہوئی
يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ	شکل) پہچانے گا، نزدیک ہوتے
يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا	ہیں کہ وہ اُن پر جو ہماری آیتیں
(حج-۹)	سناتے ہیں، حملہ کر بیٹھیں،

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے، اُس کو مُنکر

کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بداہۃً ناپسند کرتا ہے، اور اُن کی برائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اُس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب وملت اور ہر اچھے تمدن وتہذیب میں وہ یکساں برے سمجھے جاتے ہیں،

بغی کے معنی تیسرا لفظ بغی ہے جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں،

خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (ص - ۲) — ہم دو جھگڑنے والے ہیں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے،

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے، تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں،

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ، (شورٰی ۳) — اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لئے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں،

اسی سورہ میں ہے :۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (شوریٰ - ۴) — راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں،

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں،

اخلاقِ ذمیمہ برے کیوں ہیں اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین ہیں یعنی فحشاء، منکر اور بغی

مین منحصر ہین، صفاتِ ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہین، اور ایسی باتین ہین جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہین، اور اُن کے جائز کر دینے سے دوسرون کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے،

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہی،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ	اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگار
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ	نے بُرائی کے سارے کامون (فواحش)
الْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ،	کو جو کھلے ہون یا چھپے، اور گناہ کو اور
(اعراف - ۴)	ناحق زیادتی کو منع کیا ہے،

اس آیت مین بھی رذائل کو تین لفظون مین منحصر کیا ہی، ایک فواحش یعنی بُرائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہون یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام، اور تیسری ناحق زیادتی، اُن اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکسان بُرا کہا ہی، اگر تحلیل کیجائے، تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت بُرائی اور بے حیائی کے کام ہین، اور دین و شرافت کی نگاہ مین گناہ اور ناپسندیدہ ہین اور اگر اُن کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے، اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔[1]

[1] منطقی اصطلاح مین ختم؟ ... ؟ مانعۃ الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی مین ان تینون کا اجتماع تو ہوسکتا ہے، مگر کوئی بداخلاقی ان تینون مین سے کسی ایک سے خالی نہین رہ سکتی، یعنی ہر بداخلاقی مین تینون کا یا تینون مین سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

رذائل کی ترتیب | ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ
کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فحشاء پھر منکر، پھر بغی،

فحشاء میں جس برائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ، منکر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی، اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک وملت کو چھا لیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ،

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی، دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں، اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں،

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ مین سبے زیادہ بری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے، یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے، کہ وہ واقعہ کے مطابق ہون، اور جھوٹ ٹھیک اس کے ضد ہے، اس لئے یہ بُرائی ہر قسم کی قولی اور عملی برائیون کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہین جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا، یا باور کرسکتا ہے، تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے، اب اگر وہ اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہین ظاہر کرتا، بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے، تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص مین دنیا کی جو برائیان بھی نہ ہون وہ کم ہے، کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے جس مین حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے،

اسی لئے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبرون کے لئے یہ صفت

کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ	اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر،
إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا (مریم ۴)	وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا،

اسی لئے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہوسکتا کیونکہ پھر ایسے کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا، اور اُس نے اُس کے ماننے سے انکار کیا، تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا فرعون کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوت پر اُن کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی، اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہوسکتا،

إِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ	اگر یہ جھوٹا ہوگا تو اس کا جھوٹ اسی
وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ	پر پڑے گا، اور اگر سچا ہوگا تو تم پر
بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ	پڑے گا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے
اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ	بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا
كَذَّابٌ، (مومن ۴)	جو بے باک جھوٹا ہو،

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعیِ نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گذرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے، انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں، روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے

کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا؟ ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندوں پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ باندھے گا؟[1] یہ نہیں ہوسکتا،

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے،

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ	شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار
يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ	پر، لا ڈالتے ہیں سنی بات، اور بہت
كَاذِبُونَ، (شعراء-۱۱)	ان میں جھوٹے ہیں،

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے، اسی لئے جو جھوٹا ہوتا ہے، اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے،

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ	بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا
كَاذِبٌ كَفَّارٌ، (زمر-۱)	جو جھوٹا ہو احسان نہیں مانتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے، اور وہ گناہ دوزخ میں، اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے"[2] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں لیجانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے، تو نیکی کا کام کرتا ہے اور جو

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ، ج ۲

نیکی کا کام کرتا ہے وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے، اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا، اُس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا، تو گناہ کے کام کرے گا اور جب گناہ کے کام کریگا تو کفر کریگا، اور جو کفر کریگا دوزخ میں جائے گا" (مسند احمد اول ص ۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی بُرائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے، جس سے زیادہ بڑی چیز کوئی دوسری نہیں، اور جس کے لئے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرّہ ذرّہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے، مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے، جس کا منہ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے،

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے، لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے، لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا، جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۹) ترمذی باب ماجاء فی الصدق والکذب وابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو، اس پر خدا کی لعنت ہو،

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ	پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (آل عمران ۶۔)	لعنت بھیجیں،

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ	اس پر اللہ کی لعنت ہو، اگر وہ
مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (نور۔۱)	جھوٹوں میں سے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بڑی چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بد دعا کا مستحق ہوتا ہے،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بنجائے، حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہو،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا	بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے
مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ	ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان اس
بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ	کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو لوگوں
اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ	کے لئے کھولکر کہدیا ہو ان پر اللہ لعنت
اللّٰعِنُوْنَ ۝ (بقرہ ۔ ۱۹)	بھیجتا اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے، کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں، اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لئے وہ جھوٹ کے گو قائل نہیں لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں،

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لئے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا، چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا،

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون - ۱)	اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں،

اسی لئے آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے، فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے[1]، لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں، لیکن حقیقت میں ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا، تو جھوٹ ہے ہی، مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے، وہ گویا اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا، اور جب اس نے اُس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا،

جھوٹ اکیلی بُرائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری بُرائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قول تعالیٰ وکونوا مع الصادقین وما ینھی عن الکذب،

بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے

اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ، (شعراء-۱۱)	جھوٹ بولنے والا گنہگار،
كَذِبٌ كَفَّارٌ، (زمر-۱)	جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا،
مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (مومن-۴)	بے باک جھوٹا،

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گنہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپا لوں گا، اس لئے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے، وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا، اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے، اس کو کسی برے سے برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے،

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو، لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے، کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے،

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ	اس لئے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا
وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ،	اس کے خلاف کیا، اور اس لئے کہ
(توبہ-۱۰)	جھوٹ بولتے تھے،

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلون مین نفاق نے جگہ پکڑ لی، قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے، اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہی،

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِاسْتَطَعْنَا	اور وہ قسم کھائین گے کہ ہم کو مقدور
لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ	ہوتا تو ہم تمھارے ساتھ لڑائی مین
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ	چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت مین
	ڈالتے ہین، اور اللہ کو معلوم ہے کہ
(توبہ ۶۰)	وہ جھوٹے ہین،

سورۂ احزاب مین اللہ تعالیٰ نے اُن صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنھون نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا، اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے اُن کو منافق کا خطاب دیا ہی فرمایا،

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ	تاکہ اللہ سچون کو اُن کی سچائی کے
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	سبب سے اجر دے، اور منافقون کو
الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ	سزا دے، اگر چاہے یا اُن پر رجوع
يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ (احزاب ۳)	ہو، (یعنی مسلمان ہو جائین تو معاف کر دے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے فرمایا،

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (علق ۱)	جھوٹی خطا کار پیشانی،

ہر چند کہ اس کو استعارۃً کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنگ کا ٹیکا ہے، جو مٹ

نہین سکتا،

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہین ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے،

قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ	انھون نے کہا اگر ہم جانین کہ لڑائی
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ	ہوگی، تو ہم بھی تمھارے ساتھ چلین،
مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ	وہ اس وقت ایمان سے زیادہ
بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ	کفر سے قریب ہین، وہ منھ سے وہ
قُلُوْبِهِمْ (آل عمران-۱۷)	کہتے ہین، جو ان کے دل مین نہین،

دل کے اُن بیمارون کے متعلق جو مسلمانون اور یہودیون دونون کو خوش رکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانون کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ	یہ وہ ہین جن کے دل کا حال اللہ
مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ، (نساء-۹)	جانتا ہے،

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہین ہے یا اپنے مین وہ باور کرانا چاہے جو اس مین نہین ہے، جھوٹا ہے، ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری ایک ڈوسن (سوتن) ہے، کیا اگر مین یہ ظاہر کرون کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا، اور واقعہ یہ نہ ہو، صرف اس کو جلانا مدِنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا" جو جتنا نہین دیا گیا، اتنے کا دکھا[15]

کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے[1] حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اُس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہیں دیا، اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا، اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولتمند نہیں وہ دولتمندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں، اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا، درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے، غالباً اسی لئے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے[2]،

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو بُرا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لئے اُن سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے، مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے، ایک کمسن صحابی عبد اللہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے، تو ماں نے میرے بلانے کے لئے کہا کہ یہاں آؤ تجھے کچھ دوں گی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب، [2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر

نے فرمایا تم کیا دینا چاہتی تھی، ماں نے کہا اس کو کھجور دے دون گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتین تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا"[1]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال مین بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہین کرنا چاہئے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر بُرا اثر پڑے گا، وہ بچپن مین جو کچھ دیکھے اور سُنے گا اسی سانچے مین ڈھلے گا، اسی لئے لوگون کو چاہئے کہ بچون سے بھی جھوٹ نہ بولین،

بعض لوگون کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب اُن کو کھانے کے لئے یا کسی اور چیز کے لئے کہا جاتا ہے، تو وہ تصنع اور بناوٹ سے یہ کہدیتے ہین کہ مجھے خواہش نہین، حالانکہ ان کے دل مین اس کی خواہش موجود ہوتی ہے، تو یہ بھی جھوٹ ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم مین سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے، اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہین تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا، ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے[2]

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہین پہنچتا، بلکہ بعض موقعوں پر ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [2] مسند احمد، طبرانی کبیر، مجمع الزوائد ہیثمی ص ۱۰۲ باب فی ذم الکذب

نے فرمایا ہے کہ جو شخص لوگون کے ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے، اس پر افسوس، اس پر افسوس[1]، کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے، اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے،

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتین ہین، اُن کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے اُن کے مدارج مقرر کئے ہین، ایک صورت یہ ہو کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لئے اُس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے، لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان مین مبتلا کر دیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ یہ ایک بہت بڑی خیانت ہو کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو[2]،

اس مین بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگون کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے، اور اُس سے معاشرتی نظام مین خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہو کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے، اور اس کو زور ادر افک وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہین،

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہو کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اور مسلمانون کو حکم دیا ہے:

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [2] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق،

فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ (حج ۴)

بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کے کہنے سے بچتے رہو،

زور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس مین کذب وبہتان وغیرہ سب شامل ہین لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی مین ہو کہ آپنے صحابہ سے فرمایا کہ کیا مین تم لوگون کو سب سے بڑا گناہ بتادون ؟ صحابہؓ نے کہا ہان یارسول اللہ" فرمایا کہ "شرک اور باپ ماں کی نافرمانی" راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً اٹھ بیٹھے، اور کہا کہ جھوٹی شہادت" یا جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے، یہان تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہوجاتے،

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث مین غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہو کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالی کے نزدیک ذکر کے قابل تھی، وہ یہی جھوٹ ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا،

إفک اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہین کسی پر جھوٹ باندھنا مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، اُن کو قرآن نے افک کہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالی نے اسی لفظ "اِفک" سے تعبیر کیا ہے، (نور ۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "افک" بڑے خبیث طینت کا کام ہے، فرمایا،

ملك ادب مفرد للبر والصلة باب ما جاء فی عقوق الوالدین،

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ،	اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ
(الشعراء ع-۱۱)	باندھنے والے پر گنہگار پر،

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ ایک انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلا تحقیق دوسرں سے کہتا پھرے، ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے، اور سوسائٹی میں اس کی بات کی قدر نہیں ہوتی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِبًا اَنْ یُّحَدِّثَ	آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ
بِکُلِّ مَا سَمِعَ، (مقدمہ صحیح مسلم)	کہتا پھرے،

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے، یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:-

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ (مائدہ-۶)	جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں،

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت مین شہادت یعنی گواہی ہے، جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل مین اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت مین خیال کرنا چاہئے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے، اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہین، اور سچائی سے دور ہین، وہ بات بات پر قسم کھاتے ہین، انھین معلوم ہے کہ لوگ اُن کے بیان کو سچا نہین سمجھتے، اس لئے وہ لوگون کو فریب دینے کے لئے جھوٹی قسمین کھاتے ہین،

اوّل تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی برا ہے، پھر جھوٹی قسمین کھانا تو اور بھی بُرا ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین اس قسم کے قسم کھانے، اور قسم کھانے والون کی بہت بُرائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے، جس مین جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لئے کسی آیندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے، تو وہ گنہگار رہتا، اور اس پر کفارہ

لازم آتا ہے کفّارہ یہ ہی کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے، یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا کپڑے پہنائے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے، اور اس کی بھی اجازت دیگئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے[1]۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ	اللہ تم کو تمھاری بے فائدہ قسموں پر نہیں
اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ	پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ	تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے
اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ	کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ	کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے
اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ	ہو، یا اُن کو کپڑا دینا، یا ایک غلام
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ	آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین
اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ	دنوں کا روزہ رکھنا یہ ہے تمھاری
اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ	قسموں کا اتارا، جب تم قسم کھا بیٹھو،
(مائدہ ۱۲-ع)	اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو،

قسموں کا نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کرکے قسم کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے، اور اگر پوری نہ کی جاسکے، تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے
کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے، یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے، بعد کو
غیر مناسب معلوم ہو، تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ	خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا
اَيْمَانِكُمْ، (تحریم-۱)	ٹھہرا دیا ہے،

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں،

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے، اور
معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لئے ایسا شخص جو بات
بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار، اور نا قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن
پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول
کو حکم ہوتا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ	اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا
(قلم-۱)	کہا نہ مان،

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں، اور اس کا اعتبار
کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت
اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے،

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لئے یہ نفاق کی

بڑی نشانی ہے، اور قرآن پاک مین اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقون کے تذکرہ مین ہے کہ جب اُن پر کوئی افتاد پڑتی ہے، تو قسمین کھا کھا کر کہتے ہین کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمھارے دل کی بات خوب معلوم ہے،

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ	پھر کیسا جب اُن کو اپنے ہی کرتوت
بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ	سے کوئی تکلیف پہنچے، پھر تیرے پاس
يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ	اللہ کی قسمین کھاتے آئین کہ ہماری
إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝ أُولٰٓئِكَ	غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ
الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ	ہین، جن کے دلون کا حال اللہ کو
(نساء - ۹)	معلوم ہے،

یعنی اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دلون مین کچھ ہے، اور زبانون پر کچھ ہے، ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہین کہ قسمین کھا کر سچ کو جھوٹ، اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کردین، خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو، تو اُن کو چاہئے کہ سچائی اختیار کرکے خدا اور رسول کو خوش کرین،

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ	تمھارے (مسلمانون کے) آگے خدا
وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ	کی قسمین کھاتے ہین، تاکہ وہ تم کو
إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝	راضی کرلین، اور اللہ اور رسول کو راضی
(توبہ - ۸)	کرنا زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایماندار ہین

ایسے منافقون کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بُری بات منہ سے نکالتے ہین، اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہین،

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَ لَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ (توبہ-۱۰)	خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہین کہ انھون نے نہین کہا، حالانکہ انھون نے بیشک کفر کی بات کہی،

ایک موقع پر منافقون نے نامعقول کام کیا، خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر اُن سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائین گے، سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ (توبہ-۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (توبہ-۱۲)	تمھارے آگے قسمین کھاتے ہین تاکہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ نافرمان لوگون سے راضی نہین،

اس سے جو لوگ، اللہ کی بات دل سے مانتے نہین اور زبان سے قسمین کھا کر کہتے ہین کہ مانتے ہین وہ فاسق اور نافرمان ہین،

اسی موقع پر کچھ منافقون نے مسلمانون مین تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھوٹ قسم کھا بیٹھین گے کہ ہماری نیت اچھی تھی، فرمایا،

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (توبہ-۱۳)

اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں،

اہل نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے،

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ، (مجادلہ-۳)

اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں،

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً، (مجادلہ-۳) (منافقون-۱)

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے،

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنایا کرتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی،

وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ، وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَن تَكُونَ أُمَّةٌ

اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو، اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے، بے شک اللہ تمھارے کاموں کو جانتا ہے، اور اس عورت کے جیسے نہ ہو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کئے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی، تم اپنی قسموں کو آپس میں پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ

هِیَ اَرْبیٰ مِنْ اُمَّۃٍ ط — ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو،

(نحل ۱۳۰)

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا، اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے، اسی لئے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی، اس پر اُس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا، اس لئے قسم کھاکر توڑا نہ کرو، اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو، پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا، جو سوت کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی،

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پاکر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے، تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے،

اسی طرح جھوٹی قسم کھاکر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے، اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے یعنی غصب اور جھوٹ، اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں،

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ	نہ اللہ اُن سے بات کرے گا، اور نہ
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ	اُن کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝	نہ اُن کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے
(آل عمران - ۸)	دردناک عذاب ہے؛

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہرحال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا؛ اشعث بن قیس صحابی نے کہا خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ، تو میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! تو اب قسم کھا جائے گا، اور میری چیز لے لیگا، اس وقت یہ آیت اتری؛[1]

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت اُن سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ نے تین دفعہ فرمایا، "تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ اُن کو پاک کریگا،

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذر وابن جریر؛

اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے،" صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے وہ کون ہیں، یا رسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے، (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے)، اور جو احسان جتاتا ہے، اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے، (مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے، اس لئے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا،

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا" صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟ فرمایا درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو؟ حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہیں، خدا کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا، اور جھوٹی قسم کھانا" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا" چہرہ کی خصوصیت شاید اس لئے ہے کہ اُس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا، اور بڑی ڈھیٹھائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے،

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے

لہ صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین۔ لہ سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔ لہ سنن ابی داؤد کتاب الایمان،

مرتکب ہوتے ہیں، اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے، فرمایا "جھوٹی قسم مال کو کھپوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے" روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے، وہ تو ہے ہی لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے، چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے، پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہیں، فانہ ینفق ثم یمحق (مسلم ونسائی وابن ماجہ)

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے، قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت وخواری کا سبب ہے "ولا تطع کُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسمیں کھانا، قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے۔"

لہ صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی ونسائی، منذری باب ترغیب التجار فی الصدق لہ ابن ماجہ دیکھو ابن حبان منذری ج ۲ باب ترغیب التجار فی الصدق،

وعدہ خلافی

وعدہ کرکے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے، اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا:-

إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝ (بنی اسرائیل-۴) بیشک وعدہ کی بازپرس ہوگی،

اور جس کی بازپرس خدا فرمائے، اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی،

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہوگیا، فرمایا:

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ	پس اس کا اثر ان کے دل میں خدا نے
إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا	نفاق رکھا، اس دن تک جب وہ
اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا	اس سے ملیں گے، اس لئے کہ انہوں نے

يَكْذِبُوْنَ ۝ خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا، اور اس لئے

(توبہ — ۱۰) کہ وہ جھوٹ بولتے تھے،

صحیحین میں ہے کہ منافق کی نشانی تین ہیں، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے، (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو، اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے، صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے، جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے، خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے، خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے،[۱]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو، اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین ہو تو خیانت نہ کرو،

[۱] ترغیب ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق [۲] احمد، حاکم، ابویعلی، بیہقی، منذری باب انجاز الوعد

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمّہ واجب ہو، اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے ذمہ امانت ہو، اور وہ اُس میں بیجا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو، تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے، یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو، یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کرکے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو، اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت، اور اپنے متفقہ قومی وملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہوکر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے، تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا، اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت میں ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا	اے ایمان والو! اللہ اور رسول

اللّٰہَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (انفال ۳)

خیانت نہ کرو، اور نہ آپس کی امانتون میں جان کر بددیانتی کرو،

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہو کہ اقرار کرکے پورا نہ کیا جائے، ایمانداری سے اُن کے حکمون کی تعمیل نہ کی جائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ و رسول اور مسلمانون کے دشمنون کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے، یا مسلمانون کے چھپے راز اُن کو بتائے جائین، اسی طرح آپس کی امانتون مین خیانت یہ ہو کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو، اس مین وہ ناجائز تصرف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسرون پر ظاہر کردے،

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ "منافق کی تین علامتون مین سے ایک یہ ہو کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس مین خیانت کرے"، ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہو کہ انھون نے کہا کہ خدا کی راہ مین مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا، اگرچہ وہ خدا کی راہ مین شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا، خداوندا! اب کیسے لاؤن دنیا تو ختم ہوگئی، کہا جائے گا کہ اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ مین لے جاؤ، وہان امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت مین سامنے آئے گی، تو وہ اُس کو دیکھ کر پہچان لے گا، اور اس کے پیچھے گرے گا، یہان تک کہ اس کو پکڑ لے گا، اور اس کو اپنے کندھون پر لاد کر چلے گا، جب دوزخ سے نکلنا چاہیگا تو وہ بوجھ اُس کے کندھے سے گر پڑے گا، اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائیگا،[۱]

---

[۱] بیہقی وغیرہ ۱۲

انھون نے فرمایا نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے، اور بہت سی چیزین گنا کر فرمایا، اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزون کا ہے۔[۱]

راوی کہتا ہے کہ مین نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب صحابی کو سنائی، انھون نے تصدیق کی، اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی آیت نہین سنی اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا، (نساء - ۸) یعنی بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتین امانت والون کو ادا کر دیا کرو۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئیگا پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دین گے، خیانت کرین گے، امانت داری نہین کرین گے، اور نذر مانین گے، تو پوری نہ کرین گے۔[۲]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بری باتون سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، اُن مین سے ایک خیانت بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت برا اندرونی ساتھی ہے۔[۳]

خیانت کے ایک معنی یہ ہین کہ کسی جماعت مین شامل ہو کر خود اسی جماعت کی جڑ سے اکھاڑنے کی فکر مین لگے رہنا، چنانچہ منافقین جو دل مین کچھ رکھتے تھے، اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشون مین لگے رہتے تھے، مگر ان کی چال کارگر نہین ہوتی تھی، اور ہمیشہ اُن کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا،

۱؎ مسند احمد بیہقی، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد ۲؎ صحیح بخاری ج۱ ۳؎ مسلم منذری باب مذکور ۴؎ ابو داؤد ونسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور،

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ	اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے اُن کی
مِّنْهُمْ ، (مائدہ - ۳)	ایک خیانت کی،

یعنی اُن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی تھی،

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لئے کیا،

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ	تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے
بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ	چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی
كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ،	اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں
(یوسف - ۷)	کے فریب کو نہیں چلاتا،

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی اُن کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں، اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا،

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ	خدا نے کافروں کے لئے نوحؑ کی
كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ	بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال بیان
لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ	کی، یہ دونوں عورتیں ہمارے دو
مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَا	نیک بندوں کے گھر میں تھیں، تو

هُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا،	ان دونون نے اپنے شوہرون سے خیانت کی تو یہ دونون (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں
(تحریم ۔ ۲)	کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے،

یہ دل کی خیانت تھی،

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہین ہوتی ہی، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے یہان تک کہ چشم و ابرو کے اشارون سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہر چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے، تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتون کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا،

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (مومن ۲)	اللہ جانتا ہے آنکھون کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینون مین،

پھر اس سے چھپ کر کیون کر کوئی کام کر سکتا ہے،

غدّاری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے، اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآنِ پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے، عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے۔ الکفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کرکے بدل جاتے تھے، اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، اُن کے ذکر میں خدا فرماتا ہے،

الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ	جن سے تونے عاہدہ کیا، پھر وہ اپنا
ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي	عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں، اور وہ
كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ	(خدا کا لحاظ نہیں رکھتے، سو اگر
فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ	اُن کو تو کبھی لڑائی میں پا وے تو
بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ	اُن کو ایسی سزا دے کہ اُن کے پیچھے
يَذَّكَّرُونَ ۔ وَإِمَّا تَخَافَنَّ	دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں،

مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ	اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو
عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	ان کو تو برابر کا جواب دے، اللہ کو
الْخَآئِنِيْنَ ۝ (انفال - ۷)	دغاباز خوش نہیں آتے،

اس آیت میں لوگوں کا فروں کا ذکر ہے، جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے، مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری، دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے، اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لیکر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے، وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا،

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ		اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا)
خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ	(بعض قیدیوں)	کرنا چاہیں، تو وہ اس سے پہلے خدا
مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝		سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں، تو
(انفال - ۱۰)		خدا نے اُن پر قابو دے دیا اور اللہ

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے، اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے، اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس نے اُن کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے،

حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا" یعنی

اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہو گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے افسرون کو جو نصیحتین فرماتے تھے، اُن مین سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا"[1] یعنی دشمنون سے معاہدہ کرکے پھر غداری نہ کی جائے، ظالم بادشاہون، حاکمون، افسرون، سپہ سالارون کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کرکے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہین، اورجب وہ اُن کے قابو مین آجاتا ہے، تو اُس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا، اور پھر مروا ڈالا تو مین اس سے الگ ہون اگرچہ مقتول کافر ہی کیون نہ ہو"[2]

خدا فرماتا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ (مائدہ ۱-۱)	اے ایمان والو! اپنی گرہون (قول وقرار) کو پورا کرو،

عقود کی تعمیم مین وہ تمام شرطین، وعدے اور معاہدے داخل ہین جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہان تک کہ مسلمان اپنے دشمنون سے بھی جو معاہدہ کرین، اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے، ایک دفعہ امیر معاویہ نے رومیون سے مدت متعینہ کے لئے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجین لے کر اُن کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دین، یہ دیکھ کر عمرو بن عنبہ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے، اور چلاتے

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] سنن ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد،

اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں، امیر معاویہ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اسکی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے، (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کے پہلے سے خبر کر دے کہ معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے" یہ سن کر امیر معاویہ واپس چلے آئے[1]، غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی، لیکن اُن کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا، اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا،

---

[1] سنن ابی داؤد باب الوفار بالعہد،

بُہتانؔ

بُہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھرایا جائے، یا اُس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا بُرائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے،

بعض بہتان ایسے ہوتے ہین کہ جن کا سرے سے وجود ہی نہین ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لئے تھوپا جاتا ہے کہ اُس کی بدنامی ہو، قرآن نے اس کا نام افک رکھا ہے، یہ دونون باتین جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہین، اور اسی لئے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے مین شریک ہوجاتے ہین وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہین،

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ مین طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر مین چوری کی مسلمانون کو اس پر شبہہ ہوا، تو اُس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہوگیا، یہ معاملہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا، اس منافق کے گھر والون نے

اس کا ساتھ دیا، اور اس کو بری ٹھہرایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا[۱]، دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی، اور واقعہ سے انکار کر دیا، اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی، لوگوں نے اس کو پکڑا، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، آپ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا، اس وقت یہ وحی آئی،[۲] بہر حال واقعہ جو کچھ ہو، امر مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں،

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ	ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!)
بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ	یہ سچی کتاب اتاری ہے کہ تو لوگوں
بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ ط وَلَا تَکُنْ	کے درمیان اس کے ذریعہ جو خدا
لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ	نے تجھ کو سوجھایا، انصاف کرا اور
اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۙ	خیانت کاروں کی طرف سے جھگڑا
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ	اور اللہ سے قصور معاف کرا، بیشک
یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَہُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ	اللہ بخشنے والا رحم والا ہے، اور ان کی
لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ۙ	طرف سے نہ جھگڑ، جو اپنے جی میں دغا
یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ	رکھتے ہیں، بیشک اللہ خیانت کار

[۱] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء [۲] تفسیر طبری سورۂ نساء آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ

مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ	گنہگار کو دوست نہیں رکھتا، وہ لوگوں
مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ ط وَکَانَ	سے چھپنا چاہتے ہیں، اور خدا سے نہیں
اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا ۝	چھپنا چاہتے، اور وہ اُن کے ساتھ ہی ہے،
(نسآء - ۱۰)	جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں جو خدا
	کو پسند نہیں، اور اللہ اُن کے کاموں

آگے چل کر ہے،

وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓئَۃً اَوْ اِثْمًا	اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے، پھر وہ اسکی
ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ	تہمت کسی بے گناہ پر دھرے اس نے
بُھْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (نسآء ۱۰)	طوفان اور کھلا گناہ اپنے سر لادا،

ان آیتوں میں خیانت کا راز تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور اُن کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا، جو ایسے خائن ہیں، وہ بڑے گنہگار ہیں، اور خدا کی محبت سے محروم ہیں، یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لئے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں، اور خدا سے نہیں شرماتے جو ہر جگہ اُن کے ساتھ ہے اور اُن کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے، اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، اس کے بعد یہ سرزنش اُس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اُس نے بہتان باندھا اور

گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا،

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ اُن میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہکر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے اُس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آیندہ اس جرم سے باز رہے گی،

وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ	اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی، اپنے
بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ ۝ (ممتحنہ-۲)	ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں،

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بُری بات ہے، پھر بن کئے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بُری بات ہے، خدا نے فرمایا،

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ	اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں
وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا	کو بن کئے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے
فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّإِثْمًا	ہیں، انھوں نے بہتان اور کھلا گن(اہ)
مُّبِينًا ۝ (احزاب-۷)	(اپنے سر) لادا،

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ اُن کی عزت پر حرف رکھنا ہے، اس لئے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اسکو کوڑے مارے جائیں،

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنٰتِ	اور جو لوگ شریف بی بیوں کو عیب

ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ إِلَّا	(نور-۱)	لگاتے ہین، پھر لائے چار گواہ، تو اُن کو اسّی کوڑے مارو، اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو، اور وہ فاسق ہین مگر جنہون نے توبہ کی،

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہئے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور مین فاسق ٹھرایا گیا، اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لئے بے اعتبار ہوگئی،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اُس نے وہ جرم نہین کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا[۱] یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثالی سزا ہوگی، ایک اور حدیث مین آپنے فرمایا کہ جس مین جو برائی نہین، اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے[۲] یعنی اُس سے بچنا چاہئے،

---

[۱] و [۲] سنن ابی داؤد کتاب الادب،

چغلخوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے، اور پیار سُوخ جتائے، اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے، اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لئے قرآن نے اُن لوگوں کے اوصاف میں جنکی بات نہیں ماننی چاہئیے یہ لفظ کہے ہیں،

مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (قلم-۱)	جو چغلی کھاتا پھرتا ہے،

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا	اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے، تو تحقیق کر لو،

قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلٰى مَا	کہین کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو،
فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ، (حجرات - ۱)	پھر اپنے کئے پر پچھتانے لگو ۔۔

اس آیت مین غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبرین پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے ، اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصون بالخصوص عزیز واقارب اور دوست واحباب مین نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے ، اسی بنا پر حدیث مین آیا ہو کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مین تمھیں بتاؤن کہ سب سے برے لوگ کون ہین پھر خود ہی فرمایا ،

المشاؤن بالنمیمۃ المفسدون	جو چغلیان کھاتے پھرتے ہین ، اور
بَیْنَ الْاَحِبَّۃِ (مسند احمد جلد ۶	دوستون کے آپس کے تعلقات خراب
ص ۴۵۹ عن اسماء بنت یزید)	کرتے ہین ،

صحیحین مین ہو کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گذرے ، تو فرمایا کہ ان مین سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا[1] ،

صحیح مسلم مین ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،

الا انبئکم ما العضۃ ھی	کیا مین تم کو بتاؤن کہ عضہ کیا ہو ، وہ
النمیمۃ القالۃ بین الناس[2]	چغلخوری ہو جو لوگون کے درمیان بیان ؟

[1] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لایستتر عن بولہ وصحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول [2] مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم النمیمۃ ،

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں، اس لئے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لئے جائیں، تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علٰحدگی کرنا چغلخوری کی حقیقت میں داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغلخوری میں مشابہت و مناسبت ہے، کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علٰحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے،

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ، (بقرۃ - ۱۲)

اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں،

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا،

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا" اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو یہ ہدایت کی تھی،

لَا يُبَلِّغُنِيْ احد من اصحابي عن احد شيئًا فاني احب ان اخرج اليكم وانا سليم الصدر[1]

میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے، کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث،

لیکن اس قسم کی باتین عام طور پر وہ ہوتی ہین جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہین بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہی جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے، بعض حالتون مین جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے، بعض موقعون پر دوسرے لوگ اس کو بُرا سمجھتے ہین، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے، اور جو لوگ اس بداخلاقی مین مبتلا ہوتے ہین، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتون کی ٹوہ مین لگے رہتے ہین تاکہ اُن کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائین، اسی بنا پر اہلِ عرب چغلخورون کو ہیزم بردار کہتے ہین، یعنی جس طرح لکڑیان بیچنے والے لکڑیان چن چن کر لاتے ہین، اور ایندھن کے لئے گھوم گھوم کر بازارون مین فروخت کرتے ہین، اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتون کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پھیلاتے ہین، اور آتشِ فتنہ و فساد کے لئے ایندھن بہم پہنچاتے ہین،

قرآن مجید مین ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی راے کے مطابق حَمَّالَةَ الْحَطَبِ یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لئے دیا گیا ہے کہ وہ لوگون کی چغلیان کھاتی پھرتی تھی،

ان مین بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہین یعنی چھپ چھپ کر لوگون کی باتین سنتے ہین اور پھر اُن کو دوسرون تک پہنچاتے ہین، اس قسم کے لوگون کو لغت مین قتات کہتے ہین اور اُن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

لا یدخل الجنة قتات [1]　　　جنت مین چغلخور داخل نہ ہوگا،

اس قسم کی باتین خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات،

ہیں تا کہ اُن کا اثر بڑھ جائے اسی لئے عربی زبان میں چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہیں، جس کے معنی نقش ونگار کے ہیں، اور ادھر کی اُدھر لگانے کے لئے چغلخوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہیں، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں،

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ تحریر وکتابت اور رمز واشارت سے بھی چغلخوری کی جاسکتی ہے اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ فلاں شخص یہ کہتا تھا، بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "فلاں شخص یہ کام کرتا تھا"،

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا" چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے،

اس بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سُنے، اُن کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ترکِ مالایعنی" کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے، اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے،

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اور قتل وخون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے، اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب وفریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لئے وہ ان نتائج اور ان عناصر

کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، اگر امراء کے درباروں میں تملّق و خوشامد کے لئے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے، اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر اُن کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا، فرمایا اُن پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں، اُن میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا، اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا[۱]۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ نے یہ فرمایا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں، پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اُس کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر ذنوب میں ہیں

[۱] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر،

مین داخل ہین،

قرآن مجید مین بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے،

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَ	جب تم لگے اپنی زبانون سے اس کی
تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ	نقل در نقل کرنے، اور اپنے منہ سے
لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ تَحْسَبُوْنَهٗ	ایسی باتین کہنے جس کی تم کو مطلق
هَيِّنًا وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ	خبر نہین اور تم نے اس کو ایسی ہلکی
	(سی) بات سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے
(نور - ۲)	نزدیک بڑی (سخت بات) ہے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتین کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہین، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہین، حالانکہ وہ معمولی نہین ہوتین،

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب مین جو مناسبت ہے، وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل، اور ناقابلِ اعتنا اشخاص مین پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہان رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی مین شریک ہونے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہین پاتے، تو چغلخوری سے کام لیتے ہین، اس لئے اُن کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اُن کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے، اور اُن کا کہنا نہ مانا جائے، اور قرآنِ مجید نے رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے،

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ	اور تو ایسے کا کہا نہ مان جو بہت قسمین
هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ	کہاتا ہے، آبرو باختہ ہے (لوگون
لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ	پر) آوازے کسا کرتا ہے چغلیان
	لگاتا پھرتا ہے اچھے کامون سے
(قلم - ۱)	(لوگون کو) روکتا رہتا ہے، حد سے
	آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے،

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانون کی عزت و آبرو محفوظ رہے، اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہین، اس بنا پر جن بداخلاقیون سے مسلمانون کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور اُن کے تعلقات مین ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے اُن کی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید مین مجموعی طور پر اُن کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے،

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ	مسلمانو! مرد مردون پر نہ ہنسین عجب
قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَنْ يَكُونُوا	نہین کہ (جن پر ہنستے ہین) وہ (خدا کے
خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ	نزدیک) ان سے بہتر ہون، اور
نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ	نہ عورتین عورتون پر ہنسین، عجب نہین
وَلَا تَلْمِزُوٓا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا	کہ (جن پر ہنستی ہین) وہ اُن سے بہتر
بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ	ہون، آپس مین ایک دوسرے کو
بَعْدَ الْإِيمَانِ ، وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ	طعنے نہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝

(حجرات - ۲)

نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی برا ہے، اور جو ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی (خدا کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو، کیونکہ بعض شک داخلِ گناہ ہیں، اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے، اور خدا سے ڈرو، بیشک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہئے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریق سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارت، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جاسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت

پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے جس مین بلاغت کے بہت سے نکتے ہین،

۱۔ انسان کا گوشت محض اُس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جو چیز اُس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے، وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے!

۲۔ لڑائی جھگڑے مین جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب مین اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہین، اگرچہ یہ بھی ایک برا فعل ہے، تاہم اس مین ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص رُو در رُو کسی کو بُرا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس مین بزدلی نہین پائی جاتی لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اُس کی بُرائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہٖ ایسا ہی جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے،

۳۔ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہین کرتے، اس لئے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اُس لطف و محبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانون مین پیدا کرنا چاہتا ہے،

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت مین جائز ہے، اور اس وقت بھی اگر کسی انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے، تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند

ذکر کیا، اس لئے غیبت اُس وقت تک جائز نہین ہوسکتی، جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے، اور اس حالت مین بھی جہان تک ممکن ہو، علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہئے اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہئے، اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثون مین نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے،

ایک حدیث مین ہے کہ شب معراج مین میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور وہ اُن سے اپنے چہرون اور سینون کو نوچ رہے تھے، مین نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہین؟ بولے یہ وہ لوگ ہین جو لوگون کا گوشت کھاتے تھے، اُن کی عزت و آبرو لیتے تھے،[1]

اعمال اور اعمال کی جزاء و سزا مین مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چونکہ لوگون کا گوشت نوچ کھاتے تھے، یعنی اُن کی غیبت کرتے تھے، اس لئے عالم برزخ مین اُن کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہین،

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ اُن لوگون کی بدبو ہے جو مسلمانون کی غیبت کرتے ہین،[2]

اس حدیث مین بھی اعمال اور جزاء و سزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے، اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اس لئے یہ بدبو اسی مردارخواری کا نتیجہ تھی،

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ،

اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے، اس لئے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں، اسی طرح اُن کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو اُن سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپنے دوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا، اور فرمایا "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزین نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیونکہ جو شخص اُن کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا، اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اسکو رسوا کر دے گا،[۱]

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اُس کی بُرائی کے بیان کو کہتے ہیں مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لئے کوئی ضروری قید نہیں، اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی بُرائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے،

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپنے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے" کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

توتم نے اس کی غیبت کی، اور اگر نہیں ہے توتم نے اس پر بہتان لگایا،[1]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں، بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اُس کی بُرائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے، جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کیجائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے، بلکہ سب وشتم میں داخل ہے،

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہاتھ پاؤں، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کی جاسکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے، تو اُس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لئے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے، ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا،[2]

اسی طرح چشم وابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے،

اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مختلف طریقوں کی بُرائی بیان کی ہے،

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ (قلم - ۱)	(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، اُدھر کی ادھر، اِدھر کی اُدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے،

---

[1] و [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ، (همزة) | ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا (اور ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے،

ان آیتوں مین غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقون کی مذمت کی گئی ہے، اُن کی توضیح ترجمہ سے نہین ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر رکھنی چاہئین جو حسبِ ذیل ہین،

(۱) ھمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے برائی کرنا،

(۲) ھمز خاص طور پر لوگون کے نسب کی بُرائی بیان کرنا،

(۳) ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا،

(۴) ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا،

(۵) ھمز بُرے الفاظ سے ہم نشینون کی دل آزاری کرنا،

(۶) لمز آنکھ، ہاتھ، سراور ابرو کے اشارے سے ہم نشینون کی برائی بیان کرنا،

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہان تک وسیع ہے،

کسی کی برائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگون کی واقعی بُرائی بیان کی جائے تاکہ اُن کو تنبیہ اور ندامت وشرمندگی ہو اگر برون کی بُرائی بیان کرنے کو یک قلم بند کردیا جائے (تو ان) کی بُرائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہوسکے گی، اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہین رہ سکتا تھا، قرآن پاک مین

کافرون، مشرکون اور منافقون کی علانیہ بُرائیان کی گئی ہین، مگر کہین کسی کا نام نہین لیا گیا ہی بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ مین یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یون کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہین، یا کفر کرتے ہین، اُن کا حال یہ ہے اس طریقۂ تعبیر مین یہ فائدہ ہے کہ برون کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہین پہنچتا، اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لئے گئے ہین، وہ اس لئے کہ اُن کی یہ برائیان عالم آشکارا تھین،

لیکن معاملات مین ایسے موقع بھی آتے ہین، جہان تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتون اور حدیثون سے ان موقعون کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اللہ کو بدگوئی پسند نہین آتی لیکن
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ط وَ	جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا، اور
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ٥ (نساء-۲۱)	جانتا ہے،

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہین کہ کوئی کسی کی بُرائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگون سے بیان کرے، اور ظالم کے ظالمانہ کامون کو آشکارا کرے، اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے بُرے اعمال کی سزا دے گا،

حدیث مین ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین بازیابی

کی اجازت طلب کی آپنے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان مین کس قدر بُرا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف وکرم کے ساتھ گفت گو کی،[1] اس سے معلوم ہوتاہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگون کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لئے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار مین دوسرون کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو، یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اس کو یا تو غیبت ہی نہین کہہ سکتے، یا کہہ سکتے ہین تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے، امام غزالی نے احیاء العلوم مین ان مقاصد کو چھ صورتون مین محدود کردیا ہے،

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی مین فریاد کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، لصاحب الحق مقالاً

(۲) مذہبی اور اخلاقی بُرائیون کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب، (چنانچہ اسی بناپر کفار اور منافقون کی برائیان قرآن نے طشت ازبام کی ہین)

(۳) فتوی طلب کرنا، اسی بناپر حضرت ہند بنت عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی، (اور آپنے سُن کر اس کا مناسب جواب دیا)

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگون کا بچانا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غرض سے ایک شخص کو "بئس ابن العشیرۃ" قبیلہ کا بُرا آدمی" کہا تھا،

[1] بخاری کتاب الادب باب مایجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب،

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اُس کا عیب ظاہر ہو، مگر غایتِ شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑھ نہ ہو، مثلاً اعمش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہو، اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا،

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائیاں کرنا (تاکہ اس کو تنبہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا،

دُوْرُخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص وصداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے، لیکن اس قسم کے تعلقات میں دورخاپن نہیں پایا جانا چاہیے، یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیئے، بلکہ یہ بد اخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے، کیونکہ چغلخور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دورخا آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے،

دُورُخے پن کے لئے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے، اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دُورُخا کہلائے گا، نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے، اسی لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امراء اور حکام کے پاس جاتے ہیں، تو کچھ کہتے

ہین، اور جب اُن کے یہان سے نکلتے ہین تو کچھ کہتے ہین" بولے ہم لوگ عہدِ رسالت مین اس کا شمار نفاق مین کرتے تھے[1]" اور قرآن مجید مین بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے؛

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِھِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (بقرہ-۲)	اور جب اُن لوگون سے ملتے ہین جو ایمان لاچکے تو کہتے ہین ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہین، اور جب تنہائی میں اپنے شیطانون سے ملتے ہین تو کہتے ہین ہم تمھارے ساتھ ہین، ہم تو صرف مسلمانون کو بناتے ہین؛

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقون کو اردو مین دو رُخا اور عربی مین ذوالوجہین کہتے ہین، اور احادیث مین اس قسم کے لوگون کے لیے وعید شدید آئی ہے مثلاً فرمایا؛ قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے بُرا دو رُخے کو پاؤگے، جو کچھ لوگون کے پاس جاتا ہے تو اُس کا رخ اور ہوتا ہے، اور دوسرون کے پاس جاتا ہے تو اور[2]"

ایک اور حدیث مین فرمایا؛:-

"دنیا مین جس کے دو رُخ ہون گے قیامت کے دن اُس کے منھ مین آگ کی دو زبانین ہون گی[3]" یہ گویا اس کی اس عادتِ ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگون سے دو رنگ کی باتین کیا کرتا تھا،

---

[1] صحیح بخاری باب ما قیل فی ذی الوجہین [2] بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم و مالک [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجہین؛

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے، اور کسی کے کام میں اس کو حُسنِ نیت نظر نہیں آتا، دوسرے کی طرف ان ہوئی بات منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی اُس سے کترانے لگتا ہے، اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے،

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا	اے ایمان والو! بہت بدگمانی
كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	بچا کرو، بے شک بعض بدگمانی
إِثْمٌ، (حجرات، ۲)	گناہ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض وحسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی، کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا:

"تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو،
اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بیجا ہوس کرو، اور نہ آپس میں حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک
دوسرے سے منھ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ"[۱]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑ جائے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے، ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواجِ مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ اُن کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آ پڑے، وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے،[۲]

[۱] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک باب تحریم الظن [۲] صحیح مسلم باب انه یستحب لمن روی خالیاً بامراءۃ یقول هذه فلانة،

مدّاحی اور خوشامد

مدّاحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دنارت اور ذلّت کی علامت ہے، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہی، اور یہ اُس کے لئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مدّاحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مدّاحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے؛ ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفین کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہین ہوتین، یہ جھوٹ ہے، دوسرا یہ کہ وہ منھ سے جو تعریفین کرتا ہے، اس کو اپنے دل مین خود درست نہین سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدون کے لئے ارباب قدر وجاہ کی خوشامدانہ تعریف کرکے اُن کی اور لوگون کی نظرون مین اپنے کو ذلیل ورسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دنارت اور ذلّت ظاہر ہوتی ہے،

بیجا تعریفون سے ممدوح مین بھی دو بُرائیان پیدا ہوجاتی ہین، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفین سُن کر وہ خوش ہوتا ہے، اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا لفظ منھ بیان پر مغرور ہوکر دوسرے کو آنکھ نہین لگاتا ہے، اندھیلے دریلے تعریفین سُن کر اُس کو یقین آجاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقّع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہون

امیروں، دولتمندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں، اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے،

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[1] اور اُن کے انجام کی یہ خبران کو دی ہے،

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ	جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں، اور
بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا	جو انھوں نے نہیں کیا، اس پر تعریف
بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ	کئے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَھُمْ	نہ سمجھنا پھر نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ہ	جائیں گے، اور ان کے لئے دردناک
(آل عمران - ۹)	سزا ہے،

ان آیتوں کا شانِ نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے[2]، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کئے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کئے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآنِ پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں، اُن کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں، جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم

[1] صحیح بخاری تفسیر آل عمران [2] فتح القدیر شوکانی،

ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا تم نے اُس کو برباد کردیا، ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی، تو فرمایا، تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو، تو یوں کہو کہ مین گمان کرتا ہون بشرطیکہ اس کے علم مین وہ واقعی ایسا ہو، اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے[۲]۔

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی، تو وہ اس کو سُن کر مغرور ہوجائے گا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہوجائے گا، اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہین لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہین معلوم،

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفین جو لوگون کے منہ پر کی جاتی ہین، اُن کو سُن کر اُن کے نفس موٹے ہوجاتے ہین، اور اُن کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھون کی روشنی زائل ہوجاتی ہے،

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے منہ پر اُن کی تعریفین کین تو حضرت مقداد صحابی نے اس کے منہ مین خاک جھونک دی، اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مداحی کرنے والون سے ملو تو اُن کے منہ مین خاک جھونک دو[۳]۔

---

[۱] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح [۲] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب مذکور،
[۳] صحیح مسلم و ابوداؤد باب کراہیۃ التمادح،

ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اُس نے اُس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپ نے فرمایا:-

"اس کو نہ سناؤ کہو کہ اس کو برباد ہی کردو"[1]

[1] باب بحتی فی وجوہ المداحین،

بخل

بخل بھی اساسی بداخلاقیون مین سے ہے، یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیون کی جڑ ہے، خیانت، بد دیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی، اور دناءت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے، حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیان اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اُس نے کلھاڑی ماری، اور بھوکون کو کھلانا، ننگون کو پہنانا، محتاجون کو دینا، یتیمون کی خبر گیری اور مقروضون کی امداد مسلمانون کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اُس کے مصارف ہین، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرئیل کی آمد کا حال سُنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوت کا یقین جن دلیلون کی بناپر دلایا وہ یہ ہین :-

"یارسول اللہ! آپ قرابت والون کا حق اور مقروضون کا قرض ادا کرتے ہین، غریبون کو سرمایہ دیتے ہین، مہمانون کو کھلاتے ہین، اور حق کے مصیبت زدون کی مدد کرتے ہین" صحیح

بخاری، باب بدء الوحی)

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتون کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہین ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے،

بخالت اُن بیماریون مین سے ہے جو درحقیقت، اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہین، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہین رکھتا، وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہین ہو سکتا، سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتون مین ہے، اس مین دوزخیون کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے، اُن سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ مین کیون ڈالے گئے، تو کہین گے ہم نماز نہین پڑھتے تھے، اور مسکین کو کھانا نہین کھلاتے تھے، مخالفون کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لئے تھا کہ ہم نے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہین رکھتے تھے،

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا	تم کو دوزخ مین کیا چیز لے گئی کہین گے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَ	ہم نمازیون مین سے نہ تھے، اور مسکین کو
لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝	کھلاتے نہ تھے، اور بحث کرنے والون
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝	کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ (مدثر ۲)	اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے"

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہین، وہ اخلاص

سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کرسکتا، یہی نکتہ سورہ ماعون مین جو مکہ کی ابتدائی سورتون مین سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:۔

کیا تونے اُس شخص کو دیکھا جو جزا کے	اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ
دن کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو	فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ
بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور	وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ
فقیر کے کھانے پر آمادہ نہین کرتا ہے،	(ماعون)

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہین کیونکہ یہ فیاضی اُس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہین ہوسکتی، جو مقبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا مین پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہان کہین اُس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہین ہوتی، وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہین ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہین کہ اُس کے دل مین یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور وہ کبھی ضائع نہین جاسکتی؛

ایک اور مکی سورہ مین اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہین، اور اس لئے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے؛ خدا فرماتا ہے،

یہ خیال صحیح نہین، بلکہ بات یہ ہے	كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ

وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

(الفجر)

کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہین کرتے، اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے کو رغبت نہین دلاتے، اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو، اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو،

ان آیتون مین باتین کئی بیان کی گئی ہین مگر یہ سب بخل کی مختلف صورتون کی تشریح ہین، سورۂ ہمزہ مین اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیون کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اُن کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا، اور یہ چیز اُس سے کبھی علٰحدہ نہ ہو گی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا،

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝

(ھمزۃ)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گن کیا اسکو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یون نہین، وہ بالضرور دوزخ مین ڈالا جائے گا،

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور اور کارِ خیر مین خرچ نہ کرنیوالے کو اُس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے، جو کھال تک کھینچ لے،

کَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝

ہرگز نہین وہ تپتی آگ ہے کھینچ لینے والی کھال اُتارے گی، اُس کو

وَجَمَعَ فَاَوْعٰیo	جس نے حق سے پیٹھ دی، اور پھر گیا، اور
(معارج-۱)	اکٹھا کیا، اور سینتا،

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے، کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا، اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لئے اُن کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں، اُن کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے، اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے، جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ اپنے لئے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ	کر رکھتے ہیں، اور خدا کی راہ میں خرچ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	نہیں کرتے، تو اُن کو دردناک سزا
اَلِيْمٍ o يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ	کی خوشخبری سُنا دے، جس دن اس
جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ	کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا،
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ	پھر اس سے اُن کی پیشانیاں کروٹیں
هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ	اور پیٹھیں داغی جائیں گی، اور کہا
فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ	جائیگا کہ یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے
(توبہ-۵)	لئے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر

بخیل کی اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہئے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لئے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں،

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، (آل عمران-۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے اُن کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ اُن کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں، اس کا طوق بنا کر اُن کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائیگا،

یعنی جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا کر رکھا تھا، وہ قیامت کے عالمِ مثال میں واقعی اُن کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا[1]،

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے، اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ،

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ	اور اللہ کسی اترانے والے شیخی مارنے
فَخُوْرِ ۙ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ	سے محبت نہین کرتا، جو آپ بخل کرتے
یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ	ہین، اور لوگون کو بھی بخل کی ترغیب
(حدید۔ ۳۰)	دیتے ہین،

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اُس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لئے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے، اور عزیز و اقربا بھی محبت نہین کرتے، اور ایسے لوگون کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے، اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ اُن کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسرون کو ذلیل سمجھتے ہین، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندون کی نگاہون مین بھی ذلیل و خوار ہوتے ہین،

قرآن پاک مین بخل کی سب سے بڑی تمثال کا نام قارون بتایا گیا ہے جس کا قصہ سورۂ قصص مین ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ مین ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ (تمدن کے اس ابتدائی دور مین جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی، اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی) خزانے تو الگ رہے خزانون کی کنجیون کے گچھون کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا مین اس سے پہلے اس سے کیسی بڑے بڑے دولتمند گذر چکے ہین جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی

دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین مین دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا،

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے
اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ	قومون مین سے اس سے زیادہ طاقتور
مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ	اور اس سے زیادہ دولت مندکو
اَكْثَرُ جَمْعًا (قصص - ٨)	تباہ کر چکا ہے،

زمانۂ محمدیؐ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہدیا گیا،

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ	ابولہب کو اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے
(ابی لہب)	کمایا، کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا،

نفس کثتی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اُس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہین ہوسکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتون مین خرچ نہ کیجائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت مین کام آئے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بیکار ہو جاتا ہے، اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے، جس کا وہ بھی ایک فرد ہے،

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ	ہان! تم کو اللہ کی راہ مین خرچ کرنے
لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ	کو بلایا جارہا ہے، تو تم مین کوئی بخل
مَّنْ يَّبْخَلُ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا	کرتا ہے، اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو
يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ	اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اور اللہ

وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ بے نیاز ہے، اور تم ہی محتاج ہو،

یعنی اس کے بخل کے برے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑین گے،

بخیل آدمی دنیا مین بھی طرح طرح کی مصیبتون اور مشکلون مین گرفتار رہتا ہو کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسّر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل وخوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقراء اُس کے لئے بددعا کرتے ہین، یہان تک کہ بیوی بچے جن کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے، وہ بھی اس سے خوش نہین رہتے، ہر ایک اس کی دولت کا خواہان رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اُس پر قبضہ کرلے، چور اُس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہرہ وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہین، مگر ان تمام مصیبتون کو وہ سہتا ہے، اور اپنی زندگی بھر اس مین سے کچھ خرچ نہین ہونے دیتا، لیکن اِدھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر اس کے وارثون نے اللّے تللّے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لئے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے، وہ اس مالِ مفت کو دم کی دم مین اڑا دیتی ہے، اور ہزارون بری عادتون مین مبتلا اور آخر مین مفلس وقلاش ہو جاتی ہے،

خدا اپنے رسول کی زبانی فرماتا ہے،

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَ اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور

كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ (خدا کی یا نیکی کی باتون کی) پروا

لِلْعُسْرٰى ه وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ه

نہ کی، اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کو سخت کام کے لئے آسان بنا دیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

(لیل)

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے، وہ بُری عادت وخصلت، اور بُرے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے، اور اُن کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے، بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز واقارب، دوست واحباب سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اُس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڈھے میں گرتا ہے، یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئے گا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے،

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ

اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے، اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے، (خدا کی راہ میں) خرچ کرو، (ایسا نہ ہو کہ موت آئے گی

وَأَكُن مِّنَ الصّٰلِحِينَ ۝	تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا،
(منافقون-۲)	

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کیلئے سامان پہلے سے چاہئے تھا،

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر جب اللہ تعالیٰ اُن کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں، اور نیکی کے ہر راستہ سے منھ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے،

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ	اور اُن میں کوئی ایسا ہے جس نے
لَئِنْ اٰتٰنَا مِن فَضْلِهٖ	خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو
لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ	اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات
الصّٰلِحِينَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰهُم	کریں گے، اور نیکوکاروں میں سے
مِّن فَضْلِهٖ بَخِلُوا بِهٖ وَتَوَلَّوا	ہوں گے پھر جب خدا نے اُن کو اپنے
وَّهُم مُّعْرِضُونَ ۝ (توبہ-۱۰)	فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے

خدا فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے دل مین نفاق نے گھر کر لیا،

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ ۔ تو اللہ نے اُن کے دلون مین اس کا

(توبہ ۔ ۱۰) نتیجہ نفاق رکھا،

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے، شاید اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتین سچے مومنون مین جمع نہین ہوتین، بخل اور بد خلقی[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن برائیون سے بچنے کی خدا سے دعائین مانگا کرتے تھے ان مین سے ایک بخل بھی ہے فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا مین بخل، کسلمندی، کبرسنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہون[2]،

اسلام مین زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرّات کی ترغیبات شریعتِ محمدیؐ مین اسی لئے ہین کہ انسانون کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک وصاف رہین،

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہین ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششون کا حق ادا نہین کرتے، وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہین، اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤن کے مستحق ہین، جس کو علم ملا ہے اُس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلائے، اور دوسرون کو بتائے، جو ایسا نہین کرتا وہ علم کا بخیل ہے،

[1] جامع ترمذی [2] صحیح مسلم،

اسی لئے علم کا چھپانا اور بیان کرنے سے بچنا گناہ ہے،

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَهَادَةً	اور کون اُس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا
عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ	جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے
(بقرہ ۔ ۱۶)	چھپائے،

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا، اور اس کو پھیلایا[1]" اس لئے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام دیا، اس کا شمار سخیوں میں ہوگا،

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، اللہ کے حق اور بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجاآوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے،

مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ، قَالُوْا	کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی کہیں گے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَ	کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور نہ
لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ (مدثر ۲)	محتاجوں کو کھلاتے تھے،

پہلا گناہ حقوق الٰہی کی بجاآوری سے انحراف، اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے،

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	پھر خرابی ہے اُن نمازیوں کی جو اپنی
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ	نماز سے بے پروا رہتے ہیں، وہ جو دکھاوا
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ	کرتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو
الْمَاعُوْنَ، (ماعون-١)	مانگے نہیں دیتے،

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں، اور صرف دکھاوے کے لئے پڑھتے ہیں، یہ حقوق الٰہی سے تغافل ہے، اور دوسری: پس ہیں مانگے کی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے، اور اس لئے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے،

حرص و طمع

حرص وطمع یا لالچ وہ بُرائی ہے جس مین نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً وہ حرص وطمع جس مین بخالت کی بھی آمیزش ہو، عربی مین اس کو شُحّ کہتے ہین، جس کی بُرائی قرآن مین کئی موقعون پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہین چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہین، شوہرون کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لئے وہ زیادہ خرچ نہین دیتے، اور بیویان لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہین، یا ایک شخص کے کئی بیویان ہون تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے، کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے، اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملون مین کشمکش پیدا ہوتی ہے، اور سارا گھر روحانی تکلیف مین رہتا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو، اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا عشرتکدہ بنجائے گا، میان بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ مین قرآن کی تعلیم ہے،

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ	اور طبیعتوں (نفوس) مین حرص دھری
وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰہَ	ہے، اور اگر تم احسان کرو، اور تقوی
كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ٥	اختیار کرو، تو اللہ کو تمھارے کامون
(نساء - ۱۹)	کی ساری خبر ہے،

یعنی میان بیوی دونون حرص اور لالچ چھوڑ دین، اور احسان اور تقوی کی راہ اختیار کرین، تو اللہ تعالی جو ہر ایک کے کامون سے واقف ہے سب کو اُن کے کاموں کے مطابق جزا دے گا،

اس کاروباری دنیا مین ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص وطمع کو روک کر اچھے کامون مین روپیہ خرچ نہین کرے گا، وہ کامیابی حاصل نہین کرسکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی، فرمایا،

وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ ط	اور خرچ کرو، اپنے لئے بھلائی کرو،
وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولٰئِكَ	اور جو اپنے جی کی حرص سے بچا یا گیا
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ (تغابن ۲۰)	وہی کامیاب ہین،

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانون کا وصف یہ ہے کہ دوسرون کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہین،

وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	اور اپنے اوپر (اورون کو) مقدم رکھتے ہین
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط وَمَنْ	اگرچہ خود اُن کو ضرورت ہو اور جو اپنے
يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولٰئِكَ	جی کی لالچ سے بچا یا گیا وہی کامیاب ہین
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٥ (حشر - ۱)	

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے، اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہین سکتا، جب تک حرص وطمع کا خاتمہ نہ ہو، اسی لئے خدا نے فرمایا جو حرص و آز سے پاک ہون گے، وہی کامیاب ہون گے،

لالچی یہی نہین کہ اپنے مال کو خرچ نہین کرتا، بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہی، اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے، اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہی، کیونکہ اس مین دو بداخلاقیان شامل ہین، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا،

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ	اور ہوس نہ کرو جس مین اللہ نے
بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ	ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے،
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ	مردون کے لئے اُن کی کمائی ہی، اور
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـــَٔـلُوا	عورتون کے لئے اُن کی، اور اللہ
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ	سے مانگو، اس کے فضل مین سے حصہ،
شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (نساء - ۵)	بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے،

مطلب یہ ہی کہ خدا نے کسی چیز مین کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیون مل گئی، کاش خود اُسے ملتی، بلکہ اُس کو اللہ تعالی ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض وکرم مین سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لئے ہاتھ پھیلانا چاہیئے اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت مین قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا، اسی لئے فرمایا،

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ	اور بے شک ہم نے تجھ کو دین سات
الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ	آیتیں، اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے،
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	تو اپنی آنکھین ان چیزون پر مت پسار
مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	جو ہم نے ان مین سے مختلف لوگون کو
(حجر-۲)	فائدہ اٹھانے کو دی ہین،

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی، اس کی نظر مین دنیا وی دولت کیا چیز ہے ؟

یہی حرص وطمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسری کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "حرص وطمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلون کو برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انھون نے خون بہایا، اور حرام کو حلال سمجھا"۱ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم مین اس سے زیادہ مفصل ہے، فرمایا "حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلون کو اس کی دعوت دی کہ انھون نے (بے گناہون کا) خون بہایا، اسی نے اگلون کو دعوت دی کہ انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اور اسی نے اگلون کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا"۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر مین فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومین اسی حرص سے تباہ ہوئین، اسی نے انکو کہا تو انھون نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انھون نے بخل کیا، اسی نے اُن کو فسق وفجور کے لئے کہا تو انھون نے فسق وفجور کیا"۳ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان مین سب سے بُری بات گڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے"۴

---

۱ صحیح مسلم باب تحریم الظلم ۲ صحیح ابن حبان ومستدرک حاکم ۳ ابوداؤد وحاکم ۴ صحیح ابن حبان وابوداؤد

حریص آدمی اس لئے غم مین کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہین ملا، وہ نہین ملا، فلان کے پاس یہ ہے میرے پاس نہین، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن مین رکھنے والی فرمایا[۱] نسائی مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل مین جمع نہیں ہو سکتے"[۲] سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ مین فرمایا کہ انسان بوڑھا ہوتا ہے، مگر اُس کی دو چیزین جوان رہتی ہین جینے کی خواہش اور مال کی حرص"[۲] کئی صحابیون کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریون کے جھنڈ مین چھوڑ دیئے جائین، وہ اُن کو اتنا برباد نہین کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے[۳]

(بقیہ حاشیہ ص ۶۸۰) کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن [۱] نسائی [۲] ترمذی [۳] ترمذی و صحیح ابن حبان وطبرانی وابو یعلی وبزار (منذری ۲ ص ۲۳۰)

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہی، اور وہی اس مین تصرف کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہین کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتین محفوظ اور مامون ہین، اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت مین بیان کر دیا ہے،

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا	اے ایمان والو! آپس مین ایک
اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے
(نساء - ۵)	مت کھاؤ،

اس آیت نے اُن تمام طریقون کا جو ایمانداری کے خلاف ہین، اور جن کی جزئیات

کی کوئی حد نہین ہے، چار لفظون مین خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے، یا زور وظلم سے لے، یا غصب کرے، یا چوری کرے، یا اس مین خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ہم (مسلمانون) پر ہتھیار اٹھایا، اور جس نے ہم (مسلمانون) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانون) سے نہین"[۱] جان اور مال معاملات مین دو اہم چیزین ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے دونون کی حفاظت کی اہمیت بتادی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ڈھیر پڑا دیکھا، آپ نے اُس مین ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے، آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے، عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا "تو پھر اس کو اوپر کیون نہین رکھا کہ لوگ دیکھ لین، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہین"[۲] یعنی رسول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے،

ارشاد ہوا "جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا، وہ خدا سے ملیگا، تو خدا اس پر غضبناک ہوگا"[۳] ایک دفعہ ایک معاملہ مین ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی، تو آپ نے فرمایا "اگر اُس نے قسم کھالی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب وہ ملیگا تو خدا اس سے منہ پھیر لے گا"[۴]

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا
[۳] و [۴] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من اقتطع حق مسلم،

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو غصب کہتے ہین، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ مین ایک بادشاہ کا ذکر ہے، جو غریب مچھوون کی کشتیان زبردستی چھین لیتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا،

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبون کی تھی،
يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ	جو دریا مین محنت کرتے تھے، تو مین
أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ	نے چاہا کہ اس مین کچھ عیب کر دون،
يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ه	اور اُن کے پرے ایک بادشاہ تھا، جو
(کہف - ۱۰)	ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا،

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا، اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی،

حضرت سعید بن زیدؓ صحابی روایت کرتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقہ فی سبع ارضین، تو اس کو زمین کے ساتون طبقون مین سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا،[1] اس حدیث کا یہ مطلب ہو کہ اس کے گلے مین زمین کے یہ ساتون طبق ہار کی طرح ڈالے جائین گے،[2]

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے، جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ مین

---

[1] صحیح بخاری باب تحریم الظلم وغصب الارض وغیرہا، دوسری روایتون مین طوقہ الی سبع ارضین، من سبع ارضین الی سبع ارضین [2] شرح نووی باب ظلم حدیث مذکور،

جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے، اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے، اور میں اس کے حق میں فیصلہ دیدیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہوگا۔[1]

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں،

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى	ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ، اور نہ
الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ	پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ تاکہ
أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ	کھا جاؤ لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور
أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (بقرہ ع-۲۳)	تم جانتے بوجھتے ہو،

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے، اسی طرح کمزوروں

---

[1] ابو داؤد کتاب الاقضیہ،

کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس مین پا کر اُن کا مال خلافِ انصاف نہین کھانا چاہیے، جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ مین انگارے بھرتا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ
الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ
فِیْ بُطُوْنِہِمْ نَارًا ط وَسَیَصْلَوْنَ
سَعِیْرًا ط (نساء ۱۰)

بے شک جو یتیمون کا مال ظلم سے کھا
جاتے ہین، وہ اپنے پیٹ مین آگ کھاتے
ہین، اوراب وہ اب دہ آگ مین
بیٹھین گے،

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی بے کینہ حرکت کا نام چوری ہے، اسی لئے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہات کاٹ ڈالنا،

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا	اور جو کوئی چور ہو، مرد ہو یا عورت
اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا	اُن کے ہاتھ کاٹ ڈالو، سزا اُن
مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝	کی کمائی کی تنبیہ اللہ کی طرف سے اور
(مائدہ ۔ ۶)	اللہ ہے زور آور حکمت والا،

چوری کی بُرائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے، تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے، اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی بُرائیاں شامل ہیں،

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے، پھر اس کے بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے، اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں، اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پا لیتا ہے، اس لئے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے، اور خود بھی اُس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کروا تا ہے،

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، سورہ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ چوری نہ کریں گی، فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونیں اسلام قبول کرنے آئیں تو آپ نے اُن سے بھی اس کا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لئے پورا خرچ نہیں دیتے، مگر یہ کہ میں اُن کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں، فرمایا، تم اُن کے مال سے اتنا لے لیا کرو، جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے کافی ہو،[1] اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی، دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہماری ذمہ ہے، اگر ہم اس کو ادا نہ کریں، اور وہ حسب ضرورت ہم سے

[1] صحیح بخاری کتاب النفقات،

پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے، تو یہ چوری نہین،

یہ عہد صرف عورتون ہی سے نہین بلکہ مسلمان مردون سے بھی آپنے لیا، حضرت عبادہ بن صامت صحابی کہتے ہین کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، آپنے فرمایا "ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کروگے، پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے، اور جو ان مین سے کسی ایک کا مرتکب ہوا، اور اس کی سزا اس کو دیدے گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہوگیا، اور اگر کسی نے ان مین سے کسی ایک کا ارتکاب کیا، اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ مین ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے[۱]"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خودیا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے،

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لئے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہین رکھتا، یا کم از کم فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہین دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہین دیکھتا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس مین ایمان نہین رہتا[۲]"

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ مین فرمایا کہ "تم مین سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے مگر حق کے ساتھ[۳]" یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الحدود [۲] ایضاً [۳] ایضاً

کرکے معاوضہ میں حاصل کرو یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی،

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا	اے ایمان والو! تم آپس میں ایک
أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا	دوسرے کا مال ناجائز طریق سے
أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ	کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس
مِنْكُمْ، (نساء - ۵)	کی خوشی سے،

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی ناجائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو،

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ چونکہ گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں، اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا![1]

ایک صحابی ایک چادر سرہانے رکھکر سوئے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا اور پکڑا گیا، تو صحابی موصوف نے اس کی سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر [illegible] آپ نے فرمایا تو کیا [illegible] اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا

---

[1] ابو داؤد کتاب الحدود،

مین نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپنے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیون نہین کر لیا۔[1]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز مین مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت مین آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپنے فرمایا کہ مین نے دوزخ مین اس کو بھی دیکھا جو اپنی لکڑی سے حاجیون کا سامان چرا لیتا تھا، اور اگر مالک ہشیار ہو جاتا تو کہدیتا تھا کہ اتفاق سے اس مین پھنس کر چلا آیا، اور اگر وہ بےخبر رہتا تو لے جاتا تھا، آپنے فرمایا مین نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ مین اپنی آنتین گھسیٹتا پھر رہا تھا،[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود [2] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف،

ناپ تول مین کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہین، اور جس کی پاداش مین چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے، اور جس کی بُرائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکسان کی ہے لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم ہے کہ اُس نے اُن نازک سے نازک ناجائز معاملون کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہین سمجھا جاتا، تشریح کی اور ان کی برائیون کی تشہیر کی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیمون سے اُن کی اہمیت کو ظاہر فرمایا، اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے،

اس سلسلہ مین سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے، اور جس مین خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہین، اور جس سے سب سے زیادہ غریبون کو نقصان پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین مین سے ایک بڑا قانون عدل ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو، وہ اس کو دے دی جائے، یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا مین قائم کیا ہے، اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے، جو شخص دوسرے کا جو حق ہے، اس کو نہین دیتا یا دینے مین کمی کرتا ہے، وہ اس ترازو سے

کام نہیں لیتا ہے، فرمایا،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ	اور آسمان کو اونچا کیا، اور ترازو
أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا	رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو
الْمِيزَانَ ۝ (رحمان-۱)	تولو، اور مت گھٹاؤ تول،

اس ترازو سے انسان کا ہر قول وفعل تلتا ہے، اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے،

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے، وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لئے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں،

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا	اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان
مِنَ الْمُخْسِرِينَ، وَزِنُوا	دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۝	اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ	چیزیں، اور مت پھرو ملک میں فساد
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (شعراء-۱۰)	پھیلاتے،

یہی حضرت شعیبؑ مدین والون کو سمجھا کر کہتے ہین، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلون کے رہ گذر مین آباد تھے،

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ	اور ناپ اور تول مین کمی نہ کرو، مین
اِنِّي اَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّي اَخَافُ	تم کو آسودگی مین دیکھتا ہون، اور
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ٥	ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو
وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ	تم پر ڈرتا ہون، اور اے میرے لوگو!
بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ	ناپ اور تول کو انصاف سے پورا
اَشْيَاۤءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي	کرو، اور لوگون کی چیزین اون کو
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ٥	گھٹا کر مت دو، اور ملک مین فساد
(هود-۸)	پھیلاتے مت پھرو،

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھیے تو یون کہیے کہ بازار مین ایسے لوگون کی جو ناپ تول مین کمی بیشی کرتے ہین ساکھ جاتی رہتی ہے، اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بنجاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہین کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالین گے، مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے،

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہی نصیحت پھر سورۂ اعراف مین دہرائی گئی ہے

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا	تو ناپ اور تول پوری کرو، اور مت

تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ — گھٹا دو، لوگوں کو اُن کی چیزیں اور

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ — زمین میں اس کی اصلاح کے بعد

بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ — خرابی مت ڈالو، یہ تمھارے لئے

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اعراف-۱۱) بھلا ہو اگر تم کو یقین ہو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیب کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے، اس کے بعد ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (انعام-۱۹) اور ناپ اور تول کو پورا کرو،

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے،

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ — "اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو،"

وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ — سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے اور اس

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (اسرائیل-۴) کا انجام اچھا ہے،

آیت کا اخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے،

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں، اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہو گا، سورۂ مطففین میں جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے،

اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا ہے فرمایا،

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا
اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ
وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ
يُخْسِرُونَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ
أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ
يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ

(مطففین-۱)

خرابی ہے اُن گھٹا کر دینے والوں کی
جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا
لیں، اور جب اُن کو ناپ یا تول کر دیں
تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ
ایک بڑے بھاری دن کے لئے ان کو
اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا
کے مالک کے لئے کھڑے ہوں گے،

—— • ——

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیون مین ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علحدہ علحدہ نہ کیا گیا ہو، اس مین سے کوئی چیز دوسرے ساجھیوں سے چھپا کرلے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مالِ غنیمت مین جو بددیانتی اور چوری کی جائے اُس کو کہتے ہین غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیون کا حصّہ ہے جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصّہ الگ الگ نہ کردے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے، اس مین سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے، اور یہ ایسی برائی ہے جس مین بددیانتی اور چوری دونون ملی ہوئی ہین،

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز مین ہر ایک کا حصّہ ہے، تو اس مین سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے، لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہین ہوا ہے اس مین ہر ایک کا برابر برابر حصّہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لئے حلال نہین ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی

اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوسرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا با قاعدہ بانٹ سے پائے، اور یہ صریح بے ایمانی ہے،

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا، اور چونکہ انبیاء علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں۔ اور وہ گناہوں سے مبرّا ہوتے ہیں، اس لئے اُن کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے، فرمایا،

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ،	اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ
(آل عمران - ۱۷)	غنیمت میں سے چھپا کر لے لے،

پھر فرمایا

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ	اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کرے گا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ	تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لیکر
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا	آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کیا پورا پورا پائیگا،
يُظْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران - ۱۷)	اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا،

غزوۂ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام

ہی تمام ہو گیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا، وہ اُس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے، لوگوں نے یہ سنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا، یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔[1]

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی، جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپ سے عرض کیا گیا، آپ نے فرمایا تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سُن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا، اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا تمہارے بھائی نے مالِ غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو چھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔[2]

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مالِ غنیمت لے کر آتے، پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا، اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا، اس کے بعد جو لے کر آتا، وہ قبول نہ ہوتا، اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا، اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کیا تم نے بلال رضی اللہ عنہ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟ اُس نے کہا سُنی تھی، پوچھا پھر اُس

---

[1] و [2] ابو داؤد کتاب الجہاد، فی تعظیم الغلول،

وقت کیون لے کرنہین آئے، اس نے معذرت کی، فرمایا تم اس کو قیامت مین لے کر آنا، مین نہین قبول کرتا[۱]"

عمال کو ہدایت کی گئی کہ اُن کو جو ملے اس کو مسلمانون کے بیت المال مین لاکر پیش کرین فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو، وہ ایک سوئی بھی چھپا کرے گا، تو وہ "غلول" ہے، وہ اُس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا[۲]"

[۱] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول [۲] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ،

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی یہ ہین کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے[1]،

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدمون کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض ان کو اس کے لئے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا، اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[2]،

عرب مین یہودیون کے مقدمے، اُن کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے، اور چونکہ دولت اور تمول نے اُن مین اونچے نیچے طبقے قائم کردیئے تھے، اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لئے علانیہ رشوت دیتے تھے، اور اُن کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے، اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے

[1] مجمع البحار علامہ [illegible]
[2] جامع ترمذی [illegible] مہر البغی

تھے، اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح و ضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے[1]، چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی، قرآن مجید کی اس آیت میں اُن کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ	خدا نے کتاب سے جو اُتارا اُس کو جو
اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ	چھپاتے ہیں، اور اس کے ذریعہ معمولی
بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا، أُولَئِكَ مَا	معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا	پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، خدا
النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ	اُن سے قیامت کے دن بات نہ کریگا
الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ	نہ اُن کو پاک صاف کریگا، اور اُن
عَذَابٌ أَلِيمٌ (بقرہ۔ ۲۱)	کے لئے دردناک عذاب ہے،

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں رد و بدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے، اس لئے یہی سزا اُن کو ملے گی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علما کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توراۃ میں تھے وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے رد و بدل کیا کرتے تھے، اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے

[1] صحیح بخاری، معجم طبرانی،

تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں اُن کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے، فرمایا،

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (مائدہ-۹)

اور تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی، اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں، جو وہ کرتے ہیں، اُن کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، کیا بُرے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ-۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے، اور حرام کے بڑے کھانے والے،

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گزر چکی ہے، یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے،

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ-۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، اور نہ اُن کو حاکموں تک پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو،

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسرون نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت مین صاف وصریح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونون پر لعنت فرمائی ہے[1]، رشوت دینے والے پر یون کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے، اور جرم کی اعانت قانون اخلاق دونون مین منع ہے۔

خیبر کے یہودیون سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد اللہ بن رواحہ صحابی کو بھیجے وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے، اور کہدیتے تھے کہ ان دو مین سے جو چاہو لے لو، یہودیون نے اپنے دستور کے مطابق اُن کو بھی رشوت دینی چاہی آپس مین چندہ کرکے اپنی عورتون کے کچھ زیور اکٹھے کئے، اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلے تقسیم مین ہمارا حصہ بڑھا دو، یہ سُن کر حضرت ابن رواحہ نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق مین مجھے مبغوض ہو لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہین کرسکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے، وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہین کھاتے" یہودیون نے ان کی یہ تقریر سُن کر کہا کہ "یہی وہ انصاف ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہین"[2]

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمّال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[3]، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ [2] موطا امام مالک کتاب المساقات [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ و کتاب الجہاد

مین کرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہوکر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا،

"عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہین تو آکر کہتا ہی کہ یہ تمہارا ہے، اور یہ میرا ہے، تو اپنے باپ یا مان کے گھر مین بیٹھ کر نہین دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہین یا نہین قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، وہ اس مین سے جو لیجائے گا وہ قیامت مین اپنی گردن پہ لادکر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپ نے اپنے دونون ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا، خداوندا مین نے پہنچا دیا[1]"

اس تقریر مین آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے،

[1] صحیح بخاری باب ہدایا العمال،

سُودخواری

سود خواری حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہی، حرص وطمع تو یون کہ سود خوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اُس کے پاس آجائے، بخل یون کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہین چاہتا، اور نہ کسی کار خیر مین دے کر اپنے سرمایہ مین کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خواری کا ذکر زکواۃ اور خیرات کے مقابلہ مین کیا ہے، اور ظلم یون کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگون کو اُن کی محنتون کے پھل سے محروم کر دیتا ہے، اور رحم نہین کرتا، اسی لئے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا،

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ۲۸ - ۳۸)

نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے،

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اس سے زیادہ لو، تو یہ تمھارا ظلم ہے، اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے، تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خواری کی عادت بھی عرب مین یہودیون کی بدولت

پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے، اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا	اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ
عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ	وہ اس سے روکے گئے تھے، اور لوگوں
بِالْبَاطِلِ ط	کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے
(نساء-۲۲)	سبب سے،

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جارہی تھی ہمیشہ کیلئے دور کردیا،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا	جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے
يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ	جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ	لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں، یہ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ	اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ خرید و
مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ	فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح
وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ	ہے، اور اللہ نے خرید و فروخت کے
مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ	معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے،
وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ	تو جس کے پاس اس کے پروردگار
فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا	کی نصیحت پہنچی، اور وہ باز رہا، تو

خٰلِدُوْنَ ۞ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۞ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۞ (بقرہ - ۳۸)	ان میں ہمیشہ رہیں گے	اس کا جو پہلے دیا گیا، اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے، خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ وخیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو

قیامت میں سود خوار کا بدحواس ہوکر اٹھنا اُس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی دنیا میں سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے، کیونکہ خدا نے جو دولت اُن کو دی تھی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کارِ خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا، اور ظلم سے اُن کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا، اور یہ نعمت کی ناشکری تھی،

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہوگئے تھے جو سودی کاروبار کرنے لگے تھے، جیسے حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اب وہ اور اُن کے مقروض جب مسلمان ہوئے، اور ان میں سے قرضداروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پچھلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ
لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ
اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۝ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ
اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(بقرہ ع - ۳۸)

اے ایمان لانے والو، خدا کا خیال
کرو، اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو
اگر تم واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو
تو اللہ اور اُس کے رسول سے لڑائی
کے لئے ہشیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ تو تمہارے
لئے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر
ظلم کرو، اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے، اور
اگر وہ مقروض تنگدست ہو تو اس کو
کشادگی تک مہلت دو، اور معاف کر دو تو
تمہارے لئے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ
ہو، اور اس دن سے ڈرو جس مین تم خدا
کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر کسی کو
وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا
اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا،

ان آیتون مین یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا، جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائین گے، اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہو گا، اس کا حساب ہو گا تو اگر تم نے نیکی کی ہو گی، اور مقروضون کو معاف کیا ہو گا تو خدا کے یہان پورا پورا مل جائے گا،

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں، تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے، اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیتے، یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، خدا نے فرمایا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا	اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا
الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً	چوگنا سود مت کھاؤ، اور خدا سے
وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ	تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ، اور
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ	اس آگ سے بچو، جو منکروں کے لئے
لِلْكٰفِرِيْنَ (آل عمران-۱۴)	تیار کی گئی ہے،

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سود خواروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے، فرمایا، میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لئے کنارہ کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے، تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے، اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے

ؔ صحیح بخاری کتاب الجنائز، باب اولاد المشرکین و کتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد صلاۃ الصبح،

پیٹ مین چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرئیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر مین تیر رہا ہے، سود خوار ہے،[۱]

سزا کی مماثلت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہین، سود خوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون مین تیرتا ہے، اور جو پتھر لقمۂ تر بن کر اُس کے منھ مین چلا جاتا ہے تو وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے،

گناہ کے شریک وہ بھی ہین جو کسی گناہ کی اعانت مین شریک ہون، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی،[۲]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین وکتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح

[۲] ابو داؤد کتاب البیوع،

شراب خواری

شراب خواری اُن عادات ذمیمہ مین سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے، پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہو کہ دنیا کی اکثر قومین اس مین مبتلا نظر آتی ہین، اسلام سے پہلے جو مذہب تھے اُن مین بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے، اور اس کا پینا اچھا نہین سمجھا گیا ہے[1] لیکن اُس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی مین پڑی تھی، شراب پینا پلانا، اچھے اچھے گھرانون مین لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، یہ بیان[2] عمرو کو اور چھوٹے اپنے بزرگون کو اپنے ہاتھون سے پلاتے تھے[3]،

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگون نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت مین گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس مین لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے، جس سے دلون مین آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ مین آتے، تو جو اونٹ ملتا

---

[1] لوقا ۱۔ ۱۵۔ [2] سبعہ معلقہ مین قصیدہ الاہبی بصحنک

[3] صحیح بخاری کتاب الاشربہ

اس کو پھاڑ ڈالتے، اور یہ نہین دیکھتے کہ یہ کس کا ہے، اور ساتھیون کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا، اور اس مین مویشیون کی بازی لگاتے، اُن کو ذبح کرکے اُن کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے، اور بچ رہتا تو غریبون کو بھی کھلاتے،

اسلام آیا تو اُس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی، پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہین، خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بہت بڑی نعمت ہین لیکن تم اُن سے نشے تیار کرتے ہو، اور کھانے پینے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا،

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ	اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے تم
تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا	اُن سے نشہ بناتے ہو، اور اچھی روزی
حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً	اس مین ان لوگون کے لیے خدا کی
لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ، (نحل - ۹)	نشانی ہے، جو سمجھتے ہین،

اس آیت مین نشہ کو "رزقِ حسن" کے مقابلہ مین رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ رزقِ حسن[1] نہین، ان آیتون مین میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہین ہین[2] اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشون کے اندر سے کیسا پاک صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونون پیدا ہوتی ہین

---

[1] سبعہ معلقہ مین طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری مین حضرت حمزہؓ کا قصہ [2] تفسیر کبیر امام رازی مین مفسرین کی مختلف رائین ہین،

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى	تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ
حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)	جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکایا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑدی، اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا،

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوئے
قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ	کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ
لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ	کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور
نَّفْعِهِمَا ط	لوگوں کے لئے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی
(بقرہ - ۲۷)	ہیں، اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے، لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں، اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا، اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا، اس لئے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَ
الْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ
رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ
أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ
فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ
ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ
أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ (مائدہ - ۱۲)

اے ایمان والو! شراب اور جوا، اور
چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے
کام ہین شیطان کے، سو ان سے بچتے
رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی
چاہتا ہو کہ تمہارے آپس مین شراب اور
جوے سے دشمنی اور بیر ڈال دے، اور تم کو
اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو
اب تم باز آتے ہو،

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا، خداوندا! ہم باز آگئے،[1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیون مین خم اُلٹے جا رہے تھے، اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی،[2]

اس آیت مین اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہین، اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے، دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس مین لڑتے جھگڑتے ہین، اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اُس کے بہت سے ضروری کامون سے غافل کر دیتی ہے، ان تینون اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے،

اوپر کی آیت مین شراب اور جوے کو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہین، ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوے کو چڑھاوے کے بتون اور بانٹ کے پانسون

[1] ابوداؤد، اشربہ [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ،

کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور بُرے کاموں میں سے شمار کیا ہے، اس لئے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں، اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی بُرائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب اُن کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ (قصص - ۲) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی بُرا کام ہوا، اسی طرح اس آیت اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (بنی اسرائیل ۳) "بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں" کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، بُوے، بتوں کے چڑھاوے، اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے اُن کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے، کون نہیں جانتا شراب خواری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان، اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں،

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی، معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں، اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی بُرائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد، اور نماز سے جو زندگی کا سب

بڑا فرض ہے غافل ہوجاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کیساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا، اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہوجاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے، قرآن نے اس کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھالے، وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبویؐ پہ کھڑے ہوکر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے"[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے"[2] فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی، اور اس سے توبہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا"[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے، تو آپ کے سامنے دست غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا، ناموس وحی حضرت جبرئیلؑ نے کہا اس خدا کی حمد جس نے آپ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے، تو آپ کی امت گمراہ ہوجاتی،[4] گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے،

حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "کوئی مومن شراب پیتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہوجاتا ہے"[5] یہ بھی فرمایا "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا"[6]

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم و متعلقات بھی مسدود ذرائع

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [2] صحیحین کتاب الاشربہ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] صحیحین کتاب الاشربہ [6] ایضاً

کے طور پر حرام کئے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہوگئے، تو اس سختی کو اٹھا دیا[1]۔

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ) "گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو" کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرا یا گیا، فرمایا "خدا نے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لئے نچوڑنے والے، اپنے لئے نچوڑنے والے، اس کے لیجانے والے اور جسکے پاس لیجائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے[2]" یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے، اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو، اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے[3]"

---

[1] صحیحین کتاب الاشربہ [2] ابو داؤد کتاب الاشربہ [3] صحیحین و ابو داؤد و ترمذی کتاب الاشربہ،

غیظ وغضب

غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیہودہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے، اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (آل عمران-۱۴) اور دوسری جگہ فرمایا، وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ ○ (شوریٰ-۴) "اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں" انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے، معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے، اور معاف کر دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے"۔[1]

---

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب، بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہ بن قدامہ، حضرت ابو درداؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہو کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اُس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی، تو اُس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپنے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو[1] مسند احمد میں ہو کہ اُن صاحب کا بیان ہے کہ پھر مین نے دل مین غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت مین ساری برائیوں کی جڑ ہے،

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہین کہ ایک دفعہ آپنے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتین فرمائین جن مین سے ایک یہ تھی، فرمایا آدم کے بیٹے کئی طبقون مین پیدا کیے گئے ہین، ان مین کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر مین آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہی اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور وہ بھی جلد ہو جاتا ہی، تو ان دونون مین ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے، اور وہ رفع بہت دیر مین ہوتا ہے، تو ہان! ان مین سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر مین آئے، اور وہ جلد ہو جائے اور ان مین سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو، اور وہ بہت دیر مین جوتا ہو، ہان! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہین کہ اُس کی آنکھین لال اور گلے کی رگین پھول جاتی ہین، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب) [2] جامع ترمذی (منذری باب مذکور)

ابوداؤد مین ہے کہ آپ نے فرمایا غصہ شیطان سے ہی اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہی، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہئے کہ وضو کرلے[1]، حضرت ابوذرؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے[2]،

صحیحین مین ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبون مین کچھ باتین ہوگئین ان مین سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہوگیا، اور رگین پھول گئین، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہی کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کہے[3]

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہی،

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ	معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی
وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ وَاِمَّا	کی بات کہہ، اور نادانون سے درگذر
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ	کر، اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھارے
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ	تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہ سننے
عَلِيْمٌ (اعراف ۔ ۲۴)	والا اور جاننے والا ہے،

اسی قسم کی آیت سورۂ حٰم السجدہ (۵) مین بھی ہی جس کا ترجمہ یہ ہی،

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظاً [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب،

"نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی، وہ ایسا ہو جائیگا جیسے دوست رشتہ والا، اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہی سننے والا جاننے والا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآنِ پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لئے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہئے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا، اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے، تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا،

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیلِ ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی، اور غصہ کم ہو جائے گا، دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی،

بغض و کینہ

دل مین کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیر پا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بُری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہین، اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف فرمائی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے
الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ	بھائیون کو جو ہم سے آگے ایمان مین
وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا	پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلون
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ	مین ایمان والون کا کینہ مت رکھ،
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	اے ہمارے پروردگار تو نرمی والا
(حشر-۱)	مہربان ہے،

جنت کی خوبیون مین سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس مین جو لوگ ہون گے، آپس مین بھائی بھائی ہون گے، وہان بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا فرمایا،

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ	اور ہم نے اُن کے سینون سے جو کینہ تھا
مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ	نکال لیا، بھائی بھائی ہوکر تختون پر
مُّتَقٰبِلِیْنَ ۝ (حجر-۴)	آمنے سامنے بیٹھے،
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ	اور ہم نے اُن کے سینون سے جو کینہ
مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ	تھا نکال لیا، نہرین اُن کے نیچے بہتی
الْاَنْهٰرُ ج (اعراف-۵)	ہون گی،

ان آیتون کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیون مین کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی مین جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہئے، فرمایا،

"اے لوگو! آپس مین ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، اور اے اللہ کے بندے بن کر آپس مین بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لئے حلال نہین کہ اپنے بھائی کو تین دنون سے زیادہ چھوڑ دے[1]"

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیون مین کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنون سے زیادہ کوئی اپنے دل مین نہ رکھے، ابوایوبؓ صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے حلال نہین کہ اپنے بھائی کو تین دنون سے زیادہ چھوڑ دے، دونون ملین تو ایک دوسرے سے منھ پھیرے، اور

[1] صحیح بخاری ومسلم ومالک، ابوداؤد، ترمذی، نسائی،

ان دونون مین بہتر وہ ہے جو سلام مین پہل کرے[1]"

ایک اور روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کسی مومن کے لئے جائز نہین کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے تین دن جب ہوجائین تو ان مین سے ہر ایک دوسرے سے اگر ملے پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا، تو دونون کو مزدوری ملی، اور اگر اس نے جواب نہین دیا، تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا[2]"۔ کئی حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہین، تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہین کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے لیکن جن دو آدمیون مین آپس مین کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونون کو ابھی رہنے دو میل کرلین[3]،

اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہین تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی، اس کو مغفرت دی جاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہوگی، اس کی توبہ قبول ہوتی ہے لیکن کینہ والون کے اعمال اُن کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہین، جب تک وہ اس سے باز نہ آئین[4]"۔ یہ بھی حدیث مین ہے کہ "آپ نے فرمایا تین شخصون کی بخشایش نہین، ان مین سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہے[5]"،

ان حدیثون پر غور کیجئے شرک اور کینہ دونون کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے،

---

[1] مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد [2] سنن ابی داؤد [3] مالک و مسلم، ابوداؤد ترمذی و ادب المفرد بخاری [4] طبرانی فی الاوسط (منذری ج ۲ ص ۳۴۶ مصر)

[5] ادب المفرد بخاری باب الشحناء،

دین دو چیزون سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندون کا حق، جب تک شرک رہے گا، اللہ کا کوئی حق ادا نہین ہو سکتا، اسی طرح جن دو آدمیون مین کینہ رہے گا، اُن مین سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا، غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور ان ہی دونون حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنّت کی کنجی ہے،

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہان تک کہ کفر و شرک اور عصیان کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہان مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندون پر کرتے ہیں، قرآن میں اس کے لئے دو اور لفظ بَغِی (سرکشی) اور عُدْوَان (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے،

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ
وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ
(اعراف - ۴)

کہدے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کامون کو جو کھلے ہون یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھرایا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
وَالْبَغْيِ ه (نحل - ۱۳)

اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور سرکشی سے منع کرتا ہے،

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے، تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن وامان کو برباد کر ڈالے، اُس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے، اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں، گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اُس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ بُرائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں،
هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ	اور بُرائی کے عوض اس طرح کی
سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ-۴)	بُرائی ہے،

یعنی جیسی بُرائی کوئی کرے، ویسی ہی برائی اُس کے ساتھ کی جائے،

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کردے، تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا، اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا،

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى	پھر جو کوئی معاف کردے، اور سنوار دے
اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ	تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے
(شوریٰ-۴)	بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے، اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی،

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ	اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے

فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ‏ (شوریٰ - ۴) — بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں،

ملامت اُس پر ہے جو لوگون پرظلم کرنے مین پہل کرے، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرے،

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ‏ (شوریٰ - ۴) — راہ اُن پر ہے جو لوگون پرظلم کرتے ہین اور زمین مین ناحق دھوم مچاتے ہین، اُن کے لئے دکھ والی سزا ہے،

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلبِ قصاص کی منصفانہ اجازت دیگئی،

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ‏ (اسرائیل - ۴) — اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے مین زیادتی نہ کرے، بے شبہہ اس کو مدد دی جائے،

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا مین عدل قائم ہو، لیکن مقتول کے وارثون کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش مین حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزون اور دوستون کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگین، ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام مین بھی کبھی ختم نہ ہوگا،

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیون کو علانیہ بیان کرے، اس کے دو فائدے ہین، ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے مین کچھ

بچ جاتے ہیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند
مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ	نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ (نساء ۲۱)	اللہ سنتا جانتا ہے،

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے، تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگون کریں،

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى	تو اگر اُن میں سے ایک دوسرے پر
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ	چڑھ آوے تو سب لڑو اس چڑھائی
حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ،	والے سے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے
(حجرات-۱)	حکم پر پھر آئے،

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کیجائے، اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے، تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہئے، فرمایا،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ	اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ
صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس
اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى	جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی
الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا	کر بیٹھو، اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں

عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۝	پر ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝	کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک
(مائدہ ۷-۱)	وہ سخت سزا والا ہے،

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا مین مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا مؤثر حربہ جس کا نام آجکل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے، اور صاف وصریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم وتعدی کے کامون مین ظالمون کا ساتھ نہ دیا جائے اور اُن کے ظلم کے کامون مین شریک نہ ہوا جائے، البتہ اس عدم شرکت کی صورتین زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہین،

حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانون کو فرمایا کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا" اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے[1]" اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالئے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلاکر سننے والون کے دلون مین توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل وجان متوجہ ہوگئے، تو اس کمالِ التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہو کہ اس کو ظلم کی بُرائی سے روکا جائے،

---

[1] صحیح بخاری ابواب المظالم وصحیح مسلم باب نصر الاخ ظالمًا او مظلومًا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی فرمایا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! میں نے اپنے لئے اور تمہارے لئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"[۱]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات[۲] بنجائیگا" ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادّہ عربی میں ایک ہی ہے، ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی، انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھاپن قیامت کے دن ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہوگا،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہیئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے، اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے"[۳] براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا، اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے[۴] حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں"[۵]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا

---

[۱] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ ص ۱۵۴ و ص ۱۶۰ و ص ۱۷۷، ادب المفرد بخاری باب الظلم [۲] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم [۳] صحیح بخاری ابواب المظالم [۴] ایضاً [۵] صحیح بخاری ابواب المظالم

کسی چیز پر ظلم کیا ہو، تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہو گا نہ درہم ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی، اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی[۱]۔ فرمایا کہ ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں[۲]!

فرمایا اہل ایمان دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنّت اور دوزخ کے درمیان ایک پُل کے پاس روکے جائیں گے، وہاں دُنیا میں ایک نے دوسرے پر جو ظلم کئے تھے، اُن کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے، تب اُن کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی[۳]۔

---

[۱] صحیح بخاری ابواب المظالم [۲] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [۳] صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر و غرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا، یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے، تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں، دنیا میں سب سے پہلے اس بد اخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (اعراف ۱) میں اس سے بہتر ہوں، وہ مٹی سے بنا ہے، اور میں آگ سے بنا ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ (اعراف ۲) یہاں سے اُتر جا، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی،

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لئے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ

ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا "نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے، اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے"[۱]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا، پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے،

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ابراهيم-۳)	اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کھڑے ہوں گے، تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں سے کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو،

اللہ تعالی نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا، لیکن انھوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول

[۱] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر،

کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے،

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ، (مومنون-۳)	تو وہ سب شیخی میں آگئے، اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ،

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے اُن کو اُس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں،

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ، (هود-۳)	اس پر اُن کی قوم کے سردار جو (ان کو) نہیں مانتے تھے، لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو، اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمھارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں، (اور پیرو بھی) بھی گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں،

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے

آپ کو مذہبی، قومی سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگون سے یا خود پیغمبرون سے بڑا سمجھتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین نہایت شدت سے ان لوگون کی برائی بیان کی ہے، اور مختلف الفاظ مین بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیشِ نظر ہو جائین، عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہین بعض جگہ ان کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ	لیکن جو لوگ منکر ہین (ناحق کی)
وَّشِقَاقٍ ؕ (ص-۱)	ہیکڑی اور مخالفت مین پڑے ہین

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبّار اختیار کیا ہے،

کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ	جتنے مغرور اور سرکش ہین، اللہ ان کے
قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ (مومن ۴)	دلون پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے،

دو موقعون پر اس کے لئے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہین، جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہین،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ	اللہ اس کو پیار نہین کرتا جو مغرور
مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔ (نساء-۶)	اور فخار ہو،
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (نحل ۳)	اللہ غرور کرنے والون کو پسند نہین کرتا،

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی نہین دے دی گئی ہے،

اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی	کیا جہنم مین مغرورون کا ٹھکانا
لِّلْمُتَکَبِّرِیْنَ ۔ (زمر-۶)	نہین،

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ٥ (زمر۔۸) تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے،

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ اُن کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے،

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر وغرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، اُن کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو، جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے، غرض اس کے ثمرات ونتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور اسی بنا پر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1]، اور امام غزالی نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں، وہی جنت کا دروازہ ہیں، اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لئے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہیگا،

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج

---

[1] ابو داؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر،

گوناگون صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اس لئے اُن سب کا استقصار تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کردیئے ہین، مثلاً کبروغرور کے جو مظاہر امرار وسلاطین سے تعلق رکھتے ہین اُن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہین، اس کو اپنا ٹھکانا جہنم مین بنالینا چاہئے" ایک بار آپ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے، تو صحابۂ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے، فرمایا کہ عجمیون کی طرح تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوا کرو،[1]

بڑے آداب والقاب کا اپنے نامون کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلاف واقعہ ہون تو جھوٹ ہے، اور اگر واقعہ کے مطابق ہون تو فخروغرور کا ذریعہ ہین عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہو کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے"۔[2]

کبروغرور کی چند عام اور بدنما صورتون کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین کیا ہو مثلاً

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا	اور زمین مین اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس
إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ	دھماکے کے ساتھ چلنے سے) تو زمین کو
وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝	تو پھاڑ نہین سکے گا، اور نہ (تن کر چلنے
(بنی اسرائیل - ۲)	سے) پہاڑون کی لمبائی کو پہنچ سکے گا،
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ	اور لوگون سے بے رُخی نہ کر اور زمین

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [2] صحیح بخاری۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا	زمین اترا کر نہ چل، بیشک اللہ اس کو
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ	پیار نہیں کرتا، جس کو گھمنڈ ہو
فَخُوْرٍ (لقمان-۲)	فخار ہو،

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے،

ثَانِيَ عِطْفِهٖ، (حج-۱)	اینٹھتا ہوا،

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے،

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ	جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا
اللّٰهُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ،	خدا اسکی طرف قیامت کے دن نہ دیکھیگا،

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا، تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے[۲]، اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع وخاکساری پر دلالت کرتے ہیں، اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ		اور (خدائے) رحمن کے (خاص) بندے
يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا	(فرقان-۶)	تو وہ ہیں، جو زمین پر فروتنی کے ساتھ
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ		چلیں، اور جب جاہل ان سے (جہالت
قَالُوْا سَلٰمًا،		کی) باتیں کرنے لگیں تو (ان کو) سلام

[۱] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار [۲] ترمذی ابواب الزہد،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو زانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا، اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے، فرمایا "خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے"[۱]

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمل اوڑھتا ہوں، اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا"[۲]

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیادار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں، وہ یہ ہیں حسب و نسب، حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں،

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب نسب کی برتری کا خیال تھا، اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا،

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا، (حجرات۔۲)	لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں؟

---

[۱] ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئاً [۲] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر،

اس کے بعد بتایا کہ شرافت وعظمت کی بنیاد نسب، حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ — اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہو

(حجرات-۲) — جو تم میں بڑا پرہیزگار ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی، اور فرمایا کہ "خداوند تعالیٰ نے تمھاری جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار، اور بدکار بدبخت، تم لوگ آدمی کے بچے ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں، یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں، جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے۔"[1]

جہاں تک زیب وزینت اور جسم کی ظاہری آرایش اور پاکیزگی کا تعلق ہے حسن وجمال کو ایک قابلِ قدر چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتہ عمدہ ہو، تو فرمایا کہ "خدا حسن کو پسند کرتا ہے"[2] یعنی اس کا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن وجمال، غرور وتکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے شریعت نے اُن کی ممانعت کی ہے، چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہبند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا۔[3]

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال ودولت کی اہمیت کو قائم رکھا، اور

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الکبر [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی اسبال الازار۔

اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قیام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنالیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں،

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل
لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ	اور تماشا اور ظاہری طمطراق، اور آپس
بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ	میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک
وَالْاَوْلَادِ،	دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار
(حدید۔ ۳۰)	ہونا (بس یہی کچھ ہے)،

احادیث میں مال و دولت کی بُرائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا، اور پہن کر پھاڑ ڈالا[1]،

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدنی، مذہبی، اور سیاسی کام

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا،

انجام دیے جاسکتے ہیں، اس لئے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابلِ ستائش وصف ہی، یہی وجہ ہی کہ خداوند تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوی امین کہا ہی، اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہی،

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ، (ھود - ۷)

(لوط) بولے کہ ای کاش (آج) مجھ کو تمھارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا،

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوعِ انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے،

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً، (روم - ۶)

اللہ ہی وہ (قادرِ مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا پھر (طفلی) (کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی،

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے،

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہوسکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے سازوسامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے

لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، (انفال - ۸)		سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) اُن کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے خوب

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع وخاکساری کی فضیلت ہے، جو ایک قابل ستایش وصف ہے اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ الْجَنَّةِ كُلُّ ضَعِيْفٍ مُتَضَعِّفٍ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَهْلِ النَّارِ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُتَكَبِّرٍ	کیا میں تم کو بتادوں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتادوں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص

دوسری حدیث میں ہے،

احتجت النار والجنة فقالت	دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا، دوزخ

ـــــــــــــــــــــــــ

[۱] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز [۲] بخاری کتاب الادب باب الکبر،

هٰذ ہٖ یدخلنی الجبارون	نے کہا مجھ مین جبار اور متکبر لوگ داخل
المتکبرون وقالت ھذہٖ	ہوئے، اور جنت نے کہا کر مجھ مین کمزور
یدخلنی الضعفاء والمساکین[1]	اور مسکین لوگ،

ان حدیثون سے معلوم ہوتا ہی کہ اسلام مین ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہین ہی، بلکہ اس کو صرف اس لیئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے،

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیئے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے، بالخصوص غیر متمدن قومین ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہین، اور اس فخر وغرور کے نشہ مین دوسرون کو حقیر سمجھتی ہین، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہین، زمانہ سابق مین اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان وانصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا، اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزین ہمیشہ قائم رہین گی، اور قیامت کبھی نہ آئے گی، اور اگر آئی بھی تو قیامت مین بھی اُس کی یہی شان قائم رہے گی، وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے،

اَنَا اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا،	مین تجھ سے زیادہ مالدار ہون اور میرا
(کہف - ۵)	جتھا بھی) بڑا زبردست (جتھا) ہی،

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ مین کہتا ہی کہ ایک حقیر انسان کیلیئے اس قدر کبر وغرور بجا نہین

[1] مسلم کتاب صفات المنافقین واحکام باب النار یدخلہا الجبارون،

أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ	کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ	تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا،
رَجُلًا ۝ (کہف - ۵)	پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا،

نتیجہ یہ ہوا کہ عذابِ الٰہی نے اس کی دولت کو ملیا میٹ کر دیا، اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا، اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر و غرور کے قابل نہیں، اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر و غرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا، اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا جس نے اُن کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی،

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ	تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک
الْمَقَابِرَ ۝	دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے
	غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں
(تکاثر - ۱)	سے جا ملتے ہو،

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی و تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے،

تَزَوَّجُوا الودود الولود فانی	محبت کیش اور بچے جننے والی عورت

مکاثر بکم الامم[1]،

سے نکاح کرو، کیونکہ کثرت تعداد مین

مین تم پر دوسری قومون کے مقابل مین

فخر کرون گا،

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قومون اور ملکون کی سیاست کا رُخ بدل دیا ہے، اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا،

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار،

ریا

ریا کے لغوی معنی دکھاوا اور نمایش کے ہین، انسانی اعمال کی اصل حقیقت اُن کی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اس لئے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی اور بُرائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے، صحیح حدیثون مین ہے کہ انما الاعمال بالنیات عمل نیت سے ہی، اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض و غایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمایش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہو کہ انسان اپنی اچھائی اور بڑائی کا اظہار کر کے لوگون مین اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے، اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے، غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہین، اسی لئے قرآن نے ان دونون کو ایک ساتھ جگہ دی ہے، اور اُن کی برائی بیان کی ہے، جہاد مین مسلمانون کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور، اور اپنی قوت کی نمایش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا ۔۔۔ اور ان لوگون جیسے نہ ہو جاؤ، جو

مِنْ دِیَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ	شیخی کے اور لوگون کے دکھانے کے لئے
النَّاسِ (انفال-۶)	اپنے گھرون سے نکل کھڑے ہوئے،

یہ ریا اور نمایش انسان کے ہر اُس عمل مین ظاہر ہوتی ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرکِ اصغر رکھا ہے، کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال مین خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کرلیا جاتا ہی، اسی لئے خدا فرماتا ہے،

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ	کیا تونے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی
هَوَاهُ، (فرقان-۴)	خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

ایک حدیث مین ہی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مین شرک سے بے نیاز ہون تو جو شخص میرے لئے کوئی ایسا عمل کرے جس مین کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہین، وہ اسی کے لئے ہے جس کو اس مین شریک کرلیا گیا ہے؛

ایک صحابی روایت کرتے ہین کہ قیامت کے دن جب خدا اگلون اور پچھلون کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل مین جو خدا کے لئے کیا گیا ہی، کسی اور کو شریک کرلیا ہے، وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے، کیونکہ اللہ شرک سے سب سے بے نیاز ہے،

ایک حدیث میں ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھکو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہی، لیکن مین یہ نہین کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتون کی پرستش کرنے لگے گی

بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگون کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی؛[1]

اسلام کے لغت مین کفر کے بعد برائی مین نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ یہ کہ دل مین کچھ ہو، اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا، اور نمایش کے سوا کچھ نہین رہ جاتی ہی، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدون کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجا لاتا ہی اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال مین ریا کاری پائی جاتی ہے، اس بنا پر قرآن مجید مین جابجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى	اور (سائل کو) طعن دے کر اُس شخص
كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ	مال لوگون کے دکھانے کے لئے خرچ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ،	کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت کا یقین
(بقرہ-۳۶)	نہین رکھتا،

منافقون کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتین ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ اُن کا مقصد ایک جماعت مین شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہین ہوتا، دوسرے یہ کہ اُن کے ذریعہ سے لوگون پر اثر ڈالنا، اور اُن کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے، پہلا

[1] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ،

مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہین، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع، للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے،

عہدِ رسالت مین منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانون کی جماعت مین شامل رہین، اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے اُن کو مسلمان سمجھتے رہین، اسی لئے ایسے شخص کے عمل مین للّٰہیت اور خلوص نہین پیدا ہو سکتا،

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ	منافق (مسلمانون کو دھوکا دے کر
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَ	گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہین، حالانکہ
اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ	(حقیقت مین) خدا اُن ہی کو دھوکے
قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ	مین رکھے ہے، اور (یہ لوگ) جب
النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ	نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہین تو
اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝	الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہین،
	(ظاہرداری کرکے) لوگون کو دکھاتے
(نساء-۲۱)	ہین، اور (دل سے) اللہ کو یاد نہین

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ	تو ان (منافق) نمازیوں کی (بڑی)
عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ،	تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے
الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ،	غفلت کرتے ہیں، اور وہ جو (کوئی
(ماعون)	نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟" صحابہؓ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرک خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے، اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے۔[1]

چونکہ اور نمائش اعمال کی اصلی شکل و صورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی، اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز تو داد و دہش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے، بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیر

[1] ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ۔

کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لئے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (بقرہ۔ ۳۷)	لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ، اور حاجتمندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام ونمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا، جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔[1]

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام ونمود کی جو چیز تھی، وہ شجاعت تھی، اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، اس لئے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین،

مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے، ایک شخص شہرت کے لئے، اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، فرمایا اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو۔

آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے، تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے؟ وہی پہلا جواب[1] ملا۔

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے، اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی، اس کے نتائجِ بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر طریقہ سے بتائے، ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا، اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے اُن سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا، اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے، اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا، اور قرآن پڑھا، اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا، اور تیرے لئے

---

[1] مسلم کتاب الامارت باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اسلئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا، وہ کہیگا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ بکتے ہو تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[1]

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق بالنار۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی اور خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس مین اور کبر مین یہ فرق ہو کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسرون سے بڑا سمجھتا ہو، لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے، یہان تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کرسکتا ہے،

اصل یہ ہو کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیان نظر آتی ہین، وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے، اور یہ تمام کمالات اور خوبیان اس کو ایسی معلوم ہوتی ہین، گویا وہ خود اس کی اختیاری ہین، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہین، اسی کا نام عُجب اور خود بینی ہے، اسی سے نفس مین خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے، اور اکثر حالتون مین وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے،

حُنین کی لڑائی مین مسلمانون کی تعداد کافرون سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانون مین عُجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کرسکتا ہے، خدا کو اُن کی یہ شان پسند نہ آئی، فوراً شکست کا

اثر دکھائی دینے لگا، اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرتِ الٰہی نے اُن کے پاؤں تھام لئے، اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا،

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ	اور حنین کے دن جب تمھاری کثرتِ تعداد
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا،	نے تم میں خود بینی پیدا کردی تو اس تعداد
(توبہ - ۴)	کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا،

اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو اُن میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمایش نہ پیدا ہو، بلکہ اُن میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا	اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے
مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ	گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے
النَّاسِ، (انفال - ۶)	نکلے،

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمایش کو نکلے تھے

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے، اور نہ بندوں کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے، اور یہی اُن کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا،

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ	اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کریں جب
مَعِيشَتَهَا (قصص - ۶)	وہ اپنے گذران میں اترا چلیں،

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ

برباد ہو جائے گی یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کریگا، اور اترائے گا، اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے[1]،

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلی کی ممانعت فرمائی ہے،

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ	تو (بہت) اپنی پاکیزگی نہ جتایا کرو،
بِمَنِ اتَّقٰى، (نجم-۲)	پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے،

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عُجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے،

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ	اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ
اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں
قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ	(اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے
زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ	یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہو کہ اور
مِنْ دُوْنِ النَّاسِ، (جمعہ-۱)	تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عُجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب ہے

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم،

زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا،

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا، حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا"۔ ایک بار آپ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہو تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں[1]، مدح کی یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عُجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے، اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے، فرمایا،

لَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (حدید - ۳) خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما یکرہ من التمادح،

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب مین آیا، اور عربون کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لئے تمام مذہبون مین اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہی جس نے فضول خرچی کو روکا ہے، اور انسان کو اپنی حد مین رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بُری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہین پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمایش کے پردہ مین ظاہر ہوتی ہو اور ان بداخلاقیون کی بُرائی چھپی نہین،

اہلِ عرب جب جلسون مین شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا مین جو کچھ جیتتے نشہ کے ترنگ مین اسی وقت لٹا دیتے، جانور ہوتے، تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے، جاہلیت کی شاعری مین اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہین، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہان تک کہ دونون مین ایک کے تمام اونٹ

ختم ہوجاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا،[1]

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی، اور اس نے اُن کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کردی تھی، اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہوجاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمایش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے، اس بے اعتدالی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے، اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ	اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ	(ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو
تَبْذِيْرًا، اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ	اور (دولت کو) بیجا مت اڑاؤ، کیونکہ
كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ	دولت کے) بیجا اڑانے والے شیطانوں
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا	کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار
(اسرائیل ۳۰)	کا بڑا ہی ناشکرا ہے،

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے، امام رازی اس

[1] ابوداؤد ۲ ذباح،

آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

"بعض علما کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہلِ عرب کی عادت کے موافق ہے کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر وغیرہ کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے"

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے، اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہیدست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ اسے تمھیں کو لوگ قابلِ ملامت ٹھرائیں گے،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا، (بنی اسرائیل - ۳)	اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ گویا گردن میں بندھا ہے، اور نہ بالکل اسکو پھیلا ہی دو، (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے، اور تم تہی دست بھی ہوگے،

چونکہ یہ اعتدال کا وصفِ خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا،

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ	اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں، اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا

قَوَامًاo (الفرقان-۶۰) خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدہیئتی کو پسند کرتا ہے، اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہی، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورۂ اعراف میں خدا فرماتا ہی،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ	اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بیشک اللہ
لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَo (اعراف-۳)	فضول خرچی کرنیوالوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسرون کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں،

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ	درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم
اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا	کھاؤ، اور اس کا حق ادا کرو جب فصل
تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ	کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے
(انعام-۱۷)	آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے تو ان چیزون کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل مین ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہین اور یہ کوئی بداخلاقی نہین، بلکہ دینی امور مین پسندیدہ ہے لیکن اگر وہ ان چیزون کو دوسرے کیلئے پسند نہ کرے، اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتین اس سے چھین لی جائین تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے، کیونکہ عہد رسالت مین خدا تعالیٰ نے مسلمانون پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانون کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے،

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا
آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ،
(النسآء - ۸)

یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگون کو نعمت
(قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے
مرتے ہین۔

اور اُن کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے،

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ	(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے
يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم	تمھارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر
(بقرۃ ۔ ۱۳)	بنادیں،

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں،

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کرلی جائے گو وہ اُس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے، اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائیں،

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا	ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس
فَتَكُونُونَ سَوَاءً،	طرح خود کافر ہو گئے ہیں، اسی طرح
	تم (بھی مسلمان) بھی کفر کرنے لگو اور
(نسآء ۔ ۱۲)	وہ اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہوجاؤ

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہیں سکتی، اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کرلی جائے،

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے،

ان مین پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت مین چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہین ہوتا، اس لئے اس کو حقیقی معنون مین حسد تو نہین کہہ سکتے، تاہم قرآن مجید مین ہے:-

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۝ (النساء - ۵)	اور خدانے جو تم مین سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے، اس کا کچھ ارمان نہ کرو،

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہین ہے، اس لئے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہین، اسی لئے فرمایا،

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء ۵)	اور خدا سے اس کا فضل مانگو،

تیسری صورت بالکل مذموم نہین بلکہ دینی امور مین مستحسن ہے، اور شریعت مین اسی کو مسابقت کہتے ہین،

حسد کے سات اسباب ہین،

(۱) بغض و عداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونون یکسان ہون اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت

آئے اور جب مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے، تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا، اور اسی کا نام حسد ہے،

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی،

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ	چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے، دشمنی
الْبَغْضَاءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ	تو اُن کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی
وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ	ہے، اور (غیظ و غضب) جو اُن کے
اَکْبَرُ ۚ	دلوں میں (بھرے) ہیں، وہ اس سے
(آل عمران - ۱۲)	بھی بڑھکر ہیں،
اِنْ تَمْسَسْکُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ	(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے،
وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا	تو اُن کو بُرا لگتا ہے، اور اگر تم کو کوئی
بِهَا، (آل عمران - ۱۲)	گزند پہنچے، تو اس سے خوش ہوتے ہیں

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے،

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے، اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے، اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب

اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہوجائے،

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہو کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہو، اس لئے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہو، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے، کفار قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے،

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا،	کیا یہی (ذلیل) لوگ ہین جن پر اللہ نے ہم مین سے (اسلام) کی توفیق دیکر)
(انعام-۶)	اپنا فضل کیا ہو،

حسد کا یہ سبب کا بر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسرون کی تحقیر و تذلیل لازمی ہو،

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار مین جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہین، اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہوجاتا ہو، تو ان کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہین، کفار اسی وجہ سے پیغمبرون کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اور تعجب سے کہتے تھے،

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا	کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر)
(بنو اسرائیل-۱۱)	بھیجا ہے،

(۵) حسد کا پانچوان سبب یہ ہے کہ جب دو شخصون کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونون باہم

ایک دوسرے کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اوران مین جب ایک کو اس مقصد مین کامیابی حاصل ہوجاتی ہے، تو دوسرا قدرتی طور پراس کا بدخواہ ہوجاتا ہے، ایک شوہر کی متعدد بیویون اورایک باپ کے متعدد بیٹون مین جو رشک وحسد ہوتا ہے، اس کی وجہ یہی ہوتی ہے حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائیون نے اُن کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا،

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ	جب یوسف کے (بے مات) بھائیون نے
اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ	(آپس مین) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی)
عُصْبَةٌ ؕ	بھائیون کی بڑی جماعت ہین تاہم یوسف
	اور اس کا (حقیقی) بھائی (ابن یامین) ہمارے
(یوسف - ۲)	والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہین

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے اس لئے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہین جب اُن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس مین اُن کا شریک وسہیم ہوگیا ہے تو یہ اُن کو سخت گران گذرتا ہے، اوراُن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف وامتیاز سے دوسرا شخص جاہ ومنزلت مین ان کا شریک ہوگیا ہے، وہ اس سے چھین جائے، مسلمانون کے ساتھ یہود اسی لئے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے اُن کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے اُن کا یہ تفوق جاتا رہا اس لئے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہوگئے، منافقین مین عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ

اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع مین وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا[1]

(۷) حسد کا ساتوان سبب خبثِ نفس اور بدطینتی ہے، کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت مین دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو اُن کو مسرت ہوتی ہے، اس صورت مین حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہین،

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر اُن لوگون سے تعلق رکھتے ہین جن مین کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لئے بیگانون مین یہ جذبہ پیدا نہین ہوتا، بلکہ صرف ان لوگون مین پیدا ہوتا ہے جن مین باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے،

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لئے حسد کرتا ہے کہ ان مین ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہین ہوتا، کیونکہ ان مین کوئی چیز مابہ الاشتراک نہین،

اسلام نے مسلمانون مین باہم اخوت کا رشتہ قائم کر کے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لئے اُن مین حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا، اور حسد

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین،

کے جس قدر اسباب ومراتب ہین، وہ سب کے سب اس وسیع برادری مین جمع ہوسکتے تھے، اس لئے اصولاً جو بداخلاقیان اس اخوت کا شیرازہ برہم کرسکتی تھین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب سے مسلمانون کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری کتاب الادب باب ماینھی عن التحاسد والتدابر)	بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگون کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہوجاؤ،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح مین قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے،

المعنی کونوا کاخوان النسب فی الشفقۃ والرحمۃ والمحبۃ والمواساۃ والمعاونۃ والنصیحۃ	اس کے معنی یہ ہین کہ رحم وشفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیرخواہی مین نسبی بھائیون کی طرح ہوجاؤ،

لیکن یہ اخوت اُسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیون سے احتراز کیا جائے ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہوجائے گی، اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہین، یا اُن سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، فنا ہوجائین گے، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

کانہ قال اذا ترکتم ھذہ	گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ
المنھیات کنتم اخوانا ومفھوم	جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دوگے تو
اذالم تترکوھا تصیروا اعداء	بھائی بھائی ہو جاؤ گے، اور اس کا مفہوم
ومعنی کونوا اخوانا اکتسبوا ما	یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے،
تصیرون بہ اخوانا مما سبق	اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی
ذکرہ وغیر ذلک من الامور	خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے بھائی بھائی
المقتضیۃ لذلک نفیا واثباتا	بن جاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں
(فتح الباری جلد دھم ص۴۰۳)	جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ اور
	بھی بہت سے امور ہیں، جو اخوت کو نفیاً

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے مشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑو، اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو، اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ، لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسنِ اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا، اور یہ شرارہ خرمنِ اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دیگا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر

۱؎ مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۰۴، مصر

حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا،

ایاکم والحسد فان الحسد	تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں
یاکل الحسنات کما تاکل	کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح
النار الحطب[۱]،	آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے، اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے،

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ	اور بُرا چاہنے والے کی بدی سے جب
(فلق)	وہ حسد کرے،

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحسد،

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہین، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہی، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہین، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتین قائم ہوتی ہین تو عورتون کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہی، اور اس سلسلہ مین اس قسم کے حالات وواقعات بیان کئے جاتے ہین جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہین،

عربی زبان مین اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہین، اور قرآن مجید کی اس آیت مین

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ-۱۵)	حج کے دنون مین نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہئے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی،

اسی کی ممانعت کی گئی ہے لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے، کہ اس زمانہ مین مردون اور عورتون کا عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس سفر مین پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کئے جا سکتے ہین، حالانکہ یہ زمانہ صرف

ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہین، بلکہ اسلام مین عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہی چنانچہ سنن ابی داؤد مین ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتون اور مردون کے ایک[1] مجمع مین خطبہ دیا، اور حمد و ثنا کے بعد مردون کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم مین کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے، اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے، اور اس طرح خدا کے پردہ مین چھپ جاتا ہے؟" لوگون نے کہا "ہان" پھر فرمایا کہ "اس کے بعد لوگون کی صحبتون مین بیٹھتا ہے، تو کہتا ہے کہ مین نے یہ کیا، مین نے یہ کیا؟" اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتون کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دو زانو بیٹھ کر کہا کہ "ہان مرد اور عورت دونون اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہین،" فرمایا "تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اُس چڑیل کی ہے جو گلی مین ایک شیطان سے ملی، اور اس نے اس سے مباشرت کی حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے[2]"

مقصود یہ ہو کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونون کی بے شرمی کی صورت یکسان ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدودِ الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال مین برقرار رہے، ورنہ جب باتین زبانون پر آئین گی، تو وہ اپنی اہمیت کھو دین گی اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتون کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتین پیش آتی ہین، تو مجاز و استعارہ کی زبان مین ان کو ادا کیا

---

[1] دونون کی نشستین الگ الگ تھین نس، [2] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اہلہ،

جاتا ہی تاکہ مدعا ظاہر ہو، اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید مین اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ مین بیان کئے گئے ہین مثلاً

وَقَدْ اَفْضٰی بَعْضُکُمْ اِلٰی بَعْضٍ	حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے
(نساء-۳)	(یعنی میان بی بی ہم صحبت ہو چکے)
اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ ،	یا تم نے عورتون کو چھوا ہو، (یعنی اُن سے
(نساء-۷)	صحبت کی ہو)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لئے اُس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہین جو فقہی مسائل کی تشریح مین مجبوراً آتے ہین، گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہین لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنایے اور استعارے ہین، اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب، اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہئے، پاخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث مین قضاے حاجت کا لفظ مستعمل ہے، جو ایک کنایہ ہی، قرآن مجید مین اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت مین نشیب زمین کو کہتے ہین،

اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَائِطِ	یا تم مین سے کوئی پست زمین سے
(نساء-۷)	(ہوکر) آیا ہو،

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہین، اس لئے استعارۃً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا،

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائین خانہ ہو، چونکہ پائخانے عموماً مکانون کے کنارے بنائے جاتے ہین، اس لئے استعارۃً اُن کو پائین خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہوگیا، اور اب کثرتِ استعمال سے اس مین استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید مین خداوند تعالیٰ نے "برص" کی تعبیر "سوء" کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہین،

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ، (طٰہٰ - ۱)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل مین رکھ لو، (اور پھر نکالو) تو وہ بدون اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو، سفید (براق) نکلیگا۔ (اور یہ) دوسرا معجزہ (ہے)

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوج ہو، اور یہ صورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانۂ حج مین چونکہ اعام اجتماع ہوتا ہو اور اس حالت مین لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہو، اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک عام لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی،

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ - ۲۵)

حج کے دنون مین نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی،

گالی گلوج کی مختلف صورتین ہین، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو بُرا بھلا کہتا ہو، اُس کے نسب مین عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہو، یہان تک کہ

اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام مین مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہی بعض حالتون مین اگر اس نے کوئی بُرا کام کیا ہی یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہی، تو اس کا اظہار کرتا ہی،

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتون کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہی،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ	اللہ کو بُری بات کا پکار کر کہنا پسند نہین
الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ	مگر جس پر ظلم ہوا ہو وہ ظلم کو برملا بیان
(نساء - ۲۱)	کر سکتا ہے)

اور قرآن وحدیث مین جا بجا بد زبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہین

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوج مین لوگ عموماً تعدی کرتے ہین یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو بُرا کہتا ہی تو دوسرا اس کے باپ ماں دونون کو اس مین شامل کر لیتا ہے اس لئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہی کہ کسی کو گالی نہ دیجائے، خداوند تعالی نے قرآن مجید کی اس آیت مین یہی نکتہ بیان کیا ہی،

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن
دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا	معبودون کو پکارتے ہین اُن کو بُرا نہ
بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ	کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھکر
(انعام - ۱۳)	خدا کو بُرا کہہ بیٹھین گے،

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث مین اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہی کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اپنے باپ

ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔[1]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے"، لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو برا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے، فرمایا، "عائشہ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔"[2]

(۳) بدزبانی دور وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابو ذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔[3] امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں، اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے، ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ [2] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔
[3] بخاری کتاب الادب باب ما ینہیٰ من السباب واللعن۔

خدمت مین حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے السَّامُ عَلَيْكُمْ "(تم کو موت آئے)، کہا حضرت عائشہؓ نے جواب مین کہا علیکم ولعنکم اللہ وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْكُمْ یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے، اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو، رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نے سنا تو فرمایا کہ اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو[1]"

(۵) گالی گلوج کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس مین عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتون کو الفاظ کی صورت مین منھ سے نکالا جاتا ہے، اور سنایا جاتا ہے، اس سے سوسائٹی مین ان مکروہ باتون کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے، اور بے حیائی کے الفاظ بڑھکر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہین، یہی سبب ہے کہ حدیث مین آنحضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز مین شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز مین شامل ہو اس کو زینت دے دیتی ہے[2]" اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے،

(۶) گالی گلوج سے لوگون کے دلون کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانون کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے، اسی لئے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہین[3]، مُردون کو بُرا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندون یعنی مُردون کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلون کو اذیت پہنچتی ہے[4]،

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الفحش
[3] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای امورہ افضل [4] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الشتم،

(۷) گالی گلوج لڑائی کا پیش خیمہ ہے، اور مسلمانون کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ منتج ہو وہ اگر کفر نہین تو کم از کم فسق تو ضرور ہی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر[1]

مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہی اور اس کے ساتھ لڑنا کفر،

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہوجاتا ہی کہ بذبانی اور فحاشی، اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہی وہ اس بداخلاقی مین مبتلا رہنا پسند نہ کریگا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لیس المومن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی[2]

جو مسلمان ہے وہ طعن و تشنیع نہین کرتا، لعنت نہین بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہین کرتا

ایک اور حدیث مین بذبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہی[3]

یہ تمام وجوہ تو انسانون کی باہمی گالی گلوج اور لعن وطعن سے تعلق رکھتے ہین، لیکن اس قسم کی بذبانیان صرف انسانون تک محدود نہین ہین، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزون سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہین، مثلاً جب کوئی شخص حوادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہین سوچتا کہ اس مین زمانہ کا کیا قصور ہے، یہ جو کچھ ہوا ہے مشیت الٰہی سے ہوا ہے، اس بنا پر اسلام نے ان چیزون کے

[1] بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ [3] بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق،

برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے، اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے کہ "خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو بُرا بھلا کہتا ہے، حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں"[1] یعنی زمانہ کو بُرا بھلا کہنا خود خدا کو بُرا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر ادھر اڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے"[2]

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا[3]، اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے،

اسلام میں گالی گلوج کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دلآزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی[4]؛

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا، تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا، بہرحال اسلام نے[5]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لاتسبوا الدہر [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی اللعن [3] ابو داؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ [4] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن ومسلم کتاب الایمان [5] فتح الباری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن،

جان ومال کی طرح ہر مسلمان کی عزت وآبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر مین (یعنی حجۃالوداع مین) ایک خطبہ مین مسلمانون کو یہ ہدایت کردی ہے کہ خدا نے تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری عزّت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے، جس طرح تمھارا یہ دن، تمھارے اس مہینہ اور تمھارے اس شہر مین محترم ہے،

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحون مین جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے اُن کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیون اور بُری عادتون کو گنا یا جا سکتا ہے جن کی ممانعت اسلام مین کی گئی ہے مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورۂ بالا رذائل مین سے کسی کے تحت مین ہین، اس لئے اُن کے پورے استقصا کی کوشش نہین کی گئی ہے، اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و رد مین خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہین کی گئی ہے، اس لئے صرف اُن ہی کے بیان پر قناعت نہین کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفون نے رذائل مین شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے،

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیان قرار دی ہین، اور جس قدر رذائل ہین ان مین اُن ہی تین مین سے کوئی برائی پائی جاتی ہے،

سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان مین یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلافِ وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغلخوری، دُورخاپن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخین ہین، دوسری اساسی بُرائی حبِّ مال اور حبِ جاہ

سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں، تیسری اسکی برائی حبِ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عُجب، فخر، ہی غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرے گا، یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں، جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ		اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى	(نازعات ۴)	ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو غلط خواہش
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝		سے بچایا، تو جنت اسکی آرامگاہ ہے،

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے، جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگون مین امتیاز ہوتا ہے، ان آداب مین خوبی ولطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور مین خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب شایستہ اور باوقار بن جاتا ہے،

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہین کہ ان روزانہ کے کامون کے بجالانے مین ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیون کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے، اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی، اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام علیہ السّلام نے اپنی عملی وقولی ہدایات سے مسلمانون کیلئے اس کا بہترین نمونہ قائم کردیا ہے،

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب وعوائد یعنی اٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہو وہی اس کے آداب وعوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لیکر جاتا ہی، اور ان کو چند روز میں مہذب اور شایستہ بنا دیتا ہے،

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے، اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب، اور کتاب السلام میں درج کیا ہی، ہم صحاح وسنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابو داؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کرکے ذیل میں لکھتے ہیں،

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہی، اس لئے اُس کے آداب کا بڑا حصّہ بھی فطری ہی، یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہین اور تمام انبیار علیہم السّلام نے اُن کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہین جو انسانون کو جانورون سے ممتاز کرتے ہین، انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہی، اس کے بال بڑھتے ہین ناخن بڑھتے ہین، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہین تو ان سب چیزون کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانون مین فرق پیدا کرتی ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ چار چیزین تمام پیغمبرون کی سنت ہین، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا[۱]، ایک روایت مین ختنہ کو بھی اُن مین داخل کیا گیا ہی،

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی ستر عورت، اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہی، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور اُن کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہان تک کہ توراۃ کے بیان کے مطابق

---

[۱] ترمذی ابواب النکاح

اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہی[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلّم ہین، ان کے عہد مین دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائین، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہین، امام بخاری کی ادب المفرد مین ہی کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھین ترشوائین اور ناخن کٹائے[2]، ایک حدیث ہی: ایک صحابی کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خصالِ فطرت پانچ ہین، ختنہ کرانا، موئے زیرِ ناف اور بغل کے بال صاف کرنا، اور ناخن اور مونچھ ترشوانا[3]، ایک دوسری حدیث مین یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہین، مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک مین پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیون کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال بنوانا، موئے زیرِ ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسوین بات مین بھول گیا، غالبًا کلی کرنی ہوگی،[4]

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہین، چنانچہ وضو مین مسواک کرنا، مستحب اور انگلیون کا دھونا، ناک مین پانی ڈالنا اور کلی کرنا واجب قرار دیا گیا ہی،

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھین ترشوانا صفائی کے ضروری لوازم ہین، جن کے ناخن بڑھے اور مونچھین بڑی ہوتی ہین، وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کرکے کھاتے پیتے ہین جس سے نہ صرف دوسرون کو کراہت معلوم ہوتی ہے، بلکہ خود اُن کو بھی طبّی طور پر نقصان پہنچتا ہی یورپ

---

[1] توراۃ پیدائش ۱۷، [2] باب الختان الکبیر، [3] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ، [4] ایضًا،

ہیں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا، اور اسی طرح بعض لوگوں ہیں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحًا خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں،

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے، مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں، اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اُمت کے لئے مقرر کیا تھا،

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ، اور داڑھی بڑھاؤ"[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ، اور داڑھی بڑھاؤ"[2] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیر مسلموں کا مذہبی فرض ہے، اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا اثر ہے، جس رنگ کی عینک لگایئے دنیا اُسی رنگ کی نظر آئے گی،

[1] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ [2] ایضاً؛

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتون مین سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہو، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک مین ظاہر ہوا جہان پانی نسبتہً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات مین غسل کرنا فرض قرار دیا، زن و شو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونون غسل نہ کرلین نماز جو فرض ہو ادا نہین ہوسکتی، فرمایا،

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ-۲) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو،

کپڑے شرعی طور سے پاک ہون، فرمایا،

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (مدثر-۱) اور اپنے کپڑے کو پاک کر،

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے،

فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا (مائدہ-۲) تو پاک مٹی کا قصد کرو،

جب نماز پڑھنا چاہین تو پہلے ہاتھ، منھ اور پاؤن دھولین اور بھیگے ہاتھون کو سر پر پھیرلین،

اس کا نام وضو ہے،

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا	جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منھ اور
وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ	کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو، اور
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ	اپنے سروں کا مسح کرو، اور اپنے
اِلَى الْكَعْبَيْنِ، (مائدہ ۔ ۲)	پاؤں دھوؤ،

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت مین شریک ہون تا کہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیون کو تکلیف نہ ہو، اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص ومقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا،

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے، فرمایا،

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ،	اور (اللہ) طہارت کرنے والون کو
(بقرہ ۔ ۲۸)	پیار کرتا ہے،

اسی طہارت کی پابندی، اور دلون مین طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً

۱۔ آپ نے فرمایا جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے، اس کو پانی کے برتن مین ہاتھ نہین ڈالنا چاہئے کیونکہ سونے مین معلوم نہین کہ اس کا ہاتھ کہان

کہاں پڑا ہے"[1] اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیئے، سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا،[2]

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے، اس لئے خیال رکھنا چاہیئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں، جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو،

۲۔ دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا، فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا[3]، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے، تو فرمایا کہ تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو،

(مسند احمد ج ا ص ۲۱۴)

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیئے[4]، یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو،

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جنب کو چاہیئے کہ اس سے پانی لے کر

---

[1] مسلم کتاب الطہارۃ [2] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [3] ایضاً [4] ایضاً،

غسل کرے، کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسرون کے لئے ناپاک یا قابلِ کراہت، بلکہ عالم حالت مین خود اسی کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا،

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہوکر پیشاب نہین کرنا چاہئے، کیونکہ اس حالت مین یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑجائین، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہون، یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے،

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے، کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑسکتے ہین،

۷۔ غسل خانہ کی زمین مین پیشاب نہین کرنا چاہئے، خصوصًا جب کہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹین گندی اور ناپاک ہوکر اوڑین گی، اور بدن کو ناپاک کرین گی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل مین پیدا کرین گی،

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہئے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا چاہئے، استنجا بائین ہاتھ سے کیا جائے، اُس مین داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے،

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہئے[۱]،

۱۰۔ ہفتہ مین ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے

---

[۱] یہ تمام مسائل کتبِ سنن کی کتاب الطہارۃ مین دیکھئے، ۱۲

بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہی،

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے، اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، اُن کی مسجد نہایت تنگ، اور اس کی چھت نہایت پست تھی، جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے، تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا، اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے[1]، جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بدبودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی[2]،

۱۱- جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا[3]،

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ، [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب وفی الخلقان،

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض اُن سختیون کو دور کیا ہے جو اس معاملہ مین اور مذاہب مین پائی جاتی تھین، مثلاً یہودیون کے مذہب کے رو سے ناپاکون کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے، تب نہانے والا پاک ہو لیکن اسلامی تعلیمات کے رو سے انسان کو اس معاملہ مین صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائین، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ شدت احتیاط کی وجہ سے شیشی مین پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے، کیونکہ مین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے[1]،

یہودیون کے یہان یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے، اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے، صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی،

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ   اور (اے پیغمبر! لوگ) تم سے حیض

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین،

قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ
فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ
حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ
فَاْتُوْهُنَّ ،

(بقرہ ۲۸۰)

سے بارے مین دریافت کرتے ہین تو انکو
سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنون
مین عورتون سے الگ رہو، اور جب تک
پاک نہ ہو لین، ان سے مقاربت نہ کرو،
اور جب وہ پاک ہو جائین تو اُن کے

اس کے مطابق آپنے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ اُن سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالین قائم کردین، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہین کہ مین اس حالت مین آپکے بالون مین کنگھی کرتی تھی، اور آپکے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپنے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی، مین نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمھارے ہاتھ مین نہین ہے،[1]

ناپاکی کی حالت مین مقدس مقامات مثلاً مسجد مین نہین جا سکتے، قرآن مجید کو نہین چھو سکتے، اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہؓ نے حالتِ جنابت مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسا مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ مسلمان نجس نہین ہوتا[2] یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہین ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے،

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ مین عورت ہون اور میرے دامن لمبے ہوتے ہین، اور مین گندے مقامات مین چلتی ہون یعنی زمین مین گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہو کہ

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا، ابوداؤد کتاب الطہارۃ،

دامن مین نجاست لگ جاتی ہو، بولین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کردیتی ہے[1] یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اُس نجاست کو زائل کردیتی ہے، ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے جب بارش ہو تو ہم کیا کرین، فرمایا کہ اس کے بعد اُس سے اچھا راستہ نہین ہے ؟ بولین "ہان" ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کردیتا ہے، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے، اور وہ پانی کی طرح دوسری چیزون کو بعض حالات مین پاک کرسکتی ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کردی گئی ہے[2] اسی لئے وہ حالت تیمم مین پانی کی قائم مقام ہوجاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ دینے سے پاک ہوجاتا ہے،

اسلام نے اس باب مین سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کردیا، اور اس کو تمام صحابہ نے ایک برکت سمجھا،

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونون ہاتھ دھولئے جائین، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کرلی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے، پہلے دونون ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہاکر بائین ہاتھ سے کمر کے نیچے دونون طرف دھوتے، پھر وضو کرتے لیکن پاؤن نہین دھوتے، پھر سر پر تین بار پانی بہاکر بال کی جڑون کو ملتے، پھر سارے جسم پہ پانی بہاتے، اور آخر مین پاؤن

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [2] بخاری یا پانی نہ ملنے کی صورت مین،

دھوتے، (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام مین ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہین ہے، اور نہ عرب جیسے ملک مین یہ ہوسکتا تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک مین جہان پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہائے تو مباح ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچون وقت کی نماز کی تمثیل مین فرماتے ہین کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو، اور اُس مین وہ دن مین پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اُس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے[1]،

[1] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ،

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں، اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے[1]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے،[2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اُس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوئی ہوں۔

(۲) مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہیے، جیسا کہ حدیثوں میں

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً

مذکور ہے، اور دنیا کے سب کاموں مین کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے، اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہیے، صحابہؓ کہتے ہین کہ جب ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے مین ہاتھ نہیں ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے مین ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہین لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے[1]، اور اگر کوئی شروع مین بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے[2]،

(۳) انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کامون اور چیزون مین ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کامون کے لیے خاص کر دیے جائین، چنانچہ سب اچھے کامون کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لیے بائین ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے، اس تخصیص مین ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے، انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہین، اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہین، اس لیے زیادہ تر کامون کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہین ہے یعنی دایاں پہلو، تاکہ کام کے ہچکولون اور جھٹکون سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے، یہی وجہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً

ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہین اور بایان ہاتھ صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہین، اور یہی وجہ ہے کہ داہنے مین زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے[1]، صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہین بلکہ شریعت نے اکثر باتون مین اس کا لحاظ رکھا ہے، ایک بار آپکے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس مین آپ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا، اور بائین جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب مین داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے[2]،

ایک بار آپکے دائین جانب ایک لڑکا اور بائین جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپنے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو مین ان لوگون کو دون، اس نے کہا کہ مین آپ کا حصہ کسی کو نہین دے سکتا، مجبوراً آپنے پہلے اسی کو دیا[3]،

(۴) کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے، بیچ سے نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائیگی، گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا، اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے، اور حریص آدمی کبھی سیر نہین ہوتا، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ مین نازل ہوتی ہے[4]۔

(۵) اپنے ساتھیون کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [3] ایضاً [4] ترمذی ابواب الاطعمہ باب ما جاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام

کر کے نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے، اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دال ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے،

(۶) کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ چھوڑ دینا چاہیے[۲]،

(۷) سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست واحباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی[۳]، لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ

---

[۱] سنن ترمذی ابواب الطعام [۲] بخاری کتاب الاطعمہ [۳] نور - ۸

کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہین، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والون کا ایثار ثابت ہوتا ہے، اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے، اس سے گھر والون اور عزیزون اور دوستوں مین محبت ہوتی ہے، ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہین لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہان، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کر لو تو برکت ہوگی،[1]

(۸) کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منھ کے بل سو کر نہیں کھانا چاہیے[2]، کیونکہ روحانی کیفیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ مین اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتین یہ ہین کہ یا تو ایک پاؤن کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤن کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانو جھک کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہون تو اکڑون بیٹھ کر،[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، مین بندہ ہون، غلامون کی طرح کھاتا ہون[4] یعنی خاکساری سے،

(۹) کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، ادھر اُدھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن مین ساتھ ہون، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسری ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے، اور دوسرے کے کھانے

---

[1] ابو داؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً [3] ابو داؤد کتاب الاطعمہ و ابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادۃ فیروز آبادی للشیخ عبد الحق محدث دہلوی [4] ابو داؤد و ابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج ۴ ص ۳۹۰،

مین کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے،

(۱۰) کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیون سے اور انگلیون کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہیے،[1]

(۱۱) پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس مین پینا چاہیے،[2] اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی مین نہین لگنے پاتی،

(۱۲) پانی کے برتن مین سانس نہین لینی چاہیے،[3] کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن مین پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو، پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتون کو لے کر باہر نکلتی ہے اسلیے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہین کرنا چاہیے،

(۱۳) پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہین پینا چاہیے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ ہرج نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے،[4] مگر اس کی عادت نہین کرنی چاہیے کیونکہ پانی پینے مین ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائین، اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے، البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے،

---

[1] بخاری کتاب الاطعمہ [2] بخاری کتاب الاشربہ [3] ابو داود کتاب الاشربہ [4] ایضاً و موطا امام محمد،

(۱۴) پانی مشکیزہ کے منھ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے، کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اسکے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں،

(۱۵) کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے[1] تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے،

(۱۶) کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا،[2]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الاشربہ [2] عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی باب ما یقول اذا اکل،

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس مین اصولی بات یہ ہے کہ مجلس مین تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکاے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو، تاکہ یہ مجلس شرکا کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتون کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہین،

(۱) مجلس مین انسان کو جہان بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی جہان تک نشست کا دائرہ اسکے آنے تک پہنچ چکا ہو وہین بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہین کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والون اور بیٹھنے والون کو تکلیف ہوتی ہے، اور دوسرے ایسا کرنے والون مین غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے، اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسون مین اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے[1]، انتہا یہ ہے کہ مسجدون مین بعد کے آنے والے نمازیون کے لیے یہ سزاوار نہین کہ وہ لوگون کو روندتے ہوئے آگے کی صف مین

[1] ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتہیٰ،

بیٹھنے کی کوشش کرین، جمعہ کی نماز مین یہ خاص طور سے دیکھنے مین آتا ہے، اسی لیے تخطی رقاب یعنی دوسرون کی گردنون کو روندکر اور زیر قدم لاکر آگے بڑھنے کو جمعہ مین خاص طور سے منع کیا گیا ہے،

(۲) مجلس مین کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہیے[۱]، کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے، اور دوسرے کے دل مین کدورت پیدا ہوتی ہے،

(۳) اگر کوئی شخص مجلس مین ایک جگہ بیٹھکر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو لوٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہوتا ہے[۲]، دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا، اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا،

(۴) اگر مجلس مین دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہون تو ان کی اجازت کے بغیر دونون کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا[۳]، کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس مین بات چیت کرنے کے لیے اکسی اور مصلحتِ باہمی سے بیٹھتے ہین، اور ان دونون مین موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے اس لیے ان کا الگ کردینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے،

(۵) اگر کچھ لوگ مجلس مین حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہون تو کسی کو اس حلقہ کے وسط مین نہیں بیٹھنا چاہیے، ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے[۴] کیونکہ اس حالت مین کچھ لوگون کی طرف اسکا منہ ہوگا اور کچھ لوگون کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے

---

[۱] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ [۲] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ [۳] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما [۴] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ،

مسخرے لوگ اس طرح بیٹھے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

(۶) مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے[1]، کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی، اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا،

(۷) راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے، کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور ہر آئندہ و رو کو تکنا بداخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا، اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا،[2]

(۸) انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لیے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں، جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے،

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات

ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے، اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے، اُن میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے[۱]۔ ایک مشہور مثل ہے کہ "اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ"۔ اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے"، پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور برے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا، یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی[۲]۔

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے، کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے، فرمایا کہ "اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے"[۳]۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں، تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے، اور دوسروں کے لیے جگہ بنانے کے لیے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا، فرمایا:

۱؎ ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ ۲؎ بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک،

۳؎ ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی الاتکاء

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِيْلَ	اے مسلمانو جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں
لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا	میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو، اللہ تمہارے
يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا	لیے کشادگی کرے گا، اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ
فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	تو اٹھ جاؤ، اللہ انکے رتبے اونچے کرے گا جو
مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ	تم میں سے ایمان لائے، اور جن کو علم دیا گیا،
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (مجادلہ)	اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے،

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، منافقوں کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے،

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ	یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (مجادلہ-۲)	کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو،

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں، وہاں کوئی دو آدمی آپس میں یہی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، اسی لیے ارشاد ہوا کہ "تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا"[1]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ المجالس بالامانۃ قولِ نبوی ہے[2]

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب فی التناجی [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث۔

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دیگا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا،[1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے، اسی لیے فرمایا کہ "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے"[2]، ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو، جس کو شریعت نے السَّلَامُ عَلَيْكُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں،

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان [2] ایضاً باب ماجاء فی صنائع المعروف،

کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے، عرب کے لوگ ملاقات کے وقت "انعم اللہ بك عینا"، "وانعم اللہ بك صباحا" کہتے تھے، یعنی تمھاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، تمھاری صبح خوشگوار ہو" امراء و سلاطین کے لیے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی "ہزار سال بزی" "ہزار برس جیو" کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو "گڈ مارننگ" (اچھی صبح) شام کو "گڈ ایوننگ" (اچھی شام) رات کو "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے "السلام علیکم" کا لفظ ایجاد کیا، اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں والسلام علیّ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وسلام علی المرسلین (صفت) ظاہر ہوتا ہے،

(۲) اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے، دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے،

(۳) اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے،

(۴) اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور

دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس ابن سعدؓ نے آپؐ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ کو سجدہ کریں، تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی[1]، ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے، فرمایا "نہیں" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے، فرمایا "نہیں"[2] اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا "ہاں"[3]۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ [2] یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے، جہاں کوئی شرعی محذور ہو، مثلاً ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور کوئی شہوت انگیز صورت ہو [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحہ،

(۷) اسلام نے اپنے پیرؤون کے درمیان اس کو گویا آپس مین پہچان کی علامت اور "واچ ورڈ" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دونون زبانون سے یہ لفظ نکلتے ہین تو دونون اپنے سینون مین ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہین، اور آپس مین محبت کی کشش محسوس کرتے ہین، یہ بتاتا ہے کہ دونون ایک ہی ملتِ محمدیہ کے ایمانی فرزند ہین۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:

یاایھا الناس افشوا السلام	لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ
واطعموا الطعام وصلوا	اور جب تمام لوگ سو رہے ہون
والناس نیام تدخلوا الجنۃ	تو نماز پڑھو، یہ سب کروگے تو جنت
بسلام۔[1]	مین سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث مین سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ "تم لوگ اس وقت تک جنت مین داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لے آؤ، اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس مین محبت نہ کرو، مین تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہون کہ جب تم اس پر عمل کروگے تو باہم محبت کرنے لگوگے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ"،[2]

سلام کرنے کے لیے شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہین،[3] مرد اور عورت

---

[1] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹ [2] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام [3] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ۔

کی تفریق نہیں[1]، بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں[2]، البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کیلئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے[3] دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو، اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے[4]۔

ان مصالح کے لحاظ سے آپ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا[5] مجلس سے اٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے[6]، سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا "السلام علیکم" آپ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملیں" تیسرا آدمی آیا تو کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپ نے فرمایا" اس کو بیس نیکیاں ملیں" تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیاں ملیں"[7]۔

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال [2] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان [3] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل البیت [5] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب اذکر فی فضل السلام،

اس سے بہتر طریقہ سے دے یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے، چنانچہ قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے،

وَاِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا	اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا
(نسآء - ۱۱)	(کم سے کم) ویسا ہی جواب دو،

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے،

(۲) ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے، اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے[۱]، مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے[۲]، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول کر لیا، اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے، لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ [۲] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ

ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا،[1]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت مین کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہین، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آتی تھین تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپ ان کے یہان آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھین، ایک موقع پر جب حضرت سعدؓ بن معاذ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھکر جائین اور ان کو لے آئین،[2]

دوسری قومون مین ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یکقلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیرون اور بادشاہون کے لیے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس مین ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہین،[3]

اس قسم کے موقعون پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً "مرحبا" کہنے کی مثال بھی شریعت مین موجود ہے،[4]

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقہ والقبلہ، [2] یہ دونون واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام مین ہین، [3] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا،

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر مین جانے کے لیے صاحبِ خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے، اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ مجید مین دیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا
بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ
تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ
أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ. فَإِن
لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا
تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ
وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا
فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

(نور - ۴)

مسلمانو! اپنے گھرون کے سوا دوسرے گھرون مین گھر والون سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمھارے حق مین بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے کہ) جب ایسا موقع ہو تو تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر مین کوئی آدمی موجود نہین تو جب تک تمھین (خاص) اجازت نہ ہو ان مین نہ جاؤ اور اگر (گھر مین کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہین) لوٹ جاؤ تو (بے تأمل) لوٹ آؤ، یہ لوٹ آنا تمھارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اسکو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتون سے ملنے کے لیے ان کے شوہرون سے اجازت لینے کی ضرورت ہے،[۱]

۱ ترمذی کتاب الاستئذان باب ما جاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن،

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہوسکتے ہیں لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[1]، اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے داہنے یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے[2] تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے داہنے یا بائیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے[3]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں[4]، ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمھاری آنکھوں میں کونچ دیتا، پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر، فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث [2] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب
[3] ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینہ فلا دیۃ لہ،

کہ اس کو دیکھ نہیں[1]،

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرکے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں[2]، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے[3]، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں[4]، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے[5]۔ دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں[6]، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کرکے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی، یا گھر میں غیر محرم عورتیں آگئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں،

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں، اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے

---

[1] اس کتاب کے ص ۸۰ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں انما الاذن لاجل الرویۃ مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں، دیکھیے صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [3] ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستیذان [4] ادب المفرد باب دعا الرجل هل یؤذن [5] ادب المفرد باب ما لا یستاذن فیه [6] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق،

ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نمازِ عشا کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے، فرمایا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ	مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی
الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ	لونڈی غلام) اور تم میں سے جو سنِ بلوغ
لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ	کو نہیں پہنچے، تین وقتوں میں تمہارے
مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ	پاس آنے کی تم سے اجازت لیا کریں
وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ	(ایک تو) نمازِ صبح سے پہلے اور (دوسرے
الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ	جب تم دوپہر کو (سونے کے لیے معمول
الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ	کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو، اور
لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ	(تیسرے) نمازِ عشا کے بعد (یہ) تین وقت
جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّافُونَ	تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان
عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ	(اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ	دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن
الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ	چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ)
وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ	اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں
الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا	(اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی

اسۡتَاذَنَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ،

غلامون کو بعض (یعنی تمھارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے مین تم لوگون کو بڑی تکلیف ہو گی) یون اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (مسلمانو) جب تمھارے لڑکے حد بلوغ کو پہنچین تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھرون مین آنے کے لیے) اذن مانگا کرتے ہین، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے،

(نور - ۸)

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کرین، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتین کرو،

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ-۲) تو تم اُن سے نرم بات کہنا،

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے مین اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا،

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ-۱) اور لوگون سے اچھی بات کہو،

مجلس مین بیٹھین تو ایسے فقرے نہ کہین جن مین کسی پر کوئی طعن چھپا ہو، یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مین آتے تو اسی قسم کی باتین کہتے اُنْظُرْنَا (ہمارا خیال کیجیے) کی جگہ رَاعِنَا کہتے جس مین تخفیف کا چھپا ہوا پہلو نکلتا، اللہ تعالےٰ نے مسلمانون کو اس سے باز رکھا، فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا اے ایمان والو! راعنا نہ کہو،

رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا (بقرہ ۱۳) — اُنْظُرْنَا کہو،

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء رکوع ، مین ہے،

باتین ایسی کرنی چاہئین جو منصفانہ اور درست ہون، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھین تو آپس مین لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگون کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا،

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ	اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو،
وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ	اور بات سیدھی کہو، اللہ تمھارے
لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ	کامون کو سنوارے گا اور تمھارے
ذُنُوْبَکُمْ (احزاب - ۹)	گناہ معاف کرے گا.

عورتون کو جب نامحرم مردون سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات مین اور لہجہ مین ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل مین بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا،

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ	تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے بات
الَّذِیْ فِیْ قَلْبِہٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ	نہ کیا کرو، ایسا کروگی تو جس کے دل
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	مین کسی طرح کا کھوٹ ہو وہ خدا جانے
	تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کریگا،
(احزاب - ۴)	اور بات کرو تو معقول بے لاگ.

مردون کو نرم معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتین کرنے کی تاکید آئی، اور اس کا ثواب

صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا،

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ	خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے
(بقرہ-۳۶)	دل آزاری ہو،

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا،

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ	اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب
اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ	آوازوں میں بری آواز گدہوں
الْحَمِيْرِ (لقمان-۲)	کی ہے،

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو،

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ	اور جو لغو باتوں سے اعراض
مُعْرِضُوْنَ (مومنون-۱)	کرتے ہیں،

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے، اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے، خدا فرماتا ہے،

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ	آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا، لیکن ایک
رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق-۲)	نگران اس پر حاضر رہتا ہے،

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے،

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخر

پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے[1]۔" اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے[2]" یہ حدیث اُن جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کو دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں،

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں، پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو، اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے، اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے،

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ	اور جب نا سمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ
قَالُوْا سَلَامًا، (فرقان-۷)	جواب میں سلامتی کی بات کہیں،

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف [2] مؤطا و شرح للباجی باب ما جاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد،

باتیں کرتے ہوں، اور ہمیشہ اس میں مبتلا رہتے ہوں، اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں۔[1] یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے۔[2] یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا اُدھر پھر جاتا ہے، یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے، اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی، اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔[3]

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے، بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے، تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے۔ اسی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے،[4] اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے، ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی ہی تیز کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا،[5] حضرت جابر بن عبداللہ

[1] ادب المفرد باب فضول الکلام [2] موطا امام مالک باب ما یؤمر بہ من التحفظ فی الکلام [3] موطا امام مالک باب ما جاء فی ما یخاف من اللسان [4] ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث [5] ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث

فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا، اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح ادا فرماتی ہیں،

کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلاما فصلا یفہمہ کل من سمعہ[1]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اسکو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا،

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے[2]،

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع مقفی اور پُر تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کر باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ "خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے"، نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوب کلام

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الہدی فی الکلام [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المتشدق فی الکلام

ین اس لیے اول بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا[1] گرویدہ بنائے، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا"[2]

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے، تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے،[3]

---

[1] یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام [3] ادب المفرد باب اذا حدیث الرجل لایقبل علی واحد

باہر نکلنے
اور
چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ مین متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانون کی تعریف مین فرماتا ہے،

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ	اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہین
عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان۔۶۰)	جو چلتے ہین زمین پر دبے پانون،

اکڑ کر نہین چلنا چاہیے یعنی چال مین غرور اور تبختر کے انداز نہ ہون، فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا	اور زمین مین اکڑ کر نہ چل (کر اس طرح
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ	چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے
لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا	اور نہ پہاڑون تک اونچائی مین
(بنی اسرائیل۔۴)	پہنچ جا سکتا ہے،

دوسری جگہ فرمایا،

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (لقمان)

اور زمین مین اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہین کرتا،

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے مین زمین پر زور زور سے پانون نہین رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کی آواز سے سننے والون مین انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتین مردون کے سامنے سے گذرتی تھین تو اپنی پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤن رکھتی تھین، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا،

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (نور-۴)

اور (چلنے مین) اپنے پانون ایسے زور سے نہ رکھین کہ (لوگون کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پانون تک چھپالے جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزین چھپ جائین، اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منھ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہوجائے کہ یہ شریف خاتون ہے، لونڈی نہین، پھر نگاہین شرم سے جھکی رہین،

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ

اے پیغمبر اپنی بیویون اور بیٹیون اور مسلمانون کی عورتون کو کہدے کہ نیچے لٹکا لین اپنے اوپر تھوڑی سی

جَلَابِيبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰیٓ	اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچا[1] نی
اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (احزاب-۸)	پڑیں، تو کوئی نہ ستائے،
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہدے
مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ	ستر چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا	مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے، اور اپنی
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى	اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے
جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	رہیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں لیکن
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الآية (نور-۴)	شوہر (وغیرہ محرم) کو (اخیر تک پڑھیے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے[2] کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال بر ملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے، عورتوں کو وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہیے، ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم

---

[1] یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں [2] سنن ترمذی باب ما جاء فی خروج المرأۃ متعطرۃً۔

مل جل گئے تو آپ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ عورتین راستہ کی ادھر ادھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگین[1]،

راستہ چلنے مین ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہان تک کہ اگر مسجد مین جماعت ہورہی ہو تو بھی جماعت مین ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہین چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد مین تکبیر ہورہی ہو یا نماز کھڑی ہوچکی ہو تو دوڑ کر اس مین شامل نہ ہو، بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آکر جماعت مین ملو[2]،

مقدور ہو تو پانون کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو یعنی جوتے پہنکر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[3]،

جوتے دونون پانون مین پہن کر چلنا چاہیے، یا دونون پانون ننگے رہین یعنی یہ نہین کرنا چاہیے کہ ایک پانون مین جوتا ہو، اور دوسرا پانون ننگا ہو[4]، کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھین گے، لیکن اگر گھر مین کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہین[5]،

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [2] صحیح مسلم باب استحباب ایتان الصلوٰۃ بوقار [3] ابوداؤد، باب الانتعال [4] ایضاً [5] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

—— • ——

آدابِ سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ مین سفر فرمایا، اُس وقت زمانہ کے حالات اوُر سواریون کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب وُ ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت ومطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتین کی ہین جن مین سے بعض کی، حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ مین پابندی ضروری نہین تاہم جہان اب بھی وہ حالات باقی ہین اُن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات وقصبات کے لوگ اُن سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہین جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستون مین ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز وسامان میسر نہین آتے جن کی اسٹیشنون اور ہوٹلون مین بہتات ہوتی ہے،

۱۔ سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہئے، اور اس کو خیر وعافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہئے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہئے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے[1] اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَاَمَانَتَکُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ یعنی تمھارے دین، امانت اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہون،

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے[2]، اس سے انسان کا وقت ضائع نہین ہوتا، بلکہ پورا دن کام مین آجاتا ہے، اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہی اور ایک معتدبہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہی،

(۳) سفر تنہا نہین کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئین[3]، اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسبابِ سفر کی حفاظت ونگرانی مین سہولت پیدا ہوتی ہے،

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کرین تو ان مین ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہیے[4]، اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہین،

(۵) سفر سے آنیکے ساتھ ہی گھر مین داخل نہین ہونا چاہیے، بلکہ گھر والون کو تیاری کا تھوڑا[5] موقع دینا چاہیے،

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے[6]،

(۷) سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث مین اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعاء عند الوداع [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدہم [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق [6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی،

خوب طے ہوتی ہے[1] اور درحقیقت لو، گرمی، اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت،

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہئے[2]

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہئے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں، اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے[3]،

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے، تو فوراً واپس آجانا چاہئے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے[4]۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعات مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق [3] [4] مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب،

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات مین شمار کیا ہے، اور فرمایا ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ، (روم-۳)	اور خدا کی نشانیون مین سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے،

سورہ فرقان مین فرمایا:-

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا (فرقان ۵)	اور اُسی نے تمہارے لئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا،

سورہ نبا مین ہے،

وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا، (نبا-۱)	اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا،

ان آیتون کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت

کاروبار اور محنت کے لئے ہے یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب کچھ دیر اہلِ عرب آرام کرتے تھے، جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور۔ع ۸ میں ہے، حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ، اور رات آرام میں گذاری جائے، اور ہو سکے، تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات، اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہانتک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[1]، یہ تو عام افراد کے لئے ہے، لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے،

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ (ذاریات۔۱) یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے،

(۱) سُنّتِ نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے، کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھکر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو، فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے[2]، یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے، اور اخیر رات میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سستی نہ ہو،

لیکن اگر کوئی ضروری اور مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشاء کے بعد اس کے لئے بات چیت

---

[1] بخاری کتاب النکاح [2] ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء،

کرنا منع نہین، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین نماز عشاء کے بعد بعض ضروری کامون مین مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہین، اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے۔[1]

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے، پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے،[2]

(۳) ایسی چھت پر نہین سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو،[3] کیونکہ ایسی حالت مین زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے،

(۴) پاکی کی حالت مین سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے،[4]

(۵) پیٹ کے بل نہین سونا چاہیے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہین،[5]

(۶) ایک پاؤن کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤن کو رکھ کر لیٹنا نہین چاہیے،[6] کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہبند باندھتے تھے، اس لیے اس مین کشفِ عورت کا احتمال ہے، البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث مین ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے لیٹے تھے،[7]

---

[1] صحیح مسلم باب اکرام الضیف [2] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم [3] ایضاً باب فی النوم علی سطح غیر محجر [4] ایضاً باب مایقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ [5] ایضاً باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ [6] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہۃ فی ذلک [7] ایضاً باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیاً،

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کرلینا چاہیے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھا دینا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لیجاتے ہیں جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آگ تمہاری دشمن ہے جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو،[1]

(۸) سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے اللّٰھمّ باسمك احيي واموت (اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں) اور جاگے تو کہے الحمد للّٰہ الّذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور[2] (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے) حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں،

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب لا تترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل؛ مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے،

[2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفون سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصون پر غیرون کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہین، اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہین جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے سترپوشی کو مذہب کا ایک ضروری جزو ٹھہرایا، یہان تک کہ بلامجبوری اسکے بغیر نماز بھی ادا نہین ہوسکتی،

مردون کے لیے ناف سے لے کر گھٹنون تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتون کے لیے سر کے بالون سے لے کر ٹخنون اور گٹون تک اور لونڈیون کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنون تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہین، یہان تک کہ تنہائی مین بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہین، ایک صحابی

لہ عورت کا چہرہ، قدم، اور ہتھیلیان ستر مین داخل نہین،

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے[1]، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں، جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو[2]

حضرت آدمؑ اور حواؑ کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے، تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے،

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا	تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا
سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ	ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر
عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف ۲)	درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے،

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے، مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے، اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے[3]، ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا،

---

[1] سنن ترمذی ابواب الاستیذان و آداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ [2] ایضاً باب ماجاء فی الاستتار

[3] صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل،

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ	اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر
لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ	پوشاک جو ڈھانکے تمھاری ستر اور
رِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ	زینت کا سامان اور پرہیزگاری
خَيْرٌ ۭ (اعراف - ۳)	کا لباس یہ بہتر ہے،
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ	اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت
عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف - ۳)	اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو،
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ	کہدے کس نے اللہ کی اس زینت
الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ	کو جس کو اس نے بندوں کے لیے
(اعراف - ۴)	پیدا کیا ہے، منع کیا ہے،
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ	کہدے کہ میرے رب نے تو بیحیائی
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ	کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی
(اعراف - ۴)	منع کیا ہے،

ان آیتوں میں جس بیحیائی کی طرف اشارہ ہے، وہ برہنگی ہے، اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے، پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصولِ کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف - ۳) اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے،

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمالِ صالحہ اور یا شرم وحیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباسِ تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد وورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں[1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہونا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہو اور جو لباس تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے، اس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمۂ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں،

"اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے، اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے، اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے، اور اپنی زینت نہ دکھاوے" (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس وپوشاک کی حدبندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے۔ اس حدبندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے،

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے

---

[1] روح المعانی تفسیر آیت مذکور،

کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جد و جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں چبھیں، یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے،

۲- مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک، اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ داماں کی کھلی شہادت ملتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور طریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے،

۳- عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی اسکے بڑے بڑے امرا اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے، اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا، اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا، اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک

ورنہ کم از کم ٹخنون سے اونچا رہے، فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہین فرماتا، البتہ عورتون کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے،

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگون کی انگلیان اٹھین، پہننا ٹھیک نہین، خواہ وہ امیرون کی زرق برق پوشاکین ہون، یا مولویوں کا نمایشی عبا، جبہ، یا صوفیون کا گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑون کے پہننے والون کا اصل منشا اپنے کو دوسرون سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک[1] کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتون کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ نے یہ فرمایا ہے کہ "کتنی کپڑے پہننے والیان ہین جو حقیقت مین ننگی رہتی ہین۔"

ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپین جائز نہین، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضورؐ کے سامنے آئین، تو آپ نے فرمایا، اے اسما جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیون کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھونا حلال نہین۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنین، سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہین، ایسی سرخ دھاریون کی چادر آپ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے

---

[1] یا باریک

پہنے جاسکتے ہیں، آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا، مردوں کے لیے منع ہے، سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے، اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے، سیاہ رنگ کا عمامہ زیبِ سر فرمایا ہے،

۸۔ مردوں کے لیے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپ نے پسند فرمائے ہیں،

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے،

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے،

الحمد للہ الذی کسانی	اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا،
ھذا ورزقنیہ من غیر	اور روزی کیا میری قوت کے بغیر
حول منی وقوۃ	(یعنی محض اپنے فضل سے)

لہ اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی،

آدابِ مسرّت

انسان کو جن چیزون پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہین، مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی مین اظہارِ مسرت کے سیکڑون موقع پیش آتے ہین، لیکن یہ مسرت جب حدِّ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے، قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا،

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ	جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت،
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (قصص)	اللہ کو نہین بھاتے اترانے والے۔

اسلام نے چونکہ تمام جذبات مین اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتون کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا	اور اگر ہم چکھادین آدمی کو اپنی طرف سے
رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ	مہربانی پھر وہ چھین لین اس سے تو وہ ناامید
اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ	ناشکر ہو، اور اگر ہم چکھادین اس کو

اَذَقْنَاهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ	آرام بعد تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو
مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ	کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ
عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ (ھود-۲)	خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا،

اور اس کی ممانعت کی ہے،

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ	اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ	دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اترانے
(حدید-۳)	بڑائی مارتے کو،

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پہ اظہار مسرت کی اجازت دی ہے، اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں،

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجالانا چاہیے، تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر وغرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجالاتے،

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جا رہے تھے، جب عزورا کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک ٹھہرے رہے، پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی،

اور سجدہ مین گر پڑے۔ اور فرمایا کہ مین نے خدا سے اپنی امت کے لیے شفاعت کی دعا کی. تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کرلی، اس لیے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ مین گر پڑا، پھر مین نے سر اٹھا کر اپنی امت کے لیے یہی درخواست کی تو اُس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اس لیے مین اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ مین گر پڑا، پھر مین نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری التجا کو قبول کیا تو مین اپنے خدا کے لیے سجدہ مین گر پڑا،[1]

صحابہ کرام کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعب بنؓ مالک کی توجیب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ مین گر پڑے، اس قسم کے مسرت آمیز موقعون پر دوسرے مسلمانون کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر اس کی مسرت مین شریک ہون، چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارکباد دی۔[2]

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن مین پہنچنے کی مسرت ہوتی ہو اس موقع پر اعزہ واحباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت مین شریک ہون، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ مین آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کرکے لوگون کو کھلایا،[3] اس موقع پر دوسرون کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر [2] بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک [3] ابو داؤد کتاب الاطعمہ باب الاطعام عند القدوم من السفر۔

کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جاکر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شامل تھے۔[1]

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے، اور اس موقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

فصل ما بین الحلال و الحرام الدف والصوت[2]	حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے،

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے، اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراء کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیعؓ بنت معوذ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، اسی

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی [2] ترمذی کتاب النکاح باب ما جاء فی اعلان النکاح

حالت مین ایک نے یہ مصرع گایا،

وفینا نبی یعلم ما فی غد — ہم مین ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے،

تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو اور جو گا رہی تھین اسی کو گاؤ[1]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کرکے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگون کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگون نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیون نہین بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی[2]،

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابومسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیون کا گانا سن رہے تھے، اتنے مین عامر بن سعد ایک تابعی آگئے، انھون نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہین، اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے، انھون نے کہا تمھارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب اللھو والغناء عند العرس)

عربون مین رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی،

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ [2] بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ اللتی یہدین المرأۃ الی زوجہا ودعائہن بالبرکۃ مع فتح الباری،

بارك الله لك وبارك	تمھارے لیے اللہ مبارک کرے،
عليك وجمع بينكما	تم پر برکت آتارے اور تم دونون مین
في خير[1]	بھلائی مین میل ملاپ رکھے،

شادی بیاہ مین دوستون اور عزیزون کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہین، ہین، جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزون اور دوستون کو اس موقع پر کھلائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور کچھ نہین تو ایک بکری ذبح کرکے کھلا دو[2]، اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہین[3]، اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی مین تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہین (نسائی باب الھدیۃ لمن عرس)

مسلمانون کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانۂ جاہلیت مین اہل عرب نے سال مین دو دن مقرر کیے تھے جن مین وہ خوشیان مناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنون مین خوشیان مناتے تھے، اب خدا نے ان کو تمھارے لیے ان سے دو بہتر دنون سے بدل دیا، یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن[4]، خوشی کے ان دو دنون کی تعیین مین دوسری مشرک قومون کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہین بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعون کو ان کا

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یقال للزوج [2] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ،
[3] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر [4] نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین،

مسرت کے لیے پسند کیا گیا، عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی خوشیون اور خانہ کعبہ کی بنا اور فتح کی، اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے، ان دونون دنون مین اظہار مسرت کے لیے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا، اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلون کو پسند فرمایا، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیان جو پیشہ ور گانے والیان نہ تھین، وہ اشعار گا رہی تھین جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت مین حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر مین! لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "اے ابوبکر! ہر قوم کے لیے عید کا ایک دن ہوتا ہے، اور یہ ہماری عید کا دن ہے"[۱] یعنی اس دن گانا مباح ہے[۲]،

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے تھے، ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا، اور حبشیون سے کہا کہ "ہان بنو ارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان مین مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہان تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئین تو آپ نے کہا کہ "بس" انھون نے کہا ہان، ارشاد ہوا

۱؎ بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام ۔ ۲؎ بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہون،

تو جاؤ، [1]

مسرت کے اس طریقۂ اظہار کا نام "تقلیس" تھا جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے،

حضرت قیس بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں، وہ سب میں نے دیکھ لیں، بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی، [2]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقۂ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کر لے، اسی لیے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے، اور آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور

[1] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید [2] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التقلیس یوم العید

یادالٰہی کے ہین،[1]

اسلام نے خوشی مین بھی اس کو یادرکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو، اسی لیے عید کے دونون موقعون پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائین اور دوسرے راستہ سے لوٹین، تاکہ ہرطرف اسلام کی شان و کا اظہار ہو، اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ ۲۳-) کی تعمیل ہو،

[1] شرح معانی الآثار طحاوی صفحہ ۴۲۹، یہان بعال کا ترجمہ اہل دعیال سے لطف اٹھانا کردیا گیا ہے،

آداب ماتم

خوشی اور غم توام ہیں جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے، غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے، عربوں میں فخر و غرور، اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے،

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

اذا مِتُّ فانعِینی بما انا اهلُه　　　وشقّی علیّ الجیب یا ابنة معبد

جب میں مر جاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا اور میرے لیے گریبان کو چاک کر ڈالنا

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا عام رسم تھی، اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے،

من کان مسرورًا بمقتل مالکٍ ، فلیأت نسوتنا بوجه نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا ، تو ہماری مستورات کو دن دہاڑے آکر دیکھے

یجد النساء حواسرًا یندبنہ ، یلطمن اوجہہن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں ، اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں"[1] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں،

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ان کے منہ میں خاک بھردو"[2]

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہوگئی تھی، یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون نے

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ما جاء فی النھی عن ضرب الخدود [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "وہ کونسی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے" آپنے فرمایا کہ "نوحہ نہ کرو" وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلان خاندان کی عورتیں آکر روئی تھیں، ان کا یہ قرض مجھ کو ادا کرنا ہے آپنے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں، اس لیے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں،[1]

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں، اسکو عربی میں "نعی" کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو (فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدنظر تھی کہ) وصیت کی کہ "میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے، اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو"[2]

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے، اور بخوردان[3] جلا کر لے جاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لیجائے، راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے تب یہ مطلب ہوگا کہ "جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے"[3]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے، ایک عورت انگیٹھی

---

[1] ترمذی تفسیر سورۂ ممتحنہ [2] ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی [3] باب لا سلام سہام ما قبلہ و احمد ج ۲ ص ۱۹۹

[3] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد۔

لیکر آئی، آپنے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی،[1]

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے اور صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپنے لوگون کو اس صورت مین دیکھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا ارادہ ہوا کہ مین تمھارے حق مین ایسی بد دعا کرون کہ تمھاری صورتین بدل جائین، لوگون نے فوراً چادرین اوڑھ لین، اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہین کیا،[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی، اور فرمایا کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہین کہ تین دنون سے زیادہ کسی کا سوگ کرے، البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا، جس مین وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے، خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرایش و زیبایش کرے،[3]

کسی عزیز کی موت پر آنکھون سے آنسو نکلنا جو فطرت کا تقاضا ہے، برا نہین لیکن زور زور سے چیخنا چلانا، بین کرنا منع ہے، اور اس پر سخت تہدید فرمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھون سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے، اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہین، لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے،[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے،

---

[1] اسد الغابہ جلد ۴ ص ۳۹۵ مصر [2] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النھی عن التسلب مع الجنازہ [3] ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنھا زوجھا [4] مسلم کتاب الفضائل باب رحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال،

صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کے لیے حسبِ حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے، اسی وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے؛[1]

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو، تو مناسب ہے' کہ عزیز، دوست یا محلہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا،[2]

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا، دفعِ غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے' وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ - ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا، مگر وہ نہ مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا، آپ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے

---

[1] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۲۲ [2] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت

شروع میں کرنا چاہیئے،

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے، قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ۔ ۱۹) اسی لیے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں، اور یہ دستور مستحسن ہے،

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا، یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے،

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ	تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے
(حدید۔ ۳)	اس پر غم نہ کرو،

ؔ ابوداؤد کتاب الجنائز باب الصبر عند الصدمۃ،

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے، اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے، اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: "جمائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے[1]"، بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرلے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[2]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اوڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[3]، اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی التثاؤب [3] حجۃ اللہ البالغہ آداب الصحبۃ،

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے، اسلیے جہانتک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور ہاہا نہیں کہنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے[۱]

(۲) جمائی کے برخلاف آپنے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے، بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[۲]، ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے، اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جمائی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے،" شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی ابخرے نکلتے ہیں، اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے، اور "الحمد للہ" کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں،[۳]

(۳) تاہم وہ ایک شنا چیز ہے، بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے، اس لیے چھینکتے وقت منھ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے، اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا،[۴]

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپنے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے خصائص کی بعض

---

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔ [۲] ایضاً [۳] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس [۴] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس،

کتابون مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1] جمائی اور انگڑائی نہین لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری مین ان حدیثون کو نقل کیا ہے، اور ان کی تضعیف وتردید نہین کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے، بہرحال یہ حدیثین صحیح ہون یا نہ ہون، لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے مین جسم کی جو حالت ہوتی ہے، وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لیے مجمع عام مین اس سے احتراز کرنا چاہیے،

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی مین ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیونکہ جو لوگ دنیا مین بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہین، وہ آخرت مین سب سے زیادہ بھوکے رہین گے،[2] اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے،

آداب کا فلسفہ | شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ مین ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

تمام متمدن ملکون کے باشندون نے خورد ونوش، نشست وبرخاست اور وضع ولباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی ومعاشرتی حالات مین فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے، اس مین مختلف طریقے اختیار کیے ہین،

(۱) بعض لوگون نے ان کی بنیاد حکمت طبعی کے قواعد پر رکھی ہے، اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کے رو سے مفید ہین،

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۰ [2] ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۴

(۲) بعض لوگون نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس مین اپنے مذہب کی پابندی کی ہے،

(۳) بعض لوگون نے اس معاملہ مین اپنے بادشاہون حکیمون اور راہبون کی تقلید کی ہے، ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہین جنمین بعض مفید اور بعض مضر ہین اور بعض مین نفع و نقصان کچھ بھی نہین ہے، اس لیے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے، اور جن مین نفع و نقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت مین قائم رکھے جائین، ان مصلحتون کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس مین امور ذیل کا لحاظ رکھا،

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی اسلیے شریعت نے ان سے پہلے، ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائین مسنون کر دین جو خدا کو یاد دلاتی ہین،

۲۔ بعض افعال و اشکال شیطانون کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہین، مثلاً ایک جوتہ پہن کر چلنا اور بائین ہاتھ سے کھانا، اس لیے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے، اس کے بخلاف بعض باتین ایسی ہین جو فرشتون سے قریب کر دیتی ہین، مثلاً گھر مین داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لیے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے،

۳۔ بعض چیزین ایسی ہین جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے، مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر مین آگ لگا دیتے ہین،

۴۔ بعض آداب ایسے ہین جن سے عجمیون کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑون اور چاندی سونے کے برتنون مین کھانے پینے کی ممانعت،

۵۔ بعض چیزین وقار اور تمدن کے منافی ہین، اور انسان کو بالکل وحشیون اور بدوون مین شامل کر دیتی ہین، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی، تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے[1]،

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قومون کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولون پر قائم تھی، اسلام کے احکام بھی ان ہی پر مبنی ہین اور رسولِ انام علیہ السلام کے آداب مین وہ سب ملحوظ ہین، اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہین، یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگون کے آزمودہ اصولِ کار، اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن و معاشرت ہے،

اسلام نے ان آداب مین بڑی لچک رکھی ہے یعنی ان مین جو اصلی اور بنیادی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۶۳

باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کردی ہے، اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو، یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو،[١] اور اسی لیے ان کے دنیوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیے گئے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو بلکہ اسکی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں، جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تولیے کام میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے،[٢] پلیٹیں بدلی جائیں یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو اس کی پوری اجازت ہے، لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق و محبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے مگر ان کی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں،

---

[١] ہمارے فقہانے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ [٢] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری سے کاٹ کر گوشت کھایا ہے،

حکمتِ ربانی کا چشمۂ نور

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیمون اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتون کا ایک ایک حرف آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل، اس کی تعلیم کتنی کامل، اس کے تہذیب وتمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہین، اور یہ سب کچھ ایک نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قومون کے معلم پہونچنے سے عاجز رہے، "معلم امی صلی اللہ علیہ وسلم" کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہان تک پہونچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ جس قوم کو جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا، اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ، اور سلیقۂ وشعور سے

[illegible] خلاق وتمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم وتربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہئے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی، یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ "یعنی ایسا نبی جو ان اُمیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق وحکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم وتربیت سے پاک وصاف کر کے نکھار دے" یہ نکھارنے والا آیا، اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا صلی اللہ علیہ وسلم

اُمیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ

دو نئی کتابین

اسلام اور عربی تمدّن

یعنی شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ جس مین مذہب اسلام اور اسلامی تمدن وتہذیب پر علماے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور یورپ پر اسلام اور مسلمانون کے اخلاقی، علمی، اور تمدّنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور قرون وسطیٰ پر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے، اس سلسلہ مین مسلمانون کی علمی و تمدّنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے، کتاب ایک مقدمہ اور سولہ ابواب پر مشتمل ہے، (مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی) قیمت: ؏

حکماے اسلام حصّہ اوّل

مولینا عبد السلام صاحب ندوی نے دو ضخیم جلدون مین حکماے اسلام کی تاریخ لکھی ہے جسمین دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور انکے فلسفہ پر تبصرہ ہے، یہ جلد پانچوین صدی ہجری تک کے حکما کے حالات پر مشتمل ہے، شروع مین ایک مقدمہ ہے جس مین یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوگا کہ مذہب کی تخریب و بیخکنی کے بجاے مسلمان فلاسفہ اور حکما نے فلسفہ سے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع پر بالکل منفرد ہے، قیمت: معہ

(طابع وناشر صدیق احمد)